اگر مجھ سے ملنا ہے

(منتخب افسانے)

خواجہ احمد عباس

مرتبہ
صغرا مہدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اگر مجھ سے ملنا ہے

(منتخب افسانے)

خواجہ احمد عباس

مرتبہ

صغرا مہدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

Agar Mujh Se Milna Hai

Edited by

Sughra Mehdi

Rs. 300/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com
maktabajamiadelhi@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔110006 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 0571-22706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراونڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-2698729525

ISBN No. : 978-93-82997-19-1

مارچ2014 تعداد:500 قیمت: -/ 300روپے

نور پرنٹ ایجنسی، سوئیوالان، دریا گنج، نئی دھلی ۲ میں طبع ہوئی۔

''اگر آپ مجھ سے ملنا اور بات کرنا چاھیں تو
ھماری لکھی کتابوں کے اوراق پلٹئے۔''

(خواجہ احمد عباس کی وصیت سے)

فہرست

	عرض مرتب	7
۱۔	گیہوں اور گلاب	13
۲۔	بھولی	49
۳۔	ماں کا دل	59
۴۔	زعفران کے پھول	70
۵۔	آئینہ خانے میں	82
۶۔	میری موت	91
۷۔	پرنیتا کماری کے پان	103
۸۔	دیوالی کے دین دِیے	114
۹۔	اجنتا	124
۱۰۔	دیا جلے ساری رات	148
۱۱۔	بھوپال کی کیپٹن سلمیٰ	156
۱۲۔	آسمانی تلوار	168
۱۳۔	سردی گرمی	177
۱۴۔	شکر اللہ کا	184
۱۵۔	ابابیل	202
۱۶۔	نئی برسات	206
۱۷۔	تیسرا دریا	229
۱۸۔	مسوری ۱۹۵۳ء	246

عرضِ مرتب

اردو ادب میں خواجہ احمد عباس کا نام جانا پہچانا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ان کا نام ممتاز افسانہ نگاروں میں آتا ہے۔

عباس صاحب نے کم عمری میں افسانہ نگاری کی ابتدا کر دی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ ''ابابیل'' ہے جو رسالہ جامعہ میں شائع ہوا۔ اس کو بہت پسند کیا گیا۔ اس کا ترجمہ کئی غیر ملکی زبانوں میں ہوا اور اہم افسانوں کے انتخابات میں اس کو شامل کیا گیا۔

جب ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو عباس صاحب نے نہ صرف اس کا خیر مقدم کیا بلکہ جوش و خروش سے اس میں حصہ بھی لیا اور ان کا شمار ترقی پسند ادیبوں میں ہونے لگا۔ بقول قمر رئیس ''جن ادیبوں نے ترقی پسند نظریۂ ادب یا حقیقت نگاری کے اشترا کی تصور سے پیمانِ وفا باندھا تھا، ان میں راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، اختر حسین رائے پوری، اختر انصاری اور خواجہ احمد عباس تھے۔[1]

خواجہ احمد عباس کے تیرہ افسانوی مجموعے ہیں: ایک لڑکی، پاؤں میں پھول، زعفران کے پھول، میں کون ہوں، کہتے ہیں جسے عشق، دیا جلے ساری رات، چراغ تلے اندھیرا، پیرس کی ایک شام، گیہوں اور گلاب، بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں، سونے چاندی کے بُت۔[2]

ان میں سے اکثر افسانوی مجموعوں کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے۔ ان کی زندگی میں بھی اور ان کے انتقال کے بعد بھی۔

ان کے افسانوں میں سے سب سے نمایاں رجحان حقیقت نگاری کا ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ ترقی پسند ادیبوں میں شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ انسانی برابری، دردِ دل، وطن دوستی اور

۱۔ خواجہ احمد عباس: ایک مطالعہ، از ڈاکٹر غلام حسین

۲۔ خواجہ احمد عباس: ایک مطالعہ، از ڈاکٹر غلام حسین

سیکولرازم کے رجحانات ان کے افسانوں کی خصوصیات ہیں۔

عباس صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ کارِ جہاں دراز ہے۔ اس کے مقابلے میں خداتعالیٰ نے عمر کوتاہ رکھی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو زیادہ سے زیادہ کام وہ بھی مختلف النوع نمٹانا چاہتے تھے۔ انھیں ''کچھ کہنا ہے'' اور اس کے لیے انھوں نے افسانہ نگاری بھی کی، صحافت بھی اور فلم سازی بھی کی۔ انھیں 'کہنے کی' اتنی جلدی تھی کہ ''کیسے'' کہیں اس پر وہ زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے۔ اپنی تخلیقات کی نوک پلک درست کرنے کا ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ خود کہتے ہیں: ''مجھے کچھ کہنا ہے۔ وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی بلٹز میں آخری صفحہ (Last Page) اور آزاد قلم لکھ کر، کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈاکومینٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کے لیے کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی خود اپنی فلم ڈائریکٹ کر کے۔''[1]

عباس صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اصولوں اور نظریات کے ہمیشہ وفادار رہے۔ اپنے اصولوں کے تحت زندگی گزاری۔ کسی مصلحت کی بنا پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ اسی لیے ترقی پسندوں نے ان کی بعض تحریروں کو غیر ترقی پسند کہہ کر ترقی پسندوں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور عباس صاحب پھر ترقی پسند ہو گئے۔

عام طور پر نقادوں کی رائے ہے کہ ان کی کہانی کے پہلے ہی پیراگراف کو پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عباس صاحب کا اس کہانی کو لکھنے کا مقصد کیا ہے؟ مگر عجیب بات ہے کہ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر انھوں نے اپنا مشہور افسانہ ''سردار جی'' لکھا، جس پر مقدمہ چلا۔ اس کا عنوان ''سردار جی'' کے بجائے ''میری موت'' رکھا گیا اور عباس صاحب کو بھری عدالت میں اس افسانے کے مقصد کی وضاحت کرنی پڑی۔

مشہور افسانہ نگار رام لعل، عباس صاحب کی افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں ''احمد عباس کا ایک افسانہ 'میجر رفیق مارا گیا' میری خاص توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس لیے کہ کشمیر کے محاذ پر پہلی ہندو پاک جنگ کے بارے میں کسی مسلمان مصنف کی پہلی تحریر تھی جو دوقومی نظریے کے مقابلے میں سیکولر نقطۂ نظر پیش کرتی تھی۔ میجر رفیق ہندستانی افواج کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا جو افسانوی سطح پر ایک تخلیقی کردار تھا۔ لیکن اس نے ہندستانی سیاست کو واضح

۱۔ نئی دھرتی نئے انسان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

کر دیا تھا کہ قومیت صرف مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ ملکی سطح پر اپنی شناخت قائم کرتی ہیں۔ رام لعل کا یہ بھی خیال ہے کہ ''آزادی کے بعد یہ پہلا افسانہ خواجہ احمد عباس نے تحریر کیا تھا۔''[1]

کشمیر کے موضوع پر ان کے کئی افسانے ہیں مگر سب سے اچھا ان کا طویل افسانہ ''زعفران کے پھول'' ہے۔

عباس صاحب کو اس کا احساس تھا کہ نقادانِ فن ان کو اچھا افسانہ نگار نہیں مانتے ہیں۔ انھوں نے جا بجا اس کا اظہار اپنی تحریر و تقریر میں کیا ہے اور ساتھ ہی شدت سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ''ویسا ہی لکھیں گے جیسا چاہیں گے۔''

ان کا ایک افسانوی مجموعہ ہے ''کہتے ہیں جسے عشق'' اس میں تین کہانیاں ہیں۔ اس کا انتساب انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے: ''ان لوگوں کے نام جو یہ شکایت کرتے ہیں کہ ترقی پسند افسانہ نگار ہمیشہ ہی بھوک بیکاری اور غریبی کا رونا روتے ہیں۔ محبت کی کہانیاں کیوں نہیں لکھتے؟'' اس مجموعے میں عشق کے موضوع پر تین طویل افسانے ہیں۔ ان میں سب سے اچھا افسانہ ''مسوری ۱۹۵۲'' (قرۃ العین حیدر سے معذرت کے ساتھ) ہے۔ یہ افسانہ خطوط کی ٹکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اس میں قرۃ العین حیدر کی ابتدائی بے حد رومانی افسانہ نگاری پر لطیف طنز ہے۔ ان کا اسٹائل بھی ہے۔ ان کے مخصوص کردار بھی وہ جس خاص طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں اس کے طرزِ زندگی اور تصورِ عشق کو پیش کیا ہے۔

اصل میں اس افسانے کا سلسلہ ''عصمت چغتائی'' کے مشہور مضمون ''پوم پوم ڈارلنگ'' سے ہے جس میں قرۃ العین حیدر کی طرزِ تحریر اور موضوعات کا مذاق اڑایا گیا تھا اور ان کو ترقی پسندوں کی سی افسانہ نگاری کو دعوت دی تھی۔ عباس صاحب کا مقصد بھی شاید وہی ہو مگر ان کا اندازِ سُکل ہے۔ اور یہ ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ مگر ان کی افسانہ نگاری کے ضمن میں لوگوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور خود قرۃ العین حیدر نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا جبکہ وہ ''پوم پوم ڈارلنگ'' سے بہت خفا تھیں، جس کا اظہار وہ تحریر و تقریر میں کیا کرتی تھیں۔

جہاں تک عباس صاحب کے یہاں عشقیہ افسانوں کا سوال ہے تو ان کے بیشتر افسانوں میں عشق بھی ہے، رومان بھی۔ مگر اس پر ان کا آئیڈیالزم حاوی ہو جاتا ہے۔

گیہوں اور گلاب، دیا جلے ساری رات، واپسی کا ٹکٹ، گرمی سردی، نیلی ساڑی، پہلی

۱۔ خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے، مرتبہ رام لعل، سیمانت پرکاشن، دریا گنج، نئی دہلی

برسات، پرنیتا کماری کے پاں ان کہانیوں کا خاص موضوع عشق ہے۔ ترقی پسندوں نے بھی اس موضوع کو نظر انداز نہیں کیا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ احساس دلایا ہے کہ ''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' — اور خواجہ احمد عباس کے یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔

''مقصد اور جذبے کے امتزاج ہی سے اعلا ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ خواہ وہ افسانہ ہو یا ناول یا غزل یا نظم۔ مقصد اور جذبے کا امتزاج تخلیقِ فن کے لیے ضروری ہے۔ یہ امتزاج خواجہ احمد عباس کی ہر کہانی میں نظر نہیں آتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ مقصد اور جذبے کی اہمیت سے بیگانہ رہے ہوں۔ اور یہ امتزاج ان کی جن کہانیوں میں موجود ہے وہ کہانیاں اونچے پایے کا ادب پارہ بن گئی ہیں۔[1] ایسی کہانیوں میں ان کی پہلی کہانی 'ابابیل' بھی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ''احمد عباس کا فن کسی خاص موضوع تک محدود نہیں۔ وہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے۔ اس کے افسانوں میں سماج کی معاشی کشمکش کا پتا چلتا ہے اور افراد کی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے یہاں خارجی مظاہر کے نقشے بھی ملتے ہیں اور داخلی کیفیات کی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ عباس کے افسانوں کا پس منظر ہمارے متوسط طبقے کی زندگی ہے اور اس نے اس کو بہت چابکدستی سے پیش کیا ہے۔''[2]

وقار عظیم، عباس صاحب کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''زندگی کے ہر شعبے میں اغراض کی کشمکش نے ایک طبقے کو ظالم دوسرے کو مظلوم، ایک کو مختار دوسرے کو مجبورِ محض بنا دیا ہے۔ احمد عباس کے افسانوں میں ان کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ اور یہ آواز اٹھاتے وقت انھوں نے کسی قسم کی رعایت برتنے کو اپنے فنی منصب کے خلاف جانا ہے۔ مظلوم اور ستم رسیدہ کی حمایت کے معاملے میں وہ اس حد تک مخلص ہیں کہ بڑی سے بڑی قوت یہاں تک کہ حکومت اور سیاسی اقتدار کے خلاف آواز اٹھانے میں بھی خیال اور اظہار کی پوری آزادی سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے احمد عباس کی مقصد کی بلندی یقیناً قابل قدر ہے۔'' اس اعتراف کے ساتھ وقار عظیم صاحب کا خیال ہے کہ ''ان کے لہجے میں ہر جگہ جو مقصدیت کی جھنکار سنائی دیتی ہے، وہ فن کو مجروح کرتی ہے۔''[3] مگر بقول ڈاکٹر محمد حسن ''خواجہ احمد عباس نے عظیم کہانیاں نہیں لکھیں۔ ان

۱۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، خواجہ احمد عباس، ادارۂ فکر جدید، دریا گنج

۲۔ خواجہ احمد عباس: ایک مطالعہ، از ڈاکٹر غلام حسین، بسم اللہ کمپیوٹرس

۳۔ نیا افسانہ، وقار عظیم

کے ناول اور افسانے میں ایسا کوئی کردار نہیں جو برسوں زندہ رہنے والا ہو۔ مگر جو چیز ان کی کہانیوں کو شاید مدتوں بعد بھی پڑھے جانے کے قابل رکھے، وہ ایک صحت مند معاشرے کی پرخلوص تلاش ہے جو ان کی ہر سطر میں ملتی ہے۔''[1] مشہور ترقی پسند نقاد احتشام حسین لکھتے ہیں ''خواجہ احمد عباس دراصل ۱۹۴۷ء کے بعد ہی میدان میں آئے لیکن گذشتہ پانچ چھے سالوں میں انھوں نے عصری زندگی کو کھنگال کر بعض بیش قیمت موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ ہلکی سی رمزیت کے پردے میں ان کے وہ افسانے جو قومی اور فرقہ وارانہ اتحاد، موجودہ جذباتی سماجی انتشار کے متعلق لکھے گئے ہیں وہ انھیں کا دوررس ذہن لکھ سکتا تھا۔''

۱۹۱۴ء عباس صاحب کا پیدائش کا سال ہے۔ اس موقعے پر ان کے مداحین اور خاندان والوں نے ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ہے جس کے تحت مختلف تقریبات ہوں گی۔ اسی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی تصانیف کو شایع کرایا جائے۔ افسانوں کا یہ انتخاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب میں ان کے نمایندہ افسانے شامل کیے جائیں۔ اس میں سبھی مجموعوں سے افسانے لیے گئے ہیں اور رام لعل کے منتخب افسانوں کے مجموعے سے بھی مدد ملی ہے۔

ایک تخلیق کار ایک اچھا نقاد ہوتا ہے۔ اسی لیے رام لعل نے افسانوں کے انتخاب میں اس کا ثبوت دیا ہے۔

میں عباس تقریبات کی کمیٹی کی مشکور ہوں کہ اس نے ان کے افسانوں کا انتخاب کر کے اس افسانوی مجموعے کو ترتیب دینے کی ذمے داری مجھے سونپی۔ مجھے امید ہے کہ عباس صدی تقریبات کے ذریعے عباس کے فن کی نئے سے تفہیم کا سلسلہ شروع ہوگا اور اس میں اس افسانوی مجموعہ کی پذیرائی ہوگی۔

۲۶ راگست

صغرا مہدی
عابد ولا، جامعہ نگر
نئی دہلی

ا۔ خواجہ احمد عباس: ایک مطالعہ، ڈاکٹر غلام حسین

گیہوں اور گلاب

اوشا

دھوپ، گرمی، بدن کو جھلسانے والی لو، دوپہر کا عمیق سناٹا جو میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر چھایا ہوا تھا۔ دور ایک کھیت میں ٹریکٹر چل رہا تھا جس کی دھیمی گڑگڑاہٹ فارم پر مسلط خاموشی کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

اوشا نے ایک فلمی رسالے کے رنگین ورقوں کو پلٹتے ہوئے سوچا میری بھی کیا زندگی ہے۔ شہر سے پچاس میل دور ویرانے میں یہ دو کمروں کا مکان، پھیلے ہوئے کھیتوں کے سمندر میں جیسے ایک ننھا سا جزیرہ ہو اور پھر کوئی آرام بھی تو میسر نہیں۔ نہ بجلی نہ پنکھے، ریفریجریٹر کا تو ذکر ہی کیا، برف تک میسر نہیں۔ نہ کلب نہ سینما۔ ایک بیٹری والا ریڈیو جس پر صبح دوپہر شام وہ ریڈیو سیلون سے فلمی گانے سن کر تھوڑی دیر دل بہلا لیتی تھی، مگر اس کمبخت بیٹری کو بھی خراب ہونا تھا۔ اگر رمیش آج شہر سے اسے بنوا کر نہ لایا تو دیکھنا کتنا لڑوں گی۔

رمیش — اس کا شوہر۔ تین برس ان کی شادی کو ہو گئے تھے۔ مگر اس عرصے میں کتنی تبدیلی ہو گئی تھی اس میں۔ کبھی کبھی تو اوشا کو ایسا لگتا تھا جس رمیش سے اس کی ملاقات نینی تال میں ہوئی تھی، جس سے اس نے پہلے محبت اور پھر شادی کی تھی، وہ کوئی اور رمیش تھا اور یہ گورنمنٹ فارم کا ڈائرکٹر رمیش کوئی اور ہی رمیش ہے۔

تین برس پہلے وہ امریکہ سے ایگریکلچر کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ لمبا قد، گھنے چمکیلے بال، چمکیلی آنکھیں، ٹویڈ کا کوٹ اور کورڈورائے کی پتلون پہنے بالکل گریگری پیک لگتا تھا۔ نینی تال میں جتنی کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں اس سیزن میں آئی ہوئی تھیں، سب ہی تو اس پر لٹو تھیں۔ مگر رمیش کی نظر انتخاب اوشا پر پڑی، جس نے اسی سال آئی کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ اوشا کے پتاجی

الہ آباد کے مشہور وکیل تھے۔ انھوں نے بھی رمیش کو پسند کیا تھا۔ گو لڑکا غریب خاندان سے تھا، مگر ذہین اور ہونہار تھا۔ گورنمنٹ اسکالرشپ پر امریکہ ہو کر آیا تھا اور کسی اچھی سرکاری نوکری کا امیدوار تھا۔

شادی کے بعد کا ایک سال انھوں نے کتنی ہنسی خوشی سے گزارا تھا۔ رمیش کو اتر پردیش کے سرکاری ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ میں اچھی نوکری مل گئی۔ پانچ سو روپے مہینہ، رہنے کو بنگلہ، لکھنؤ کی رنگین زندگی، حضرت گنج کی رونق اور گہما گہمی، راج بھون کی گارڈن پارٹیاں، اونچے سرکاری حلقوں میں میل جول۔ کالج کے زمانے سے ہی اوشا کی لکھنؤ میں کافی جان پہچان تھی۔ اب تو مسز رمیش چندر کی حیثیت سے وہ لکھنؤ سوسائٹی کی سب سے مقبول اور ممتاز ہستیوں میں شمار ہونے لگی۔

لکھنؤ میں اوشا کو زندگی کی سب دلچسپیاں میسر تھیں۔ بنگلے کو اس نے بڑے سلیقے اور اہتمام سے سجایا تھا۔ اپنی نگرانی میں باغ لگوایا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا ان کے لکھنؤ والے بنگلے کا باغ۔ خصوصاً گلاب کے پودے جو اوشا نے خود بوئے تھے اور جن کو اس نے مہینوں اپنے ہاتھ سے پانی دیا تھا۔ کتنی محنت اور محبت سے اسنے ان پودوں کو پروان چڑھایا تھا اور جس دن گلاب کا پہلا پھول کھلا تھا اس دن اوشا کو کتنی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ بڑی احتیاط سے پھول کو توڑ کر دن بھر پانی میں رکھا۔ شام کو رمیش کے آنے سے پہلے بڑے اہتمام سے سنگار کیا۔ گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی باندھی اور بال بنا کر جوڑے میں وہی گلاب کا پھول سجایا۔ مگر اوشا کی دن بھر کی خوشی خاک میں مل گئی جب رمیش دفتر سے لوٹا اور اس نے جوڑے میں سجے ہوئے پھول کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ مایوسی کا وہ لمحہ ایک خلش کی طرح دو برس بعد بھی اوشا کی یاد میں چبھ رہا تھا۔

''کیوں جی......!'' اور اوشا کو امید تھی کہ اتنا کہنا ہی کافی ہے۔ رمیش کی نظر ضرور بالوں میں لگے ہوئے پھول پر جائے گی۔

''کہو کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''کیوں کچھ کہنا تو چاہتی تھیں؟''

''تو بتاؤ میں آج کیسی لگ رہی ہوں؟''

''جیسی ہمیشہ لگتی ہو...... بہت خوبصورت۔''

''بس رہنے دو۔ تمھاری تو نظر ہی بدل گئی ہے۔''

''مطلب؟''

اس کے جواب میں اوشا نے رونا شروع کر دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی: ''مطلب یہ کہ تمھیں اب مجھ سے محبت ہی نہیں رہی۔''

رمیش اس الزام کو سن کر ایک لمحے کے لیے تو پریشان ہوا مگر پھر مسکرا کر بولا:

''کیا پاگل ہوگئی ہو؟ یا کسی اسکینڈل مونگر نے تمھارے کان بھرے ہیں۔ آخر یہ خیال تمھیں پیدا کیسے ہوا کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی؟''

''تو پھر تم اب میرا نوٹس کیوں نہیں لیتے؟ یاد ہے نینی تال میں جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو شادی سے پہلے تم میری ہر بات کا نوٹس لیتے تھے۔ اب تو تم کبھی دیکھتے ہی نہیں کہ میں کون سی ساڑھی پہنے ہوئے ہوں یا میں نے کون سی خوشبو لگائی ہے یا میرے بالوں میں کون سا پھول لگا ہے؟''

اب پہلی بار رمیش کی نظر اوشا پر پڑی اور اس نے پھول کو سونگنے کے بہانے چومتے ہوئے کہا: ''اوہو! اس گلاب کی وجہ سے ہم پر ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ اچھا بھئی! ہم اس پھول کی شان میں ایک پورا قصیدہ پڑھ دیتے ہیں۔ تمھارے بالوں میں لگا یہ گلاب ایسا لگتا ہے جیسے کالے بادلوں میں سے سورج جھانک رہا ہو یا اندھیری رات میں گاؤں کے باہر الاؤ جل رہا ہو......''

''بس رہنے دو مذاق!'' اوشا نے آنسو پونچھ کر اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے کہا اور ان کی ازدواجی زندگی کا یہ پہلا حادثہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ مگر اوشا کے دل میں ایک عجیب سی بے اطمینانی اور عجیب سی چبھن رہ گئی۔ یہ بے اطمینانی اور بھی گہری ہوتی گئی جب رمیش نے دفتر کے اوقات کے بعد بھی یونیورسٹی کی لیبارٹری میں ریسرچ کے لیے جانا شروع کر دیا۔

''صبح سے شام تک تو دفتر میں سر کھپاتے ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تمھیں ریسرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اوشا نے چھوٹتے ہی کہا جب رمیش نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

''یہ دفتری کام تو میں مجبوری میں کرتا ہوں اوشا! صرف اپنا اور تمھارا پیٹ پالنے کے لیے۔ ورنہ ہمیشہ سے میرا ارادہ زراعت کے مختلف مسئلوں پر ریسرچ کرنے ہی کا تھا۔ شام کو بیکار بیٹھنے سے بہتر ہے کہ میں کچھ دیر لیبارٹری میں گزار کر آیا کروں۔''

''تو یہ ریسرچ کرنے سے کیا تمھاری تنخواہ بڑھ جائے گی؟''

''نہیں، میری تنخواہ تو نہیں بڑھے گی، مگر ہو سکتا ہے ہمارے سارے دیش کی گیہوں کی

پیداوار بڑھ جائے، کیونکہ گیہوں کے پودوں کو جو کیڑے کھا جاتے ہیں ان کی روک تھام کے لیے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔''

''بڑے دیش سیوک آئے کہیں سے۔ میں پوچھتی ہوں دیش نے تمھارے لیے کیا کیا ہے؟ امریکہ سے اتنی بڑی ڈگری لے کر آئے ہو، اوراس پر صرف پانچ سو روپے کی نوکری ملی ہے۔'' اوشا کی بے اطمینانی میں یہ حسرت بھی شامل تھی کہ اس کے شوہر کی تنخواہ ہزار یا پندرہ سو کیوں نہیں ہے۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں امریکہ سے اتنی بڑی ڈگری لے کر آیا ہوں۔ سچ پوچھو تو میں نے دو برس پردیس میں رہ کر جھک مارا۔ وہاں کے حالات یہاں سے اتنے مختلف ہیں کہ وہاں کی زراعتی تعلیم عملی طور پر ہمارے کسی کام کی نہیں۔ دوسرے یہ کہ پانچ سو روپے کچھ کم نہیں ہوتے۔ مجھے تو شکایت صرف یہ ہے کہ مجھے ایک دفتر میں کرسی پر بٹھا دیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کسی فارم پر مجھے عملی کام کرنے کا موقع دیا جاتا۔''

اوشا نے دُکھی ہو کر کہا: ''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم شام کو دفتر سے لیبارٹری چلے جایا کرو گے اور میں گھر میں بیٹھی تمھارا انتظار کیا کروں۔ نہ کلب جاؤں، نہ سنیما، نہ کسی سے ملنے......''

''یہ کس نے کہا کہ تم گھر ہی بیٹھی رہا کرو۔ تم کلب بھی جا سکتی ہو۔ اپنی سہیلیوں کے ہاں بھی جا سکتی ہو اور جب جی چاہے ان کے ساتھ سنیما بھی جا سکتی ہو۔ منع کس نے کیا ہے؟''

اس دن سے یہ معمول ہو گیا کہ رمیش دفتر سے سیدھا یونیورسٹی چلا جاتا اور اوشا وقت کاٹنے کے لیے کوئی نہ کوئی فلم دیکھنے چلی جاتی۔ رات کو کھانے پر ملاقات ہوتی تو رمیش کہتا: ''بڑی ہمت ہے تمھاری۔ نہ جانے کیسے تم ہر روز ایک فلم دیکھتی ہو؟ میری آنکھیں تو کبھی اتنا بڑا اسٹرین نہ برداشت کر سکیں۔'' واقعہ بھی یہ تھا کہ اپنی دبیز شیشوں کی عینک کے باوجود رمیش کو سنیما کے پردے پر تصویریں دھندلی ہی نظر آتی تھیں اور اس لیے جہاں تک ہوتا وہ سنیما جانے سے کتراتا تھا۔ مگر اوشا کہتی:

''واہ میرا بس چلے تو دن میں دو دو فلم دیکھا کروں۔ سچ کہتی ہوں تم دیپ کمار کی نئی فلم ''آوارہ شہزادہ'' دیکھو تو زم ہو جاؤ۔''

''یہ زم کیسے ہوتا ہے؟''

''مطلب یہ کہ وہ اتنا ہینڈسم ہے کہ دیکھنے والے کا دم زم سے نکل جائے۔ یہ ہمارے کالج کا محاورہ ہے۔''

''تمھارے کالج میں انگریزی، ہندی، تاریخ، جغرافیہ کے علاوہ فلم اسٹاروں پر زم ہونا بھی سکھایا جاتا ہے کیا؟''

مگر اوشا پر اس طنز کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی جوش کے ساتھ دیپ کمار اور اس کی فلموں کی تعریف کرتی رہی: ''اس وقت اس کے مقابلے کا ایک بھی ایکٹر نہیں ہے۔ رومینٹک سین تو ایسا کرتا ہے کہ کوئی ہالی ووڈ اسٹار بھی کیا کرے گا۔ اور پھر جیسا اچھا ایکٹر ہے، ویسا ہی ڈائرکٹر بھی۔ ''آوارہ شہزادہ'' میں کیا کام کیا ہے اس نے! واہ واہ! ایک ہی فلم میں چار چار میک اپ بدلے ہیں۔ شہزادہ، بھکاری، داڑھی والا سِکھ ٹیکسی ڈرائیور ایسی پنجابی بولتا ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور تو اور ایک سین میں گوالن کا بھیس بدلتا ہے۔ اتنی اچھی عورت کی ایکٹنگ کی ہے کہ پہلے تو کوئی پہچانتا ہی نہیں۔ جب دوسرا بھیس بدلنے کے لیے نقلی لمبے بالوں کی وِگ اتارتا ہے تب پتا لگتا ہے کہ ارے یہ تو وہی شہزادہ ہے۔ سچ کہتی ہوں گوالن کے بھیس میں اتنا خوبصورت لگتا ہے کہ تم بھی دیکھو تو عاشق ہو جاؤ۔''

رمیش نے ہنس کر کہا: ''ہم تو اسے بن دیکھے ہی عاشق ہونے کو تیار ہیں۔ اس لیے کہ جو اس پر عاشق ہے، ہم اس پر عاشق ہیں۔''

ان دونوں میں اس قسم کے مذاق اکثر چلا کرتے تھے۔ اور اب تک نہ کسی نے بُرا مانا تھا نہ غلط فہمی پیدا ہوئی تھی۔ سو اوشا نے کہا: ''تم اپنی لیبارٹری کی خبر سناؤ۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں ایم ایس سی کی کئی خوبصورت لڑکیاں بھی ریسرچ کرنے آتی ہیں۔ اسی لیے تم روز کام کا بہانہ کر کے جاتے ہو۔''

رمیش ہنس کر بولا: ''ہے تو کچھ ایسی ہی بات۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ مجھے منہ نہیں لگاتیں...... میں سوچتا ہوں وہاں تو اپنی دال گلی نہیں۔ اب گھر پر ہی ریسرچ کیا کروں۔''

'گھر پر؟ کیا یہاں لیبارٹری بناؤ گے؟''

''لیبارٹری بھی ایک چھوٹی موٹی بنا لیں گے۔ مگر در اصل مجھے بعض نئی قسم کے گیہوں کے بیجوں پر ریسرچ کرنی ہے۔ اس کے لیے یا تو دس میل دور یونیورسٹی کے فارم پر روز جاؤں جو میرے لیے مشکل ہے یا پھر اپنے بنگلے ہی میں چھوٹا سا فارم بنا لوں۔''

'مگر ہمارے ہاں اتنی جگہ ہی کہاں ہے؟ مشکل سے تین چار کیاریاں تو ہیں اپنے باغ میں۔''

''اتنی جگہ بھی کافی ہے۔ اگر ہم ان سب کیاریوں کو توڑ کر ہل چلوا دیں تو گیہوں بو سکتے

ہیں۔ تجربے کے لیے تھوڑی سی فصل بھی ہو جائے تو اپنا کام چل جائے گا۔''

اوشا نے تنک کر کہا: ''نا بابا! میں اپنی کیاریوں میں ہل نہیں چلنے دوں گی۔ یہ خوب ہے کہ میرے اتنے خوبصورت گلاب کے پودوں کو اُجاڑ کر تم وہاں گیہوں کی کاشت کرو۔ کھیتی باڑی کرنی ہے تو کوئی اور جگہ تلاش کرو۔''

اور رمیش نے دفعتاً سنجیدہ ہو کر کہا: ''تو پھر ایسا ہی کچھ کرنا پڑے گا۔''

اگلے ہفتے دفتر سے شام کو لوٹ کر رمیش نے اوشا کو خبر سنائی کہ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب اسے لکھنؤ سکریٹریٹ چھوڑ کر بریلی کے قریب گورنمنٹ کے ایک تجرباتی فارم کو سنبھالنا ہو گا۔

اور اب ڈیڑھ برس سے وہ تھے اور یہ فارم تھا۔ میلوں تک پھیلے ہوئے یہ کھیت، ٹریکٹروں کی غیر شاعرانہ گڑگڑاہٹ، گرمی میں لو، جاڑے میں پہاڑوں کی طرف سے آتی ہوئی برفیلی ہوائیں، برسات میں ہر طرف پانی ہی پانی، سڑکیں بالکل ہی بند ہو جاتیں اور ان کا چھوٹا سا گھر ایک جزیرہ بن جاتا۔ ویسے بھی اوشا کو اکثر یہی محسوس ہوتا تھا کہ رمیش نے اسے تنگ کرنے کے لیے ایک غیر آباد جزیرے پر لا کر قید کر دیا ہے۔ یوں فارم پر کئی سو کسان، مزدور، ٹریکٹر ڈرائیور اور ٹرک چلانے والے کام کرتے تھے جو آدھے میل کے فاصلے گاؤں میں رہتے تھے، لیکن اوشا کی نفاست پسند طبیعت ان کو لکھنؤ کی سوسائٹی کا نعم البدل تسلیم کرنے سے انکار کرتی تھی۔ ایک بار ہولی کے موقع پر رمیش اسے گاؤں لے گیا۔ رات کو فارم کے سارے اسٹاف نے مل کر جلسہ کیا۔ دیہاتی گانے گائے۔ دیہاتی ناچ ناچے۔ مٹھائی تقسیم کی۔ رمیش نے سوچا تھا کہ اکیلے رہتے رہتے اوشا گھبرا گئی ہے۔ اس جلسے میں شرکت کر کے اس کی طبیعت بہل جائے گی۔ مگر جو فلمی گانوں اور فلمی ناچوں کی دلدادہ تھی، اسے ان بھدّے ناچ گانوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ تین گھنٹے تک وہ کرسی پر بیٹھی غیر متعلق انداز میں اکتاہٹ کے ساتھ پروگرام دیکھتی رہی۔ اختتام پر رمیش کو اور اسے ہار پہنائے گئے۔ مگر یہ ہار گلاب کے پھول سے نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان میں گیہوں کی بالیں پروئی گئی تھیں۔ اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور نے گھبراہٹ کے مارے ہکلاتے ہوئے کہا: ''ہم اپنے ڈائرکٹر صاحب اور ان کی شریمتی جی کو گلاب کے پھولوں کے بجائے گیہوں کی بالوں کے ہار پہنا رہے ہیں کیونکہ ہم کسانوں کے لیے تو گیہوں میں ہی سارے جہاں کی خوبصورتی ہے، خوشبو ہے، خوشحالی ہے۔ گیہوں ہی میں ہماری زندگی ہے۔'' اپنے گنوار لہجے میں اس نے ہر لفظ کا تلفظ بگاڑ کر ادا کیا تھا۔ کھوب سورتی، کھُس بو، کھُس حال، جند گی۔ اور اوشا نے گھر پہنچتے ہی اس گندمی ہار کو جس

کی کانٹے دار بالوں سے اس کی نازک گوری گردن پر خراشیں پڑ گئی تھیں، اتار پھینکا۔ جیسے وہ اس کے ساتھ فارم کی ساری خشک اور غیر شاعرانہ زندگی ہی کو گلے سے اتار کر پھینک رہی ہو۔

گیہوں گیہوں گیہوں۔ رمیش کے ساتھ رہ کر اوشا کو اس لفظ ہی سے چڑ ہوگئی تھی۔ صبح اٹھو تو گیہوں کا ذکر، کھانے پر گیہوں کا ذکر، ٹہلنے جاؤ تو گیہوں کے کھیتوں میں۔ ہر قدم پر رمیش کو کوئی ''گندمی'' مسئلہ یاد آ جاتا۔

''دیکھو اوشا! گیہوں کی ایک نئی قسم جو میں نے اُگائی ہے، اس کا دانا سرخ اور سخت ہوتا ہے۔ اسے رسٹ کی بیماری نہیں لگ سکتی۔'' یا ''دیکھو اوشا! یہ روسی نسل کا گیہوں ہے اور اس کے برابر کے کھیت میں یہ امریکی نسل کا گیہوں۔ دونوں پنچ شیلا کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ایک ہی فارم پر برابر برابر اُگ رہے ہیں۔ اب میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان دونوں کے میل سے گیہوں کی ایک نئی قسم اُگاؤں۔ اس میں امریکی گیہوں کی طرح دانا بڑا نکلے گا اور روسی گیہوں کی طرح گرمی سردی ہر قسم کا موسم برداشت کرنے کی طاقت ہوگی۔ میں سوچتا ہوں اس نئی قسم کا نام رکھوں گا ''شانتی گیہوں''۔ کیوں کیسی رہی؟''

اور اوشا جل کر کہتی: ''گیہوں، گیہوں، گیہوں۔ تمھارے لیے دنیا میں اور کوئی بات ہی نہیں رہ گئی۔ تم تو مجھے بھی گیہوں کا ایک دانا ہی سمجھتے ہو۔''

''بے شک!'' رمیش ہنس کر کہتا۔ ''تم میں اور گیہوں کے دانے میں بڑی مشابہت ہے۔ گیہوں کے دانے میں انسان کی زندگی ہے اور تم......؟ میری جان ہو۔''

''بس رہنے دو۔ جھوٹی خوشامد کوئی تم سے سیکھ لے۔ کب سے کہہ رہی ہوں کہ بریلی جاؤ تو وہاں کسی کے باغ میں سے گلاب کی قلمیں لیتے آؤ۔ میں بنگلے کے سامنے پھولوں کا باغ لگاؤں گی۔ مگر تمھیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا ہے۔''

اور ایک بار پھر رمیش وعدہ کر لیتا ہے کہ اس بار وہ بریلی جائے گا تو گلاب کے پودے ضرور لائے گا۔ مگر اگلی بار پھر بھول جاتا اور ایک بار پھر وہ ایک نیا وعدہ کر لیتا۔ اور اوشا کی طبیعت گلاب کے پھول کے لیے تڑپتی رہی جیسے بن اولادی عورت کی مامتا بچّے کو گود میں کھلانے کے لیے تڑپتی ہے۔

گلاب کے پھول! سرخ مخملی پھول، منّی منّی گلابی کلیاں، ادھ کھلے غنچے جیسے ننھے منے ہمکتے بچّے ماں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہوں۔ ایسا لگتا تھا اوشا کی ساری آرزوئیں سمٹ کر فلمی رسالے کے

سرورق کی اس رنگین تصویر میں آ گئی ہیں۔ نیچے لکھا تھا ''فلم اسٹار دیپ کمار کے باغ کا ایک منظر، دیپ کمار پھولوں کا بہت دلدادہ ہے۔ اور اس کے گھر کے گرد باغ میں بارہ قسم کے گلاب کھلے ہوئے ہیں۔ دیپ کمار کے گھر کی باقی تصویریں اندر دیکھیے۔''

اندر دو صفحوں میں دیپ کمار کے مکان ''آشادیپ'' کی رنگین تصویریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں پیلے پھولدار پردے، نیلے صوفوں پر رنگ برنگے کُشن، دیوار پر ایک مشہور آرٹسٹ کی بنائی ہوئی پھولوں کی پینٹنگ۔ ریڈیوگرام کے اوپر نٹراج کا بُت۔ ڈائننگ روم میں ریفریجریٹر کے اوپر گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا گلدان۔ بیڈروم کی کھڑکی میں سے گلاب کی جھاڑیاں سر اٹھائے ہوئے جھانکتی ہوئی۔ کتنا شاعرانہ حسن پرور ماحول ہے اس گھر میں۔ اوشا نے سوچا اور ایک ہمارا گھر ہے۔ جدھر دیکھو گیہوں کی بالیاں، بدبودار کھاد کے نمونے، صوفوں کے بجائے مونڈھے، سپرنگ دار مسہریوں کے بجائے رسّی سے بنائے ہوئے پلنگ، ریفریجریٹر کے بجائے گھڑا، ریڈیوگرام کے بجائے ہینڈل گھمانے والا گراموفون اور بیٹری والا ریڈیو، جس کی بیٹری ہمیشہ ہی بگڑتی رہتی ہے۔ سچ کہتی ہوں اگر آج بھی بیٹری نہ بنوا کر لائے تو......

دور سے جیپ کے کرخت ہارن کی آواز آئی اور اوشا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ رمیش کے استقبال کے لیے پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ساڑھی کا پلّو سنبھالتی ہوئی برآمدے کی طرف دوڑی۔ رمیش کے ساتھ ڈاک بھی آئی ہوگی۔ اسے کئی فلمی رسالوں کا انتظار تھا۔

کھیتوں کے بیچ میں سے کچی سڑک پر دھول کے بادل اڑاتی جیپ آئی اور دفعتاً بریک کی آواز کے ساتھ ٹھہر گئی۔ رمیش کے برابر کی سیٹ پر ڈاک کا پلندا تھا۔ اوشا برآمدے کی سیڑھیاں اترتی ہوئی دوڑی۔

''ارے...... رے کیا کرتی ہو۔ اتنی دھوپ میں ننگے سر دوڑی چلی آتی ہو۔ لُو لگ جائے گی۔'' رمیش جیپ سے اترتے ہوئے چلاّیا۔ ''چلو اندر ورنہ کوئی فلمی رسالہ نہیں ملے گا۔''

رمیش حسب معمول خاکی نیکر، خاکی قمیض، ہیٹ اور پٹھانی چپّل پہنے ہوئے تھا۔ اس کے گھنے بالوں میں راستے کی گرد اٹی ہوئی تھی۔ پسینے سے قمیض بھیگی ہوئی تھی۔

صبح سویرے ہی شہر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اس لیے شیو نہیں کیا تھا اور داڑھی کے سخت سیاہ بالوں کی کھونٹیاں نکلی ہوئی تھیں۔

''پہلے یہ بتاؤ، میری سب چیزیں لائے یا نہیں؟'' اوشا نے برآمدے میں ٹھنک کر کہا۔

''سب کچھ لایا ہوں۔'' رمیش نے اپنا ہیٹ اوشا کے سر پر رکھتے ہوئے کہا اور جیپ میں سے سامان اتارنے لگا۔

''بیٹری ٹھیک ہوگئی؟''

''بالکل، یہ لو۔ اب تم ریڈیو سیلون کی سب بکواس سن سکتی ہو۔''

''اور کولڈ کریم؟''

''کولڈ کریم بھی ہے۔ مگر راستے میں گرم ہو کر تیل بن گیا تو میں ذمے دار نہیں۔''

''اور میرے لیے اور کیا لائے ہو؟''

''اور کچھ نہیں۔ سوائے تمھارے رسالوں اور کچھ میری کام کی چیزوں کے۔ گیہوں اور دھان اور ترکاریوں کے بیج ہیں اور کچھ پودوں کی قلمیں ہیں۔''

''یہ تو نہ ہوا کہ میرے لیے گلاب کی قلمیں بھی لے آتے۔'' اوشا ٹھنک کر بولی۔

''ان کی تم فکر نہ کرو۔ ایک دن جادو سے میں گلاب کے پھول تمھارے باغ میں کھلا دوں گا۔ اچھا اب اندر آؤ۔ مجھے تمھیں ایک ضروری بات بتانی ہے۔

رمیش نے قمیض اتاری۔ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر تولیہ لیے باہر آیا اور ڈاک کے پلندے میں سے ایک خط نکال کر اوشا کی طرف بڑھا دیا۔

''بھئی یہ پڑھو۔ بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ ایک فلم کمپنی یہاں فارم پر شوٹنگ کرنے کے لیے آنے والی ہے۔ اور ہمیں ان کی مہمان داری کرنی پڑے گی۔ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ ان کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے کیونکہ سرکاری پالیسی یہی ہے کہ ایسے پروڈیوسروں کی مدد کی جائے جو پروجیکٹس وغیرہ کے بارے میں فلمیں بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے تو بڑا بورنگ پروگرام معلوم ہوتا ہے۔ کام کا بھی ہرج ہوگا سو الگ۔ مگر تم تو ضرور خوش ہوگی۔''

''چھوڑو جی!'' اوشا نے بددلی سے کاغذ لفافے سے باہر نکالتے ہوئے کہا: ''کوئی نیوز چینل والے ہوں گے۔ موٹے کالے کیمرہ مین جو ٹریکٹروں اور ہلوں کی ہر زاویے سے تصویریں لے کر چل دیں گے۔''

''کمپنی کا نام تو پڑھو۔'' رمیش نے شرارت سے کہا: ''دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔''

''دیپ کمار پروڈکشنز۔ اپنے فلم ''نیا ہندستان'' کی شوٹنگ کرنے؟ اس کا مطلب ہے

کہ......''

''تمھارے محبوب اداکار، ڈائرکٹر، پروڈیوسر اور نہ جانے کیا کیا الا بلا۔ مسٹر دیپ کمار بذاتِ خود جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔''

اور اوشا نے رمیش کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا: ''سچ رمیش! بڑا مزا آئے گا۔ مگر میرے پاس تو کوئی ڈھنگ کی ساڑھی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ آئیں گے تو میں پہنوں گی کیا؟''

دیپ

''ہاں تو مسٹر دیپ کمار! اس وقت آپ اپنے کون سے فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کرنے جا رہے ہیں؟''

''نیا ہندستان۔''

''اس فلم کے بارے میں آپ ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟''

''ضرور۔ اس فلم میں ہم ان تبدیلیوں کو دکھانا چاہتے ہیں جو کہ ہندستانی سماج میں آزادی کے بعد ہوئی ہیں۔ ہندستان کی زیادہ تر آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور کھیتی باڑی کرتی ہے۔ اس لیے فلم کا پس منظر ہے ایک ماڈل فارم جہاں ہیرو کسانوں کو زراعت کے نئے طریقے سکھاتا ہے۔ دراصل میں کئی برس سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے بیشتر فلموں کا ماحول اور ان کے کردار پرانے ہو چکے ہیں۔ ان کا تعلق آج کے ہندستان سے، آج کے سماجی اور نفسیاتی ماحول اور مسائل سے بالکل نہیں ہے۔ ان فلموں کو دیکھنے سے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم ابھی تک انیسویں بلکہ اٹھارویں صدی میں رہ رہے ہوں بلکہ کبھی کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسے کردار کسی صدی میں بھی وجود نہیں رکھتے تھے۔''

''جیسے آپ کی فلم ''آوارہ شہزادہ'' جس میں ہیرو ایک ٹین کی تلوار سے ایک درجن سپاہیوں کو گرا دیتا ہے اور ہیروئن جو ایک چرواہے کی بیٹی ہے، ہر سین میں ایک نیا ریشمی لباس پہنے نظر آتی ہے۔''

''آوارہ شہزادہ کو Realism کی کسوٹی پر پرکھنا ایک غلطی ہوگی۔ یہ ایک تفریحی فلم تھی جو عوام کو ہنسانے اور ان کے دل کو خوش کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ پبلک کا دل بہلانا ہی تو آرٹسٹ

کا اولین فرض ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ''آوارہ شہزادہ'' جیسی فلم نئے ہندستان کی تشکیل اور ترقی میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ صرف ''آوارہ شہزادہ'' کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگا ہے، اس کا حساب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس فلم نے گورنمنٹ کو ایک کروڑ روپیہ دیا ہے۔ یہ روپیہ کہاں جائے گا؟ نہریں، سڑکیں، ڈیم اور بجلی گھر بنانے ہی میں خرچ ہوگا...... اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ''آوارہ شہزادہ'' جیسی فلم کتنی اہم اور ضروری ہے۔

''سنا ہے ''آوارہ شہزادہ'' سے آپ کو بھی تو چالیس لاکھ کا منافع ہوا ہے؟''

''ہوا ہوگا شاید۔ یہ روپے آنے، پائی کا حساب میرے اکاؤنٹنٹ جانتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ آپ کو شاید یہ تو معلوم ہوگا کہ میں کوئی فلم روپیہ کمانے کے لیے نہیں بناتا۔ میرا مقصد تو صرف آرٹ کی خدمت کرنا ہے۔ اور آرٹ کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت کرنا۔''

''جی ہاں...... اس میں کیا شک ہے۔''

یہ انٹرویو بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر فرنٹیر میل کے ایر کنڈیشنڈ درجے کے سامنے ہو رہا تھا۔ دیپ کمار پروڈکشنز کے عملے کے باقی لوگ اپنے اپنے ڈبوں میں بیٹھ چکے تھے۔ ہیروئن الکارانی اور اس کی اینگلو انڈین ہیر ڈریسر جولیا ایک ایر کنڈیشنڈ کوپے میں، کیمرہ مین بھاسکر اور ساؤنڈ انجینئر ڈیسائی سیکنڈ کلاس میں، اسسٹنٹ ڈائرکٹر وغیرہ انٹر میں اور باقی ملازمین تھرڈ کلاس میں۔ صرف دیپ کمار جرنلسٹوں اور تماش بینوں کی بھیڑ میں گھرا ہوا پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ مگر جب اس کے سکریٹری وامن راؤ نے آکر اسے یاد دلایا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں تو دیپ کمار نے بڑے اہتمام سے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے سب سے اجازت چاہی۔

''اچھا تو بھائی لوگو! اب اجازت ہے۔ کچھ اور لوگوں کو بھی رخصت کرنا ہے۔'' اور یہ کہہ کر وہ اپنے ریزروڈ کوپے میں داخل ہوا اور دروازہ بند ہو گیا۔

''کیوں، پارو! کہو کیا ارادہ ہے؟ چلتی ہو؟ ٹکٹ کی کوئی فکر نہیں کیونکہ اس پورے کوپے پر قبضہ کرنے کے لیے میں نے پہلے ہی دو ٹکٹ خریدے ہوئے ہیں۔ رہے کپڑے، تو دہلی میں خرید لینا۔''

''نہیں جی، تم جاؤ۔ میں تمھارے ساتھ ہوں گی تو لوگ نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ دیکھتے نہیں، کتنے جرنلسٹ باہر کھڑے ہیں۔''

''کہیں گے کیا؟ کیا میاں بیوی کا ساتھ سفر کرنا جرم ہے؟''

"عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ مگر تمھارے جیسے فلم اسٹار کوئی معمولی لوگ تھوڑا ہی ہیں۔ ذرا سوچو تو راستے میں جب باہر اسٹیشن پر تمھارے چاہنے والوں کی بھیڑ لگے گی اور اسکول کالج کی لڑکیاں اپنی کلاسز چھوڑ کر تمھارے درشن کرنے آئیں گی، تب اگر انھوں نے دیکھا کہ ان کا چہیتا دیپ اپنی بیاہتا بیوی کے ساتھ سفر کر رہا ہے، تو ان کو کتنی مایوسی ہوگی۔ ایسی باتوں سے تمھاری مقبولیت کو کافی دھچکا لگ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے تمھاری اگلی پکچر فیل ہی ہو جائے۔ ایک بات یاد رکھو کہ فلم اسٹار کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ لاکھوں لڑکیاں من ہی من میں اسے اپنا چاہنے والا تصور کرتی رہیں۔ بیوی جیسی غیر رومانی ہستی ان کے رومانی تصورات چکنا چور کر دے گی۔ اس لیے میرا یہیں رہنا بہتر ہے۔"

دیپ کو معلوم تھا کہ پاروتی جو کہہ رہی ہے، وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ لیکن جس انداز سے وہ کہہ رہی تھی، اسے طنز کی ہلکی سی چبھن بھی محسوس ہوتی تھی۔ وہ پاروتی سے شادی کے پانچ سال بعد بھی محبت کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس سے ویسی ہی شدید محبت کرتی ہے۔ لیکن اسے شبہ یہ تھا (اور یہ شبہ اب یقین میں تبدیل ہوتا جارہا تھا) کہ وہ عظیم فنکار، دیپ کمار کا رعب بالکل نہیں مانتی۔ بلکہ شاید اس کی عزت بھی نہیں کرتی۔ اکثر دیپ کو یہ محسوس ہوتا کہ پاروتی دل ہی دل میں اس پر ہنس رہی ہے۔ اس کے عظیم فنکارانہ پوز کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتی جیسے بزرگ بچوں کے ساتھ کرتے ہیں یا عقل مند کم عقلوں کے ساتھ اور اس وقت دیپ کو اپنی زندگی میں ایک عمیق خلاء کا احساس ہوتا۔ جیسے اپنی بے انتہا دولت کے باوجود وہ کنگال ہو۔ جیسے اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود وہ گمنام اور غیر معروف ہو اور باوجود اس کے کہ فلمی حلقوں میں اسے Genious سمجھا جاتا تھا۔ وہ جاہل اور بیوقوف ہو، بات یہ تھی کہ پاروتی کے سامنے دیپ کو احساس کمتری رہتا تھا۔ وہ اس کی ہر ہیروئن سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کا باپ بمبئی کا ایک مشہور اور مالدار سالیسٹر تھا (جب کہ دیپ کا باپ دو سال پہلے دہلی کے چاندنی چوک میں گھڑیوں کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا) اور اس نے انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا تھا۔ جبکہ دیپ کی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک تھی۔ وہ باپ کے ساتھ یورپ گھوم آئی تھی اور پیرس کے Lovre میوزیم، روم کے سینٹ پال گرجا، لندن کے ہائڈ پارک کی باتیں وہ ایسی لاپرواہی سے کیا کرتی جیسے کوئی بمبئی والا دادر، ماہم یا کلبا دیوی کا ذکر کر رہا ہو، جبکہ دیپ دہلی اور بمبئی کو چھوڑ کر ہندستان کے کسی تیسرے شہر سے بھی ناواقف تھا۔ فلمی رسالوں میں مضمون چھپتے (جن میں سے اکثر دیپ

کے اپنے پبلسٹی منیجر کے لکھے ہوئے ہوتے تھے) کہ دیپ کمار کی اداکاری میں دلیپ کمار کی سنجیدگی اور راج کپور کی شوخی کا ایک انوکھا امتزاج ہے۔اس کی ایکٹنگ کا مقابلہ کلارک گیبل اور جیمز سٹورٹ سے کیا جاتا تھا۔لیکن جب وہ گھر آتا تو پاروتی لارنس اولیو یا چر کا سوف کے فن کا ذکر اس انداز میں کرتی کہ ان کے مقابلے میں دیپ کمار اپنے آپ کو ہیچ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔اس کی فلم ''چال نمبر بارہ'' کی تعریف میں اخباروں نے کالم کے کالم لکھ ڈالے اور دیپ کو حقیقت نگاری کا ماہر کہا جانے لگا۔مگر پاروتی نے صرف اتنا کہا: ''کیوں اٹالین فلموں کی نقل میں اپنا دیوالہ نکالنا چاہتے ہو۔''

اس کی فلم ''آوارہ شہزادہ'' نے کئی برس کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔لیکن اپنی بیوی کی زبان سے اس نے تعریف کا ایک لفظ نہ سنا۔سوائے اس کے کہ ''چلو اچھا ہے، تمھارے پچھلے قرضے تو اتر جائیں گے۔''

مگر اب ''نیا ہندستان'' فلم بنا کر دیپ کو یقین تھا کہ وہ پاروتی کو بھی ایک بار اپنے آرٹ کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر سکے گا۔اس فلم سے وہ فلمی دنیا میں انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا۔ سماج کے لیڈروں، منسٹروں اور گورنمنٹ کے افسروں کو دکھانا چاہتا تھا کہ کس طرح فلم سے ساری قوم کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔اور عوام کو نئے اور ترقی پسند خیال سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔یہ فلم وہ ایک نئے ڈھنگ سے بنانا چاہتا تھا۔اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس میں زیادہ تر آوٹ ڈور شوٹنگ ہوگی۔ ایکسٹراز کے بجائے سچ مچ کے کسان مزدور اس میں کام کریں گے۔گورنمنٹ سے خط و کتابت کے بعد اس نے ایک سرکاری ماڈل فارم پر شوٹنگ کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اس سفر میں پاروتی بھی اس کے ساتھ ہو اور ایک بار اس کو بھی یقین آجائے کہ اس کا شوہر ایک گھٹیا فلم ایکٹر اور تجارتی فلم پروڈیوسر نہیں ہے، بلکہ ایک مخلص اور بلند تخیل فنکار ہے۔مگر پاروتی نہ مانی۔اس نے کہا میں جاؤں گی تو بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔اور اس گرمی میں میں بچوں کو اتنے لمبے سفر پر لے جانا نہیں چاہتی۔

''اچھا تو پارو! اب تم اترو۔'' دیپ نے کہا۔جب گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔''جونیر اور جمو کو پیار کہنا اور ہر روز اپنی اور بچوں کی خیریت کا تار بھیجتی رہنا۔''

''اور تم بھی اپنا خیال رکھنا۔'' پاروتی نے اٹھتے ہوئے کہا۔''دھوپ میں شوٹنگ کرو تو ہیٹ برابر سر پر رکھنا اور لیمو کا شربت پیتے رہنا۔ایسا نہ ہو کہ لُو لگ جائے۔'' پھر ایک پیار سے زیادہ ماںتا

بھرے انداز میں دیپ کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ہلکے سے اس کے گال کو تھپکی دی اور دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی۔ اور دیپ کو ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بچہ ماں سے پہلی بار جدا ہو کر دور دراز کے سفر پر جا رہا ہو۔ اور اس نے سوچا: ''پارو کے بغیر اتنے دن تک میرا گزارا کیسے ہوگا؟''

گاڑی پلیٹ فارم سے نکل گئی اور ساری بھیڑ باہر جانے لگی تو ایک لڑکی نے پاروتی سے پوچھا: ''کیوں جی! آپ تو دیپ کمار سے بڑی دیر سے باتیں کر رہی تھیں، آپ ان کی کیا لگتی ہیں؟''

''جو آپ لگتی ہیں۔'' پاروتی نے ہنس کر جواب دیا۔ ''میں بھی ان کی فین ہوں اور ان کے آرٹ کی قدردان ہوں۔ سو آٹو گراف لینے کے لیے آئی تھی۔''

گاڑی بمبئی کے مضافات سے گزر رہی تھی۔ سٹیشنوں کی روشنیاں اس طرح دوڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں جیسے مشعلیں ہاتھ میں لیے کوئی غیر انسانی فوج شکست کھا کر بھاگ رہی ہو۔ مہالکشمی، لوئر پریل، الفنسٹن برج...... اسٹیشن کے بعد اسٹیشن......

پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی بمبئی سے دہلی کی طرف دوڑ رہی تھی اور دیپ کا تخیل اسی رفتار سے الٹی سمت میں دوڑ رہا تھا۔

دادر...... ماٹنگا روڈ، ماہم۔ باندرہ۔

انیس سو پچپن، انیس سو چون، انیس سو ترپن، انیس سو باون

کھار، سینٹا کروز، ولے پارلے، اندھیری۔

آٹھ برس ہوئے وہ پہلی بار دہلی سے بمبئی آیا تھا۔

مگر اس وقت اس کا نام دیپ کمار نہیں تھا۔ سورج نرائن ماتھر تھا۔ اس وقت اس نے ایئر کنڈیشنڈ کوپے میں سفر نہیں کیا تھا۔ تھرڈ کلاس میں آیا تھا۔ اس وقت اس کے پاس شارک سکن کے سوٹوں اور سلک کی قمیصوں سے بھرے ہوئے تین سوٹ کیس نہیں تھے۔ صرف ایک ٹین کا صندوق تھا جس میں دو پتلون، ایک کوٹ چار قمیص تھیں اور گھر کے بنے ہوئے ستوؤں کی ایک تھیلی۔ جب بھی بھوک لگتی وہ ستوؤں کو پانی میں گھول کر پی لیتا۔

گاڑی پالگھر کے اسٹیشن پر ٹھہری اور ڈائننگ کار کے ویٹر نے آ کر کہا:

''ڈنر کا ٹائم ہوگیا ہے سرکار۔''

''دس وے سر'' ڈائننگ کار کے منیجر نے خود اس کا استقبال کیا اور کھڑکی کے قریب کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے اسٹاف کے لوگوں میں سے جو سیکنڈ کلاس والے تھے، وہ بھی آ گئے تھے۔ مگر دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''کیوں الکارانی کھانا نہیں کھائیں گی؟'' دیپ نے کیمرہ مین بھاسکر سے پوچھا۔

''جی نہیں، وہ اور جولیا تو رمی کھیل رہی ہیں۔ اپنے کمپارٹمنٹ میں کھانا منگوایا ہے۔''

دیپ نے سوچا چلو اچھا ہی ہے۔ دونوں یہاں آتیں تو بک بک کر کے میرا دماغ چاٹ جاتیں۔ اور آج کی رات نہ جانے کیوں وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔

''کیا کھائیں گے سرکار؟'' ویٹر نے مینو کارڈ پیش کرتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

کھانے کا آرڈر دیتے ہوئے دیپ نے دیکھا کہ باقی میزوں پر جتنے لوگ بیٹھے تھے، ان سب کی نگاہیں اس پر ہیں۔ دو پارسی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر آپس میں کھسر پسر کر رہی تھیں۔ ایک نوجوان رشک بھری نگاہوں سے دیپ کو گھور رہا تھا۔ جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو: ''اُف! کتنا خوش قسمت ہے یہ دیپ کمار۔ کاش میں بھی ایسا ہی مشہور فلم اسٹار بن سکتا۔'' ٹکٹ چیکر اور سب مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے کے بعد اس کی میز کی طرف آیا، مگر دیپ کمار کا ٹکٹ دیکھنے کے بجائے اپنی نوٹ بک اس کے سامنے کر دی: ''اس پر آٹوگراف کر دیجیے۔ میری بیٹی آپ کی فلموں کو بہت پسند کرتی ہے۔'' اور ٹرین کی رفتار کے ساتھ دیپ کی یاد ماضی کی طرف جانے لگی جب وہ تھرڈ کلاس میں دہلی سے بمبئی آ رہا تھا اور اس نے ڈائننگ کار میں آ کر کھانا آرڈر کر دیا تھا۔

''ٹکٹ پلیز؟'' ٹکٹ چیکر نے کہا اور جب دیپ کمار نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ دکھایا تو اس نے کرخت لہجے میں ڈانٹا: ''چلو باہر — ڈائننگ کار صرف فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے لیے ہے۔ کم آن گیٹ آؤٹ۔''

کتنے برس گذر گئے تھے اس واقعے کو۔ آٹھ برس؟ آٹھ سو برس؟ آٹھ ہزار برس؟

ان آٹھ برسوں میں دنیا کتنی بدل گئی تھی۔ سورج نرائن ماتھر کتنا بدل گیا تھا۔ بے خیالی سے وہ کھانا کھاتا رہا اور ڈائننگ کار کی چوڑی کھڑکی کے شیشے میں سے وہ چاندنی میں چمکتے ہوئے پیڑوں، جھونپڑوں اور کھیتوں کو پیچھے کی طرف دوڑتا ہوا دیکھتا رہا۔ مگر کچھ دیر بعد اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کی کھڑکی کے شیشے پر خود اس کی زندگی کے گذشتہ مناظر ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے

ہیں۔جیسے سینما کے پردے پر فلم کے سین نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۸— جب ہندستان فلم اسٹوڈیو سے اسے دھکے مار کر باہر نکالا گیا تھا کیونکہ وہ دربان کی نظر بچا کر شوٹنگ دیکھنے اسٹوڈیو کے اندر گھس گیا تھا اور اس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے اور اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس نے دو وقت سے کھانا نہیں کھایا تھا اور اس کے گالوں میں گڈھے پڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے کیونکہ اسے اب تک فٹ پاتھ کے پتھریلے فرش پر ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی تھی اور اس لیے کہ وہ مستقبل کا مشہور ایکٹر نہیں بلکہ غنڈہ، آوارہ لگتا تھا۔

۱۹۴۹— جب وہ پاپولر شو مارٹ میں پچاس روپے مہینے پر نوکر تھا اور دن بھر لوگوں کے پیروں میں جوتے پہنا کر دکھاتا تھا۔ میلے پیر، بھدے پیر، کالے پیر، گورے، نازک اور سڈول پیر۔ ان دنوں خواب میں بھی اسے پیر ہی نظر آتے تھے اور ایک بار تو اس نے خواب دیکھا کہ لاکھوں پیروں کے نیچے اسے روندا جارہا ہے اور اس کا دم گھٹ کر نکلنے ہی والا ہے۔ مگر اسی دن اسے جوتوں کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا تھا۔ جب دوکان پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور اس کے مالک نے فون پر درجنوں بار ''جی جناب!''، ''جی جناب!'' کر کے دیپ (جو اس وقت سورج ہی کہلاتا تھا) سے کہا: ''دیکھو! چار نمبر کے لیڈیز سینڈلوں کے جتنے اچھے اچھے اور بڑھیا نمونے ہیں سب لے کر آئیڈیل اسٹوڈیو میں مس رادھا رانی کے پاس لے جاؤ۔ ان کو اپنی نئی فلم کے لیے جوتے خریدنے ہیں۔ مگر صورت ٹھیک کر کے جانا۔ تمھاری قمیض پھٹی ہوئی ہے۔'' اور اس نے دوکان کے پیچھے کی کوٹھری میں جا کر جہاں وہ اپنے کپڑے رکھتا تھا، اپنی اکلوتی اچھی قمیص پہنی، پتلون پر استری کی، بالوں میں تیل ڈال کر کنگھا کیا اور جاتے جاتے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔

دُبلا وہ ضرور تھا، مگر اس کی شکل بُری نہیں تھی۔ کتنے ہی ہیروؤں سے اچھی تھی۔ غرض وہ چودہ ڈبے چھوٹی ٹیکسی میں ڈال کر آئیڈیل اسٹوڈیو پہنچا اور کیونکہ وہ ٹیکسی میں سوار تھا اس لیے اسٹوڈیو کے دروازے کھول دیے گئے اور چونکہ وہ پاپولر شو مارٹ کا کارڈ لے کر مس رادھا رانی کو جوتوں کی ٹرائی دینے آیا تھا اور صورت سے غنڈا موالی نہیں لگتا تھا اس لیے اسے دھکے مار کر باہر نہیں نکالا گیا بلکہ فوراً مس رادھا رانی کے پاس پہنچا دیا گیا۔

''میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گی۔ آپ دیکھتے نہیں کہ وہ بالکل گنجا ہو گیا ہے۔'' رادھا رانی ڈائرکٹر ڈیسائی کو ڈانٹ رہی تھی۔ جب دیپ (جو ابھی تک سورج ہی

کہلاتا تھا) وہاں پہنچا۔

''میڈم — میں پاپولر شو مارٹ سے آیا ہوں۔'' مگر ایک لمحے کے لیے رادھا رانی نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے اسے گھورتی رہی پھر بولی: ''اچھا جوتے دکھاؤ۔ کوئی اچھا نمونہ بھی ہے؟''

دیپ ڈبّوں میں سے سینڈل نکال نکال کر دکھاتا رہا۔ اور رادھا رانی اور ڈیسائی میں ہیرو کے انتخاب کے سلسلے میں بحث چلتی رہی۔ کوئی گنجا تو کوئی موٹا تو کوئی ضرورت سے زیادہ لمبا، تو کوئی ضرورت سے زیادہ چھوٹا۔ جو ہیرو اسے پسند تھے وہ (بقول ڈائرکٹر ڈیسائی کے) یا بہت پکچروں میں مصروف تھے یا روپے بہت مانگتے تھے۔

''اس سے تو اچھا ہے کہ آپ کوئی نیا لڑکا ٹرائی کریں۔'' رادھا رانی تنگ آ کر بولی۔

''مگر کام کا یہاں لڑکا ملتا کہاں ہے؟ تم تو اس طرح کہتی ہو نیا لڑکا ٹرائی کرو جیسے لڑکا نہ ہوا جوتا ہوا۔''

''ہاں تو فرق بھی کیا ہے۔ جوتے اور ہیرو جب پرانے ہوتے ہیں پھینک دیے جاتے ہیں۔ ان کے بجائے۔ نئے جوتے اور نئے ہیرو ٹرائی...... ہاں یہ سینڈل مجھے فٹ ہے۔'' یہ الفاظ اس نے دیپ سے کہے جو رادھا رانی کے پیروں میں بیٹھا ایک جوتے کے بعد دوسرا پہنا رہا تھا۔

اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں رادھا رانی اور ڈیسائی کے درمیان نہ جانے کیا اشارے ہوئے کہ اپنے سینڈل کا بل وصول کرنے جب وہ ڈائرکٹر کے کمرے میں پہنچا تو ڈیسائی نے چھوٹتے ہی پوچھا: ''کیوں مسٹر! فلم میں کام کرو گے؟'' اور سورج کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ سوائے ''جی۔ جی۔ جی — ایک گلاس پانی۔''

۱۹۵۰ء — جب وہ سورج نرائن ماتھر سے دیپ کمار بن چکا تھا اور اس کے پاس سات فلموں کے کنٹراکٹ تھے اور اس کے بینک کے لاکر (Locker) میں سوا لاکھ روپیہ ''بلیک'' تھا اور جب ایک شام وہ اپنی بیوک میں بیٹھ کر معاہدوں کے بارے میں قانونی مشورہ کرنے مالا بار ہل پر اپنے سالیسٹر مسٹر کیکا چند پریم چند کے گھر گیا تھا، گو وہ خود بھی اس وقت ورلی پر تین سو روپے مہینے کی فلیٹ میں رہتا تھا۔ لیکن اتنا عالیشان اور خوبصورت مکان اس نے کبھی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی اونچی الماریاں، دنیا کے مصوروں کی شاہکار تصویریں، قیمتی قالین، خوبصورت دبیز پردے، بڑھیا اور آرام دہ فرنیچر، صوفے، دیوان، کشن، کاٹھیاواڑی کام کی

پیڑھیاں، کالنی کے پرانے بُت، ہر چیز مالکِ مکان کی خوش مذاقی کا اعلان کرتی تھی۔ پھر ڈرائنگ روم کی دیوار پر لمبی کھڑکی میں سمندر کا خوش نما منظر۔ اور کام کی باتیں ختم کرنے کے بعد جب سالیسٹر پریم چند نے دیپ کا تعارف اپنی بیٹی پاروتی سے کرایا جو اسی سال ایم اے کا امتحان دے رہی تھی، تو دیپ کو ایسا لگا کہ اس گھر کا سارا حسن اور خوش مذاقی اس نازک خوبصورت اور ذہین لڑکی میں سمٹ آیا ہے جو کچن میں جا کر اپنے ہاتھوں سے پکوڑے بھی تل سکتی ہے، ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر بڑے سلیقے سے چائے انڈیل سکتی ہے اور ساتھ ساتھ بائیرن کی شاعری اور گوئٹے کے ڈراموں کے بارے میں علمی بحث بھی کر سکتی ہے اور دیپ جس نے نہ کبھی ایسا گھر دیکھا تھا، نہ کسی ایسی لڑکی سے ملا تھا یہ سوچتا ہوا رخصت ہوا کہ میری ساری دولت اور شہرت کس کام کی اگر پاروتی جیسی بیوی نہ ملے۔

۱۹۵۱ء— جب بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی پاروتی سے ہوئی اور اس کی اپنی کمپنی دیپ کمار پروڈکشنز کا افتتاح ہوا۔

۱۹۵۲ء— جب ان کا پہلا بچہ پیدا ہوا جس کا نام جگدیپ رکھا گیا (مگر جسے پاروتی جونیر کے نام سے پکارتی تھی۔ اور جب دیپ پروڈکشنز کی فلم ''آسمانی چوڑیاں'' کی سلور جوبلی ہوئی، کمپنی کو سات لاکھ کا منافع ہوا جس سے دیپ نے اپنا اسٹوڈیو بنوانا شروع کیا اور ان کی دوسری اولاد ایک بچی ہوئی جس کا نام جمنا رکھا گیا مگر جسے ماں باپ پیار سے جمو کہنے لگے۔ اسی سال کے آخر میں دیپ اور پاروتی کا پہلا جھگڑا ہوا، جب پاروتی نے دیپ کی نئی فلم ''ہائے میرے بالم'' دیکھی اور دیپ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے کہا: ''میری پسند ناپسند کا کیا سوال ہے۔ پبلک تو پسند کرتی ہے نا۔ سلور جوبلی تو ضرور ہو گی نا؟ بس تو پھر کافی ہے۔'' اور دیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی کامیابی کے شربت میں کسی نے کونین گھول دی ہے۔

۱۹۵۳ء— جب دیپ کی فلم ''ہائے مورے بالم'' کی گولڈن جوبلی ہوئی اور اس نے جوہو پر ایک بنگلہ خریدا اور پچاس ہزار اس کے فرنیچر اور بیس ہزار باغ اور لان لگانے پر خرچ کر دیے۔

۱۹۵۴ء— جب دیپ کمار پروڈکشنز کی فلم ''چال نمبر بارہ'' جو ایک بڑے شہر میں غریبوں کی زندگی سے متعلق تھی، فیل ہو گئی اور پھر دیپ کمار کے باغ کے پھولوں کو فلاور شو میں اول انعام ملا۔ جونیئر پہلی بار اسکول گیا اور جمو نے ''پاپا'' ''ممی'' کہنا شروع کیا۔ دیپ نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ حاصل کر کے شراب کا پرمٹ بنوایا۔

۱۹۵۵ء— جب ''آوارہ شہزادہ'' نے کئی برس کے ریکارڈ توڑ دیے تو دیپ کمار کو اتنا فائدہ

ہونے کا خطرہ ہوا کہ اس کے آڈیٹر نے مشورہ دیا کہ وہ ٹیکس سے بچنے کے لیے فوراً ایک فلم ایسی شروع کرے جس میں نقصان دکھایا جا سکے اور ''نیا ہندستان'' کا مہورت ہوا۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ کسی چھوٹے سے اندھیرے اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور مسافر ڈائننگ کار سے اپنے ڈبوں کی طرف چلے۔ دیپ کمار نے ویٹر سے کہا: ''دو سوڈے کی بوتلیں دے دے'' اور پھر اپنے کوپے کا دروازہ بند کیا۔ سوٹ کیس میں سے وہسکی کی بوتل نکالی اور گلاس میں ایک پیگ انڈیلا۔ پھر اس نے تین تصویروں کا ایک تہہ ہونے والا چمڑے کا فریم نکالا جو سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک طرف جونیئر، دوسری طرف جمو، بیچ میں پاروتی کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر۔

''ویل پارو! ہیر از ٹو یو۔'' اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ پانچویں پیگ کے بعد اس نے پاروتی کی تصویر کو غور سے دیکھا اور بڑبڑایا: ''تم مجھ پر ہنستی کیوں ہو پارو؟ میرا انداق اڑاتی ہو۔ اس لیے کہ میرا باپ غریب تھا۔ اور تمھارا باپ امیر! یا اس لیے کہ تم کلاسیکی موسیقی اور بھارت ناٹیم اور روسی بیلے اور اٹالین فلموں کو پسند کرتی ہو اور میں ''آوارہ شہزادہ'' جیسی گھٹیا فلمیں بنا کر روپے کماتا ہوں؟ کیوں یہی بات ہے نا؟''

ساتویں پیگ کے بعد اس نے گلابی آنکھوں سے پاروتی کی تصویر کو گھورا۔ ''ساری دنیا میری عزت کرتی ہے۔ لاکھوں میرے کام کو سراہتے ہیں۔ میری تعریف کرتے ہیں۔ میں جہاں جاتا ہوں چاہنے والوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ تین ہزار خط ہر مہینے میرے پاس آتے ہیں۔ اتنی Fan Mail کسی اسٹار کی بھی نہیں ہے مگر تم میری عزت نہیں کرتیں پارو۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو مگر جیسے ماں اپنے بیوقوف بچّے سے کرتی ہے۔ مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے پارو۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے اپنے برابر کا سمجھو۔ میری عزت کرو۔''

اور نویں پیگ کے بعد اس نے پھر پاروتی کی تصویر کو مخاطب کیا: ''تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟ پارو! مانا کہ تم حسین ہو، پڑھی لکھی ہو، امیر ماں باپ کی بیٹی ہو۔ مگر دنیا میں ہزاروں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ سمجھیں پارو!...... نہیں سمجھیں تو میں تمھیں سمجھاؤں گا۔ پھر ہنس رہی ہو۔ مت ہنسو...... پارو مت ہنسو...... مت ہنسو۔''

مگر اس کی مدہوش آواز کی گونج کوپے ہی میں کھو کر رہ گئی۔ اور جب وہ نشے سے چور ہو کر سو گیا، پارو کی تصویر اسی طرح طنز اور تمسخر اور رحم کے انداز میں مسکراتی رہی۔

....

ٹریکٹر کے اسٹیرنگ وہیل کو سنبھالے رمیش اپنے پیروں تلے موٹر کی دھڑ دھڑاہٹ کو محسوس کررہا تھا۔ جب کبھی وہ ٹریکٹر چلاتا تھا اس کے تن بدن میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ جاتی تھی۔ اس کا دل ایک عجب احساسِ فتح سے بھر جاتا اور اسے لگتا کہ وہ ایک ماڈل فارم کا ڈائرکٹر نہیں ایک فوج کا سپہ سالار ہے جو یلغار کرتی ہوئی دشمنوں کو پسپا کرتی چلی جارہی ہے۔ اور یہ ٹریکٹر نہیں جس پر وہ سوار ہے بلکہ نپولین کا جنگی گھوڑا ہے۔ ہٹلر کا ٹینک ہے...... نہیں ہٹلر کے ٹینک تو روس کی توپوں کے سامنے بری طرح مار کھا گئے تھے۔ مگر اس ٹریکٹر اور اس کے پیچھے لگے ہوئے ہارویسٹر کی کلدار اور تیز درانتیوں کے سامنے اونچے سے اونچا گیہوں کا بڑے سے بڑا کھیت بھی ہیچ ہے۔

ہارویسٹر کمبائن پکی ہوئی فصلوں کو اس طرح کاٹ رہا تھا جیسے سر کے گھنے بالوں میں باربر کی مشین چلتی ہے۔ اس تشبیہ کو سوچ کر رمیش آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ واقعی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ایسا ہی معلوم ہوا تھا جیسے کھیت کی حجامت ہوتی جارہی ہے۔ مگر یہ تشبیہ بھی کس قدر غیر شاعرانہ ہے۔ کوئی خوبصورت تشبیہ سوچنی چاہیے۔ کرشن چندر نے کسان کی درانتی کو ادیب کے قلم اور آرٹسٹ کے برش سے تشبیہ دی تھی۔ اس لیے کہ اسی درانتی سے کسان زمین کے کینوس پر کیسی کیسی تخلیقی گلکاریاں کرتا ہے۔ کیسے کیسے شاہکاروں کو ترتیب دیتا ہے۔ اگر درانتی پرانے زمانے کے کسان کا قلم تھی۔ رمیش نے سوچا تو ہارویسٹر کمبائن آج کے کسان کا ٹائپ رائٹر ہے جس پر کھٹا کھٹ نئے انسان کی کہانی لکھی جارہی ہے۔ نہیں یہ تشبیہ بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ رمیش نے سوچا کاش! وہ ادیب ہوتا۔ آرٹسٹ ہوتا کہ اس عجیب اور خوبصورت اور سرور انگیز جذبے کا اظہار کرسکتا جو اس وقت وہ محسوس کررہا تھا۔ جو ہر بار وہ محسوس کرتا تھا۔ جب بھی کبھی فارم پر وہ کسی مشین سے کام کرتا ہر بار وہ سوچتا دس سال پہلے اتنے بڑے کھیت کی فصل کاٹنے کے لیے سیکڑوں کسانوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو کم سے کم دس دن لگتے اور اب چند ہی گھنٹوں میں وہ سارا کام ایک ٹریکٹر اور ایک کمبائن سے ہوسکتا ہے۔ اور اسے لگتا جیسے انقلاب وہ نہیں تھا جو سیاست دانوں نے اپنی دھواں دھار تقریروں سے برپا کیا بلکہ انقلاب یہ ہے جو اس کی فارم کی مشینیں کررہی ہیں جو ملک کی زراعتی پیداواریں بڑھا رہی ہیں۔ جو ہندوستان کے دیہات کا نقشہ بدل رہی ہیں۔ سامنے دوسرا ٹریکٹر گنگوا چلا رہا تھا۔ اٹھارہ برس کا کسان چھوکرا جس کے باپ دادا سیکڑوں برسوں سے زمینداروں کی زمینیں بوتے، زمینداروں کی فصلیں کاٹتے اور خود آدھے پیٹ بھوکے رہتے آئے تھے۔ جنھوں نے کبھی ہل اور درانتی کے علاوہ دوسرا اوزار نہیں دیکھا تھا۔ جو کبھی ریل میں بیٹھ کر بریلی شہر

بھی نہیں گئے تھے۔ انھیں کی اولاد گنگوا آج اس فارم کا بہترین ٹریکٹر ڈرائیور ہے۔ ہندی میں لکھ پڑھ سکتا ہے۔ رمیش کی طرح خالی نیکر اور قمیص اور ہیٹ پہنتا ہے۔ اس کا بوڑھا باپ اب بھی برسوں کی عادت سے مجبور ہو کر زمیندار کی اولاد سے اور ہر سرکاری افسر سے ہجور کر کے بات کرتا ہے۔ مگر گنگوا کا مزاج بدل چکا ہے۔ وہ ٹریکٹر چلانا سیکھنے کے لیے بھوپال سفر کر آیا ہے۔ وہ صبح کو ہندی کا اخبار پڑھتا ہے۔ رات کو ریڈیو سنتا ہے۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار بریلی جا کر سنیما دیکھتا ہے اور نہ کبھی کسی کے سامنے گڑ گڑاتا ہے، نہ ہجور ہجور کرتا ہے۔ اور رمیش نے سوچا میں مصور ہوتا تو گنگوا کی بڑی خوبصورت تصویر بناتا اور اس کے نیچے لکھ دیتا ''ہندوستان کا نیا کسان'' پسینے میں نہایا ہوا، سیاہ گٹھا ہوا بدن، ٹریکٹر کے پہیے کو سنبھالے ہوئے آہنی ہاتھ، مضبوط ٹھوڑی اوپر کو اٹھی ہوئی اور بے خوف اور نظر آسمان پر......

سامنے آسمان پر افق کی طرح بھورے بھورے بادل اُٹھ رہے تھے۔ کیا خوبصورت منظر تھا۔ حد نظر تک لہلہاتے ہوئے کھیت، گیہوں کی سنہری بالیں، دھوپ میں چمکتی ہوئی۔ شمال کی طرف آم کے پیڑوں کے جھنڈ، ان کے سامنے دور پہاڑیوں کی دھندلی قطار دھیرے دھیرے گھیرے سیاہ بادلوں کے پردے میں چھپتی جا رہی تھی۔ رمیش نے سوچا اس سے بڑھ کر حسین منظر دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اور نہ ٹریکٹر کی گڑگڑاہٹ سے پیارا کوئی سنگیت ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس مشینی سنگیت میں طاقت ہے، آہنی آہنگ ہے، نئی زندگی کا پیغام ہے۔

''کٹ!''

فضا میں ایک مبہم سی آواز گونجی۔ مگر رمیش کے سلسلۂ خیالات پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک سیٹی بجی مگر رمیش کو اپنی زندگی سے اس سیٹی کا کوئی تعلق معلوم نہ ہوا۔ وہ ٹریکٹر چلاتا رہا۔ کمبائن کی چرخی گھومتی رہی۔ اس کی کلدار درانتیاں فصل کاٹتی رہیں۔ سامنے آسمان پر بادلوں کے رنگین نقش بنتے رہے۔ گیہوں کی بالیوں پر سورج کی آخری کرنیں ناچتی رہیں۔ ''کٹ! کٹ'' کسی دوسری دنیا سے آواز آئی۔ سیٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ مگر رمیش کا ہاتھ ٹریکٹر کے بریک پر نہیں گیا۔ فاتحانہ شان سے نپولین کا گھوڑا دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا......

''ٹریکٹر ٹھہراؤ!''

اس کے بالکل قریب آ کر کوئی چلایا تو رمیش نے گھوم کر دیکھا کہ دیپ کمار کا اسسٹنٹ ہے اور اس کے پیچھے پیچھے ہانپتا کانپتا فصل پر پھسلتا، گرتا دیپ کمار بھاگا آ رہا ہے۔ اب رمیش نے

بریک لگا کر ٹریکٹر روکا اور انجن بند ہوتے ہی اس کے خیالات کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔

''ارے بھائی! کیا کرتے ہو؟ شاٹ بالکل خراب کر دیا۔ ادھر کے کھیت پر تو لائٹ ہی نہیں ہے۔ پھر کٹ کر کے ہمیں مڈ شاٹ میں جانا تھا۔''

اب رمیش کو یاد آیا کہ وہ فصل ہی نہیں کاٹ رہا ہے، دیپ کی فلم ''نیا ہندستان'' کے ایک شارٹ میں حصہ لے رہا ہے۔ کیونکہ دیپ خود ٹریکٹر نہیں چلا سکتا تھا اس لیے اس نے رمیش سے درخواست کی تھی لانگ شارٹ میں وہ ٹریکٹر چلا دے۔ ان دونوں کا قد اور بدن تقریباً ایک سا ہی تھا۔ دیپ بھی رمیش کی طرح خاکی نیکر قمیض اور ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ دور سے پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون ہے۔ جب کیمرہ قریب آئے گا تو دیپ ٹریکٹر کو بریک لگا کر اترتے ہوئے دکھا دیا جائے گا۔

''تھینک یو رمیش!'' دیپ نے ٹریکٹر پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ ''ذرا یہ تو بتاؤ بریک کیسے لگاتے ہیں؟''

رمیش نے اسے سب کل پُرزے سمجھا دیے اور نیچے اتر آیا۔ کیمرہ مین کیمرہ لگا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دیپ کے آرٹسٹوں اور اسسٹنٹوں کی بھیڑ تھی۔ اور ان ہی میں اوشا بھی کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔

''کہو اوشا! اب تو میں بھی فلم اسٹار ہو گیا نا؟'' رمیش نے پسینہ پوچھتے ہوئے بیوی سے کہا۔

''ہیں! کیا کہا؟'' اوشا کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس کی نگاہیں دیپ پر جمی ہوئی تھیں۔

''کچھ نہیں! تم شوٹنگ دیکھو۔ میں گھر جاتا ہوں۔ ریڈیو پر موسم کی خبریں سننی ہیں۔'' اور وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ اگلا شارٹ شروع ہو گیا۔ گنگوا نے آکر ٹریکٹر کو ایک بار پھر اسٹارٹ کیا۔ دیپ نے چند گز چلایا۔ پھر جیسے ہی پلے بیک پر لتا منگیشکر کی ریکارڈ کی ہوئی تان...... ''او......او......جی......ہو'' سنائی دی، دیپ نے مڑ کر دیکھا۔ مسکرا کر بریک لگایا اور ٹریکٹر سے کود کر بائیں جانب بھاگا۔ کیمرہ نے گھوم کر اس کو فوکس میں رکھا۔ کھیتی میں سے اکارانی نمودار ہوئی۔ ریشمی گھاگرا چولی اور کریپ کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے۔ لتا منگیشکر کی آواز میں تان لگاتی ہوئی ''او۔ او......و......و......اجی......ہو......'' دیپ نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ کھیت میں چھپ گئی۔ دیپ نے لپک کر اسے کلائی سے پکڑ ہی لیا۔ پلے بیک پر لتا منگیشکر چلائی: ''چھوڑو۔ چھوڑو جی موری کلیا......'' مگر اکارانی ساتھ ساتھ ہونٹ ہلانا بھول گئی اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلاّیا: ''کٹ کٹ'' دیپ نے گھڑی دیکھی۔ کیمرہ مین نے آسمان کی طرف دیکھا اور دیپ نے اعلان

کر دیا: ''شوٹنگ پیک اپ'' الکارانی اپنی نقلی چوٹی جولیا کی طرف پھینکتے ہوئے چلائی: ''کم آن ڈارلنگ! چل کر ٹھنڈے پانی سے نہائیں۔'' دوسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے اس کو سینڈل پہنائی اور وہ جولیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیروں میں پڑی ہوئی پائل کو چھنکارتی ہوئی چل دی......

''کہیے اوشا جی! آپ چلتی ہیں؟''

''چلیے۔''

کافی دور تک ان کو کھیتوں کے بیچ میں سے پگڈنڈی ہو کر جانا تھا۔

راستے میں اوشا نے کہا: ''دیپ جی! آپ اتنے بہت کام کیسے کر پاتے ہیں؟ ایکٹنگ، ڈائرکشن، پروڈکشن کی سارے ذمہ داریاں۔ میں تو سوچ سوچ کر حیران رہ جاتی ہوں۔''

دیپ نے اپنی مشہور مسکراہٹ کی نمائش کرتے ہوئے کہا: ''اس میں کمال کی کون سی بات ہے۔ اگر کوئی کام بھی اچھا نہ کیا جائے تو آدمی جتنے کام چاہے کر سکتا ہے۔''

''کیوں آپ مجھ سے تعریف کرانا چاہتے ہیں۔ سچ کہتی ہوں میں نے آج تک آپ کی ایک پکچر بھی مِس نہیں کی۔ اتنا اچھا کام کرتے ہیں آپ تو......''

نہ جانے کیوں اس وقت دیپ کو پاروتی کا خیال آیا اور اس نے سوچا کاش یہ الفاظ پاروتی کی زبان سے سنے ہوتے۔ مگر اوشا سے اس نے کہا: ''تو پھر بتایئے کہ میرے کام میں آپکو کیا بات اچھی لگتی ہے؟ ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی اور ایکٹر کی حیثیت سے بھی......''

چند لمحے سوچ کر اوشا بولی: ''میں بتاتی ہوں۔ ڈائرکٹر کی حیثیت سے ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کا درد آپ کے دل میں سمٹ آیا ہے۔ آپ زندگی کے جس رُخ کو بھی اپنی فلموں میں دکھاتے ہیں اس کے ساتھ آپ کی پوری ہمدردی جھلکتی ہے۔ ''چال نمبر بارہ'' میں آپ نے غریبوں کا حال دکھایا ہے۔ ''آوارہ شہزادہ'' میں جب شہزادہ ڈاکو کے بھیس میں امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں تقسیم کرتا ہے...... بڑا ہی پُر اثر ہے وہ سین۔ پھر گانے بھی تو غضب کے ہوتے ہیں آپ کی فلموں میں......

......ایکٹر کی حیثیت سے تو آپ کمال کرتے ہیں۔ جو پارٹ بھی کرتے ہیں، اس میں گھل مل جاتے ہیں۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کے رومینٹک سین غضب کے ہوتے ہیں۔ آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''

''کہیے کہیے۔ میں تو آپ کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔''

''ہمارے کالج کی سب ہی لڑکیاں یہ کہتی ہیں کہ جب کوئی لڑکی آپ کو اسکرین پر Love Scene کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خود آپ سے......'' اور شرم کے مارے اس کی زبان رک گئی۔

''محبت کا اظہار کر رہا ہوں۔ کیوں؟''

اوشا نے سر ہلا کر ہاں کہا۔ پھر چند منٹ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ اور شام کے حسین سناٹے میں اوشا کی قربت میں، حنا کے اس عطر میں جس کی خوشبو کی لپٹیں اوشا کے کپڑوں سے آ رہی تھیں اور ان الفاظ میں، جو ابھی اوشا نے اس کے بارے میں کہے تھے، دیپ کو ایک عجیب راحت، ایک عجیب تسکین محسوس ہوئی جو اسے کبھی پہلے نہ ہوئی تھی اور اسے ایسا لگا جیسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی محرومی آج دور ہوئی ہو۔

سگریٹ جلانے کے بہانے سے وہ رُکا۔ اوشا بھی رک گئی۔ سگریٹ جلاتے ہوئے دیپ نے اوشا کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اوشا نے نگاہیں جھکا لیں۔

ایک بار دیپ کا ہاتھ بے اختیار اوشا کی کمر کی طرف بڑھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔

''کہیے آپ کی زندگی یہاں کیسے گزرتی ہے؟'' پھر قدم بڑھاتے ہوئے دیپ نے سوال کیا۔

''ہماری بھی کیا زندگی ہے دیپ جی۔''

''اب یہ دیپ جی کا تکلف رہنے بھی دو اوشا۔ میرا نام صرف دیپ ہے۔''

''آپ تو نفسیات کے ماہر ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ماحول میں کیسی زندگی گزر سکتی ہے۔ نری بے مقصد، بے رنگ، بے مزہ زندگی ہے اپنی تو......''

''کوئی کام کیوں نہیں کرتیں آپ؟ آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔''

''پڑھی لکھی کیا ہوں۔ انٹر تک پڑھا تھا کہ شادی ہوگئی۔ ٹیچر ہونے کے لیے بھی گریجویٹ......مگر آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟ میرا مذاق اڑا رہے ہیں کیا......''

''نہیں نہیں۔ میں تو اس لیے ہنس رہا ہوں کہ میں بھی صرف انٹرمیڈیٹ تک پڑھا ہوں۔ پھر بھی دیکھیے کام کرتا ہی ہوں۔''

''مگر آپ تو فلم میں کام کرتے ہیں۔''

''تو آپ بھی فلم میں کام کرسکتی ہیں۔''

''جی......میں؟'' اور اوشا کو ایسا لگا جیسے دفعتہً فضا میں نقرئی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ جیسے گیہوں کے کھیت دفعتہً گلاب کے تختوں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔

''مگر مجھے کام کون دے گا دیپ جی؟''

''صرف دیپ کہو تو میں ہی کام دے سکتا ہوں اوشا۔''

''سچ دیپ!''

''ہاں! اوشا میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ فلم اسٹار بننے کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ خوبصورتی اور ذہانت۔ ہماری بہت سی فلم اسٹارز صرف خوبصورت ہیں بلکہ بعض تو اب خوبصورت بھی نہیں رہیں۔ جیسے ہماری الکارانی ہیں۔ جواب تک دس برس کی شہرت کے بھروسے پر چل رہی ہیں۔ مگر تم تو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو۔''

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟ دیکھیے یہ میری ساری زندگی کا سوال ہے۔''

''نہیں اوشا! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ مگر شاید مجھے ایسا کہنا نہیں چاہیے تھا۔ رمیش صاحب سنیں گے تو کیا کہیں گے؟''

''میں ان کی بیوی ہوں۔ لونڈی نہیں۔ اپنی بہتری کے لیے جو چاہے کرسکتی ہوں۔''

اور اس عرصے میں بنگلہ آ گیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور ریڈیو پر خبریں سنائی دے رہی تھیں۔ بنگلے کے برابر ہی چار خیموں کا کیمپ لگا ہوا تھا۔ ایک میں دیپ، دوسرے میں الکارانی اور جولیا، تیسرے میں کیمرہ مین اور اسسٹنٹ اور چوتھی چھولداری میں قلی اور دوسرے نوکر۔

اوشا نے دیپ کو بلند آواز سے رخصت کیا۔

''اچھا مسٹر دیپ! آپ چلیے، منہ ہاتھ دھوئیے۔ میں ابھی چائے بھجواتی ہوں۔''

''تھینک یو مسز رمیش۔ آپ کو ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔''

اوشا اندر کمرے میں چلی گئی جہاں رمیش ریڈیو کے قریب بیٹھا ہوا غور سے خبریں سن رہا تھا۔ دور سے بادلوں کی کڑک، گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک بجلی کی لہر آسمان کو چیر گئی۔ مگر اوشا کو کوئی گمان نہ گزرا کہ طوفان آنے والا ہے۔

'ریڈیو اناؤنسر کہہ رہا تھا کہ کیندریہ سرکار کے کھادیہ وبھاگ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس برس ہندوستان میں اور سب سالوں سے زیادہ غلہ پیدا ہوا ہے۔ گیہوں کی جو فصل اب پک کر کٹائی کے لیے تیار ہے، اگر بارش سے پہلے ہی کٹ گئی تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس برس اکال کا

کوئی ڈر نہیں رہے گا۔''

''سنا تم نے اوشا!'' رمیش نے بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا؛ کٹائی کرنے میں ہمارا فارم تو سب سے آگے ہے۔ ان فلم والوں نے بار بار ٹریکٹر کو رُکوایا نہ ہوتا تو آج ہی ساری فصل کٹ جاتی۔ مجھے امید ہے کہ گیہوں کی پیداوار میں ہمارا فارم سب پر بازی لے جائے گا۔''

''فصل، ٹریکٹر، گیہوں، کٹائی۔ کیا ان کے علاوہ دنیا میں کوئی اور بات ہی نہیں رہ گئی ہے۔ کبھی میرا بھی خیال کیا کرو۔''

''کیوں کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ دن بھر دھوپ میں کھڑے کھڑے کہیں لُو تو نہیں لگ گئی ہے۔ نہ جانے ان فلم والوں کی بک بک سے کب نجات ملے گی؟''

اوشا کا جواب سن کر رمیش ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ایک دم وہ چلاّ کر بولی:

''وہ لوگ بالکل بک بک نہیں کر رہے۔ ایک اچھی فلم بنا رہے ہیں۔ بک بک تو کرتے ہو تم۔ ہر وقت بیج، کھاد، ملائی، نلائی۔ کوئی اور بات ہی نہیں رہی تمھارے لیے۔''

''ارے آج تمھیں کیا ہوا ہے اوشا؟'' رمیش نے حیران ہوکر پوچھا اور اسی وقت باہر اندھیرے آسمان میں بجلی اتنے زور سے کوندی کہ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور ایک لمحے بعد ایسی بھیانک کڑک سنائی دی کہ سارا گھر ہل گیا۔

''رمیش! میں بمبئ جا رہی ہوں۔''

چند لمحوں کے لیے رمیش اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ ''کیا کہا! بمبئ؟ مگر کیوں؟ کب؟''

اوشا نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ ''میں فلم میں کام کرنے کے لیے جا رہی ہوں۔ دیپ مسٹر دیپ نے مجھے آفر دیا ہے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ دیپ صاحب تمھیں بھی فلم اسٹار بنانا چاہتے ہیں۔ بھئی مبارک ہو۔ اب تم بھی الکارانی کی طرح ریشمی گھاگھرا چولی پہن کر ''چھوڑو جی موری کلیا گایا کرنا۔ مگر بھئی اپنی فلموں کے پریمیر پر ہمیں ضرور بلانا۔ پہلی فلم کون سی ہوگی؟ بمبئ میں بلّی یا بغدادی حور؟''

''رمیش''، بجلی کی کڑک کی طرح اوشا کی آواز گونجی۔ ''میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ اب میں یہاں رہتے رہتے تنگ آ گئی ہوں......''

''تنگ آگئی ہو؟ مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ زندگی میں گیہوں ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ گلاب کے پھولوں کی بھی کوئی اہمیت

ہے۔''

''تو تمھیں گلاب کے پودے چاہئیں۔ وہ تو میں......''

بات کاٹ کر چلائی: ''میں گلاب کی دو جھاڑیوں کا ذکر نہیں کر رہی ہوں، اپنی ساری زندگی کی بات کر رہی ہوں۔ تم نے اس فارم پر لا کر مجھے قید کر دیا ہے۔ نہ رہنے کو ڈھنگ کا مکان ہے، نہ پہننے کو ڈھنگ کے کپڑے، نہ کوئی ملنے جلنے والا، نہ سیر و تفریح۔ ہر طرف اجڈ گنوار، جنھیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ ہر طرف کھاد کی بو، ٹریکٹر کی گھر گھر............تم نے میری ساری زندگی کو بے کار، بے مقصد، بے مصرف بنا کر رکھ دیا ہے۔''

رمیش کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ مگر جب آتا تھا تو بہت زور سے۔ اوشا سے بھی اونچی آواز میں چلا کر بولا:

''تم اس زندگی کو بے مقصد کہتی ہو۔ تم اناج پیدا کرنے کو بکواس سمجھتی ہو۔ اگر یہی کسان جن کو تم اجڈ، گنوار کہتی ہو، کل کام کرنا بند کر دیں تو روٹی کہاں سے کھاؤ گی؟ کیا گلاب کے پھول سونگھ کر زندہ رہو گی؟''

بجلی ایک بار پھر زور سے کوندی۔ ایک لمحہ کے لیے سارا کمرہ چکا چوند کر دینے والی روشنی سے بھر گیا۔ ایک غیر قدرتی روشنی جیسے تھیٹر کے اسٹیج پر ہوتی ہے یا فلم اسٹوڈیو میں شوٹنگ کے وقت۔ اور اس لمحہ میں ایسا لگا جیسے رمیش اور اوشا جھگڑتے ہوئے میاں بیوی نہیں بلکہ کسی پرانے ڈھنگ کے ناٹک کے ہیرو ہیروئن ہیں جو کوئی بڑا ڈرامائی سین کر رہے ہیں۔ اگلے لمحے بجلی کا کوندا غائب ہو گیا اور ایسا زور کا تڑ کا ہوا کہ اوشا کے منہ سے بے اختیار ''اوئی'' نکل گیا۔

''کاشتاروں کے لیے ضروری اطلاع، کاشتکاروں کے لیے ضروری اطلاع'' ریڈیو کہہ رہا تھا۔

''اتر پردیش کے ترائی کے علاقے میں زبردست طوفان آندھی اور بارش آنے والی ہے۔ سب کاشتکاروں کو چاہیے کہ فصل کی کٹائی پوری کر کے اناج گوداموں میں رکھ دیں۔ ورنہ بارش کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ پہاڑی علاقوں کے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں بارہ انچ بارش ہوئی ہے۔ اس لیے ندیوں میں باڑھ آنے کا بھی خطرہ ہے۔ ندی کے کنارے والے علاقوں کو ہوشیار رہنا چاہیے۔''

''اوشا ہماری فصل!'' رمیش کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس لمحہ وہ اپنا اور اوشا کا سارا

جھگڑا بھول گیا۔ اس کے دماغ میں صرف ایک فکر، ایک دھن رہ گئی کسی طرح فصل کو بچانا چاہیے۔

برآمدے میں پیتل کا ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا۔ ایسے ہی موقع کے لیے۔ فارم پر کام کرنے والوں کو ہدایات تھیں کہ اس کے بجتے ہی ڈائرکٹر کے گھر پر جمع ہو جائیں۔ رمیش نے موگری لے کر گھنٹہ پیٹنا شروع کر دیا اور چند ہی لمحوں میں درجنوں آدمی دوڑتے ہوئے آ گئے۔

''گنگوا! سب آدمیوں کو جمع کرو۔'' رمیش اس طرح ہدایات دے رہا تھا جیسے جنگ سے پہلے کمانڈر اپنے افسروں کو احکامات دیتا ہے۔ ''جتنی کٹائی ہو کر کھیتوں میں پڑی ہے، اسے بارش ہونے سے پہلے فوراً گوداموں میں پہنچانا ہے۔ اور پچھلے کونے پر جو کھیت رہ گیا ہے، اس میں ابھی کٹائی کرنا باقی ہے۔ ایک ٹریکٹر اور کمبائن تم چلاؤ، ایک میں سنبھالتا ہوں۔ فارم پر جتنے مرد عورت بچے ہیں، سب سے کھو درانتیاں لے کر پل پڑیں۔ بارش ہونے سے پہلے پہلے سارا کھیت کٹ جانا چاہیے۔''

''بہت اچھا رمیش بابو، مگر......''

''مگر وگر کچھ نہیں گنگوا۔ یہ کام ہونا ہی چاہیے۔''

''اندھیرے میں کٹائی کیسے ہوگی حجور؟'' گنگوا کا بوڑھا باپ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

رمیش کو ایسا لگا جیسے جنگ سے پہلے کسی جرنیل کو معلوم ہو کہ اس کے سپاہیوں کے پاس گولی بارود نہیں ہے۔ اب دشمن کا مقابلہ کیسے کریں گے؟

چند لمحوں کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ مگر پھر پیچھے سے آواز آئی۔ ''اندھیرے کا انتظام میں کیے دیتا ہوں رمیش جی۔''

سب نے مُڑ کر دیکھا۔ دیپ کمار ایک شوخ رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''ہمارے جنریٹر اور آرک لیمپ کب کام آئیں گے۔''

رمیش کو ایسا محسوس ہوا جیسے نہتے لڑتے لڑتے اس کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی تلوار آ گئی ہو۔

''کتنے آرک لیمپ ہیں آپ کے پاس؟''

''آٹھ ہیں۔ جس کھیت میں کٹائی کرنی ہے، اس کے لیے کافی ہے اور پھر اس نے چلّا کر اپنے اسسٹنٹ سے کہا: ''اپنے آدمیوں سے کہو کہ جنریٹر اور آرک لیمپ سب اس کھیت کے کنارے لگا دیں۔ چلو جلدی کرو۔ ذرا بھی دیر نہ ہونی چاہیے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا ڈریسنگ گاؤن اتار پھینکا اور رمیش کے ساتھ کھیت کی طرف بھاگا۔ اوشا نے محسوس کیا کہ اس لمحے رمیش اور دیپ دونوں نے اس کی ہستی کو بھلا دیا ہے۔

اس غیر متوقع کمک کے پہنچتے ہی ہلّہ شروع ہو گیا۔ کھیت کے چاروں طرف آرک لیمپ روشن کرا دیے گئے۔ ٹریکٹروں نے کٹائی کا کام شروع کر دیا۔ سو سے زیادہ مرد، عورتیں، بچے درانتیاں لے کر فصل پر ٹوٹ پڑے۔ باقی لوگ کٹی ہوئی فصل کو اٹھا کر گوداموں کی طرف دوڑنے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادل اُمڈے ہی چلے آ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی اور تیزی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ بجلی بار بار چمک اور کڑک رہی تھی۔ بارش کسی بھی لمحے شروع ہو جائے گی۔ اور آندھی کٹی ہوئی فصل کو اُڑا کر تتر بتر کر دے گی۔ ہر آدمی، ہر عورت اور ہر بچے کے دماغ میں بس یہی دھن تھی کہ کس طرح بارش اور طوفان سے پہلے فصل کو بچا لیا جائے۔

رمیش ٹریکٹر کو اس طرح چلا رہا تھا جیسے وہ ٹریکٹر نہ ہو ٹینک ہو۔ وہ گیہوں کی فصل نہ کاٹ رہا ہو بلکہ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔ مگر گنگوا بے فکری سے اپنا ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ ایک دیہاتی گیت گنگناتا جا رہا تھا۔ آرک کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے ٹریکٹر کی سیدھ میں کھیا کی بیٹی گوری درانتی چلا رہی ہے۔ گوری جو دراصل سانولی تھی، مگر اس روشنی میں کتنی سندر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گوری جو بچپن میں گنگوا کے ساتھ کھیلتی تھی، مگر اب ایک دو برس سے اس سے شرمانے اور گھونگھٹ کرنے لگی تھی: ''او گوری! ہٹ جا سامنے سے۔ گنگوا مہاراج کی سواری آتی ہے۔'' وہ ہنس کر چلایا اور گوری میں بھی نہ جانے اس وقت کہاں سے ہمت آ گئی: ''ارے جاؤ جاؤ! اپنا رستہ لو۔ گوری کی درانتی تمھارے ٹریکٹر سے جیادہ پھسل کاٹ سکتی ہے۔''

کچھ ہی دور پر گنگوا کا باپ اپنے بوڑھے جھرّیاں پڑے ہاتھوں سے درانتی چلا رہا تھا۔

اس کے قریب گوری کے چھوٹے بھائی بہن منو اور رجّی چھوٹی چھوٹی درانتیاں لیے کام کر رہے تھے۔ اور کھیت کی مینڈھ پر کھڑی اوشا یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سب کام کر رہے ہیں اور وہ بیکار ہے۔

اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت کانپتے ہاتھوں سے درانتی چلا رہی ہے۔ شاید اس کی چندھی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اوشا نے سوچا: ''کہیں یہ بے چاری اپنا ہاتھ نہ کاٹ لے۔''

''لاؤ ماں جی! مجھے دو۔ تم آرام کرو۔'' اس نے بڑھیا سے درانتی کو چھینتے ہوئے کہا۔ مگر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کٹائی کا کام جو دیکھنے میں بہت ہی آسان معلوم ہوتا تھا اتنا آسان نہیں

ہے۔ زمین پر اُکڑوں بیٹھنے سے اس کی ٹانگیں اکڑ گئیں۔ اس کی ریشمی ساڑی، کانٹوں میں الجھ کر پھٹ گئی۔ گیہوں کی سخت بالیوں سے اس کے ہاتھوں اور بانہوں میں خراشیں پڑ گئیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے جڑیں پکڑ کر درانتی چلائی لیکن درانتی پھسل گئی۔ ایک ڈنٹھل بھی نہیں کٹا۔ ایک بار تو اس نے اپنا ہاتھ ہی کاٹ لیا۔ ''ہائے رام! میں بھی کتنی بیکار ہوں۔ اتنا کام بھی نہیں کر سکتی۔'' اس نے سوچا۔ اتنے میں گوری کی بہن رجّی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''کا کی! ایسے نہیں ایسے کاٹتے ہیں۔'' اس نے درانتی چلا کر دکھایا کہ اسے سیدھا نہیں کسی قدر ٹیڑھا کر کے چلاتے ہیں۔

''ہٹ جاؤ سامنے سے'' رمیش غصے سے چلّایا۔ اس نے دیکھا کہ عین اس کے ٹریکٹر کی سیدھ میں کوئی عورت فصل کاٹ رہی ہے۔

''کون......اوشا! تم؟''

''ہاں تو اور کیا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اتنا کام بھی نہیں کر سکتی۔''

''شاباش! بس اب تھوڑا سا کھیت رہ گیا ہے۔ ان عورتوں سے کہو کہ جتنی کٹائی ہوگئی ہے اسے اٹھا اٹھا کر گوداموں میں رکھیں اور ذرا جلدی۔ یہ دیکھو۔ بوندیں پڑنے لگی ہیں۔''

اوشا کے ہاتھوں پر جو زندگی میں پہلی بار جسمانی مشقت سے گرم اور چور ہو رہے تھے، بارش کی ایک بوند گری، اور وہ چلائی: ''ارے سب جلدی کرو، جلدی۔'' اس نے دیکھا کہ گوری کٹی ہوئی فصل کا ایک بہت بڑا گٹھا سر پر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور وہ فوراً اس کی مدد کو دوڑی۔

جیسے ہی بوندیں گرنی شروع ہوئیں ہر ایک کے کام میں تیزی آ گئی۔ درانتیاں زور سے چلنے لگیں۔ ٹریکٹروں کی گڑگڑاہٹ تیز ہوگئی۔ فصل ڈھونے والوں کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔

اور پھر فتح کا وہ لمحہ آیا جب رمیش نے کہا کہ کھیت کا آخری کونہ بھی اب اس کے ٹریکٹر کی زد میں آ گیا ہے۔ اب بوندا باندی باقاعدہ شروع ہوگئی تھی۔ ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ کٹی ہوئی فصل اڑنے لگی تھی۔ مگر کام کرنے والے ہوشیار تھے۔ انھوں نے گیہوں کی ایک بال کو بھی اڑ کر کھیت سے باہر نہ جانے دیا۔

''گنگوا! بس۔'' رمیش چلایا۔ ''ٹریکٹروں کو واپس لے چلو، نہیں تو بھیگ کر خراب ہو جائیں گے۔''

اسی دم بارش شروع ہوگئی اور سیٹی کے ساتھ دیپ کی آواز ہوا میں گونجی۔ ''کٹ'' رمیش نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا۔ دیپ کیمرے کے ادھر چھتری سنبھالے کھڑا تھا۔

''کیا تم نے اس سب کی فلم اتاری ہے؟'' رمیش نے کسی قدر چڑ کر کہا۔

''ہاں اور کیا۔ ایسا سین روز روز تھوڑا ہی ملتا ہے۔ کیا کلائمکس بنا ہے۔ مزا آ گیا۔''

اور رمیش نے سوچا: ''یہ فلم والے زندگی کو بس اپنے ہی زاویئے سے دیکھتے ہیں۔ ان کی بلا سے کوئی مرے کوئی جیے۔ اکال پڑے یا باڑھ آئے، فصل جل جائے یا بہہ جائے۔ یہ اپنے کیمرے چلاتے رہتے ہیں۔ اپنے فلمی کلائمکس ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

''مگر تمھارے فلم کے کلائمکس میں تو ہیرو ٹریکٹر چھوڑ کر گانا گاتا ہوا ہیروئن کے پیچھے بھاگتا ہے۔'' اس نے جل کر کہا۔

''وہ سب بدل گیا۔ اب کلائمکس یہی ہوگا۔''

اب موسلا دھار بارش گر رہی تھی۔ اوشا جس کی پھٹی ہوئی ساڑی شرابور ہو کر اس کے بدن سے چپک گئی تھی، دور سے چلائی: ''ارے بھئی بحث گھر چل کر کرنا۔ بھیگ کر نمونیہ کرنا ہے کیا؟''

''رمیش بابو! رمیش بابو!'' کوئی ندی کی طرف سے دوڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

''کیا ہے ماتادین؟''

اس سے پہلے کہ ماتادین کوئی جواب دے، ایک آرک لیمپ دھماکے کے ساتھ پھٹا۔ جلتے ہوئے بلب پر بارش کی بوند گر گئی اور یکلخت سارے کے سارے بلب فیوز ہو گئے۔ اندھیرے میں آواز آئی: ''رمیش بابو! ندی میں باڑھ آ گئی ہے۔''

رمیش نے ایسے خطرے کے لیے فارم پر ریت کے بورے بھروا کر رکھ دیے تھے۔ وہ چلایا: ''گنگوا! ماتادین! سب لوگوں کو ساتھ لو اور ریت کی بوریاں ندی کے کنارے پہنچاؤ۔ میں بھی وہیں جاتا ہوں۔'' بجلی چمکی تو اس نے دیکھا کہ اوشا اور دیپ وہیں کھڑے بھیگ رہے ہیں۔

''اوشا! تم گھر جاؤ۔ اور دیپ صاحب آپ بھی۔ اپنے لوگوں اور سامان کو خیموں سے نکال کر ہمارے گھر میں لے آیئے۔''

''یہ سب کام میرے آدمی دیکھ لیں گے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

اندھیرے کو مخاطب کر کے رمیش نے کہا اور اس کے انداز میں تلخی اور جلن تھی: ''یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ مسٹر دیپ! کوئی فلم کا سین نہیں لیا جا رہا۔''

جب وہ ندی کے کنارے پہنچا، جہاں بند توڑ کر پانی کا ایک تیز دھارا نشیب کی طرف بہہ رہا تھا، تو اس نے دیکھا کہ فارم کے سب لوگ جو تھوڑی دیر ہوئی درانتیاں چلا رہے تھے، اب ریت کی

بوریاں اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں۔ رمیش ان کو بند کے ٹوٹے ہوئے حصے میں ڈلوا رہا تھا: ''اِدھر نہیں اُدھر — ارے یہ بوری اُدھر رکھو۔'' بجلی کوندی تو اس نے دیکھا کہ بوریاں رکھوانے والوں میں دیپ بھی ہے۔ حیرت اور غصے سے وہ چلایا: ''مسٹر دیپ! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جایئے جایئے۔ آپ کو کچھ ہو جائے گا تو خواہ مخواہ الزام مجھ پر آئے گا۔''

مگر اسی دم ایک آدمی نے آ کر کہا: ''رمیش بابو! جلدی کیجیے۔ بند ایک اور جگہ سے ٹوٹ گیا ہے......

سو رات بھر اندھیرے میں یہ مہم جاری رہی۔ یہاں تک کہ سویرے کا دھندلکا ہو گیا۔، بارش کا زور بھی کسی قدر تھما۔ تھک کر رمیش اور دیپ دونوں ریت کی بوریوں پر بیٹھ گئے اور لوگ کام کر کے اپنے اپنے گھر جانے لگے تھے۔

''کہیے مسٹر دیپ کمار! آپ جیسے فنکار کو تو اس رات میں اپنے فلموں کے لیے بڑا مواد ملا ہوگا؟''

رقابت کی خلش اب تک دل میں چبھ رہی تھی۔

''اس میں کیا شک ہے۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ زندگی فلم سے بھی زیادہ دلچسپ اور ڈرامیٹک ہے۔''

''جی ہاں! آپ کو تو یہ سب بھی فلم کا سینیریو ہی معلوم ہوتا ہوگا۔ ہیرو اور ولن دونوں موجود ہیں۔'' اس نے دیپ کمار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ''صرف ہیروئن کی کمی ہے۔''

''تو لیجیے ہیروئن بھی آ پہنچی۔'' دیپ کمار نے جو کھیتوں کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا، ادھر اشارہ کیا۔ اور رمیش نے دیکھا، اس کی برساتی پہنے پایاب کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اوشا چلی آ رہی تھی۔ وہ قریب آئی تو انھوں نے دیکھا کہ اس کے کندھے پر تھرماس لٹکی ہوئی ہے اور ہاتھ میں بسکٹوں کا ڈبہ ہے۔

''آپ لوگوں کے لیے چائے لائی ہوں۔'' اس نے کہا: ''رات بھر بھیگے ہیں، کہیں سردی نہ لگ جائے۔''

وہ گلاس میں چائے انڈیل رہی تھی کہ ندی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دیپ کمار زور سے چھینکا۔

''پہلے انھیں دو۔ یہ بمبئی کے نازک لوگ ہیں۔ کہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔''

ایسے کچھوے لگانے میں رمیش کو ایک عجیب مزہ آرہا تھا۔

دونوں کو چائے دے کر اوشا کنارے کی طرف گئی جہاں سے بند ٹوٹا تھا۔ اس جگہ کو جھک کر دیکھنے لگی۔

''یہ سارا حصہ ٹوٹ گیا تھا کیا؟'' بڑی خیریت ہوئی کہ تم لوگ آ گئے۔ نہیں تو......''

اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ اس کے بھیگے ہوئے سینڈل کنارے کی چکنی مٹی پر پھسلے اور وہ ندی کے تیز رفتار دھارے میں جا پڑی۔

''اوشا!'' دیپ اور رمیش بے اختیار چلائے اور اس سے پہلے کہ رمیش کچھ کرے، دیپ کمار پانی میں کود گیا۔

رمیش جو تیراکی کا ماہر تھا، کچھ دور کنارے کنارے بہاؤ کے رُخ دوڑا پھر پانی میں کودا۔ اور کودتے ہی اسے معلوم ہوا کہ اوشا کو ہی نہیں دیپ کو بھی بچانا پڑے گا۔ اوشا کو رمیش نے تھوڑا بہت تیرنا سکھایا تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ صرف تیز بہاؤ کا ڈر تھا کہ کہیں سے کہیں نہ پہنچا دے۔ لیکن دیپ! اس کو تو ہاتھ پاؤں مارنا بھی نہ آتا تھا۔ ڈبکیوں پر ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ رمیش نے پہلے اسے سنبھالنا چاہا، مگر دیپ نے گھبرا کر رمیش کو اس بری طرح پکڑ لیا کہ اسے بھی نیچے لے بیٹھا۔ ایک ڈبکی کھا کر جب دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ پانی کے اوپر آئے تو تیرتے تیرتے اوشا یہ دیکھ کر چیخ پڑی کہ رمیش نے ایک زور کا گھونسہ دیپ کی کنپٹی پر رسید کیا اور وہ بے چارہ بے ہوش ہو کر اُلٹ گیا۔ مگر اسی دم رمیش نے اس کے گھونگر والے بال مضبوطی سے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیے اور اسی طرح سے گھسیٹتا ہوا داہنے ہاتھ سے تیرتا ہوا اوشا کے قریب پہنچا۔ تھک کر اور بوجھل برساتی میں الجھ کر وہ بھی ڈبکی کھانے ہی والی تھی کہ رمیش قریب پہنچ گیا، اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک زور کا جھٹکا مار کر برساتی کو اتار پھینکا۔ اوشا کی طرف داہنا ہاتھ بڑھا کے چلایا: ''میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لو اوشا اور کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کرو۔ مجھے اس بجر بٹو کو بھی سنبھالنا ہے۔''

جان کے خطرے کے باوجود بجر بٹو کا لفظ سن کر اور دیپ کمار کے بے ہوش چہرے کو دیکھ کر اوشا کو ہنسی آ گئی اور جب اس نے رمیش کے ٹریکٹر چلانے والے مضبوط ہاتھ کی گرفت اپنے ہاتھ پر محسوس کی تو اس کو ایسا لگا کہ طوفان تھم گیا ہے اور اب اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

گنگوا

دیپ کمار پروڈکشن والوں کو اسٹیشن چھوڑ کر رمیش اور اوشا جیپ میں واپس آ رہے تھے۔

''رمیش!''

''ہوں۔''

''مجھے معاف کر دیا تم نے؟''

''قصور تو میرا تھا اوشا۔''

''تمھارا؟''

''ہاں میرا۔گلاب کے پھول بھی زندگی میں اتنے ہی اہم ہیں جتنے گیہوں۔''

''پھر؟''

''پھر میں نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ فارم کے لوگوں کے لیے بھی ایک سنیما ہونا چاہیے۔ تا کہ ہم لوگ بھی دیپ کمار کی فلم دیکھ سکیں۔ خصوصاً اس کی اگلی فلم ''نیا ہندوستان'' جس کی شوٹنگ ہمارے فارم پر ہوئی ہے۔''

''اور؟''

''اس سال چھٹی ملے گی تو میں پچھلے سال کی طرح یہیں بیٹھ کر ریسرچ نہیں کروں گا۔''

''پھر کیا کرو گے؟''

''ہم دونوں بمبئی جائیں گے۔ دیپ کمار نے اپنے اسٹوڈیو میں آنے کی دعوت دی ہے۔ اس کی شوٹنگ دیکھیں گے۔''

''مجھے شوٹنگ دیکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے۔''

''مگر مجھے تو شوق ہے۔ میں دیپ کمار کو اس کے کام کے ماحول میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بُرا آدمی نہیں ہے۔ مگر ہر آدمی کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اپنا ماحول ہوتا ہے۔ اس کے باہر وہ بوکھلا جاتا ہے۔ جیسے ندی میں کود کر بے چارہ بوکھلا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسٹوڈیو میں مجھے کیمرے کے سامنے میک اپ کر کے کھڑا کر دیا جائے تو ڈر کے مارے مجھے پسینہ آ جائے گا۔ جانتی ہو کہ جاتے جاتے دیپ مجھ سے کیا کہہ گیا ہے؟ کہتا تھا کہ رمیش! تمھارے فارم پر ان پندرہ دنوں میں میں نے زندگی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس نئی سمجھ بوجھ کی جھلک تمھیں

میری اگلی فلموں میں ملے گی۔ تب ہی تو میں یہاں سینما بنوانا چاہتا ہوں اور دیپ کمار کی فلمیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''پھر دیپ کمار کا ذکر!''

''کیوں تم اس سے کچھ خفا معلوم ہوتی ہو۔ تم سے الگ کچھ کہہ رہا تھا؟ لگتا ہے ایسی ویسی بات کہہ دی جس سے تم ناراض ہوگئیں۔''

''وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کہنے لگا مسز رمیش! آپ کی فلمیں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ آپ کی آنکھیں کسی قدر بڑی اور ناک کسی قدر چھوٹی ہے۔ بڑا آیا لمبی ناک والا۔''

اتنے میں گھر آ گیا۔ جیپ سے اتر کر رمیش نے اوشا کو سہارا دے کر اتارا پھر بولا: ''آؤ اب تمھیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔''

''دکھاؤ۔ تو پھر میں تمھیں ایک بات بتاؤں گی۔''

''وہ دیکھو۔ تمھارے گلاب کتنے خوبصورت کھلے......''

گلاب کی جھاڑیاں مکان کے پیچھے باغ میں لگی تھیں مگر ان میں پھول ایک بھی نہیں تھا۔

''یہ پھول کس نے چُرائے؟''

''میں نے رمیش بابو۔''

گنگوا کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کی جھولی میں سرخ گلابی اور سفید گلاب کے تازہ تازہ پھول بھرے ہوئے تھے۔

''شما کیجیے گا رمیش بابو۔ میں نے آپ کی آگیا بنا یہ پھول توڑ لیے ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ آج میری شادی ہے۔ سو میں نے ...... مگر آپ چاہیں تو یہ پھول لے لیجیے۔''

''نہیں گنگوا!'' اوشا جلدی سے بولی: ''تم سب پھول لے جاؤ۔ میری طرف سے دلھن کو بھینٹ دینا اور ہاں شادی ہوجائے تو گلاب کی ایک قلم یہاں سے لے جانا اور اپنے گھر کے باہر ضرور لگانا۔ سمجھے۔''

''جی ضرور۔ تو یہ سب لے جاؤں؟''

''لے جاؤ۔'' رمیش نے اجازت دے دی۔ ''مگر ایک پھول مجھے دے جاؤ۔'' اور اس نے ایک خون کے رنگ کا سرخ گلاب چن لیا۔ گنگوا چلا گیا۔

'دیکھا تم نے۔ گنگوا بھی گلاب کے پھولوں کو کتنا پسند کرتا ہے۔''

''مگر یہ بھی دیکھنا کہ گنگوا ٹریکٹر چلا کر گیہوں کتنا پیدا کرتا ہے۔''

''گنگوا بڑا خوش نظر آتا ہے نا؟''

''شادی بھی تو گوری سے ہو رہی ہے۔ جانتے ہو کتنی خوبصورت ہے وہ؟''

''تم سے زیادہ خوبصورت تھوڑی ہے۔''

''گنگوا کے دل سے پوچھو۔''

''اچھا تو میرے دل سے بھی پوچھو۔'' اور یہ کہہ کر اس نے اوشا کے جوڑے میں گلاب کا پھول لگا دیا اور اس کے بالوں کو ہلکے سے چومتے ہوئے کہا: ''اب بتاؤ وہ بات؟''

''لاؤ کان یہاں۔''

''سچ؟''

''ایک چھوٹی سی منی سی اوشا۔''

''اونہوں۔ ایک چھوٹا سا منا سا رمیش۔''

''اوشا! وہ دیکھو۔''

اوشا نے مڑ کر دیکھا۔

گلاب کی جھاڑیوں پر ایک چھوٹی سی منی سی گلابی کلی ایک معصوم نوزائیدہ بچے کی طرح مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

بھولی

اس کا نام تو سلیکھا تھا مگر بچپن ہی سے اس کے گھر والے ہی نہیں سارے گاؤں والے اسے بھولی کہتے تھے۔ ان کے پڑوس کے رہنے والوں کا کہنا تھا کہ نمبردار رام لال کی چوتھی بیٹی سلیکھا جب دس مہینے کی تھی تو کھاٹ پر سے سر کے بل گر پڑی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ زمین کچی مٹی کی تھی۔ اس لیے ننھی جان تو بچ گئی مگر بھیجے کی کوئی نازک رگ شدید پچک گئی اس لیے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس کی عقل کم ہی رہی۔

مگر برادری کی بڑی بوڑھیوں کا کچھ اور ہی کہنا تھا۔ نمبردار کی چوتھی بیٹی جب پیدا ہوئی تو اتنی خوبصورت تھی کہ بالکل میم کی بچی معلوم ہوتی تھی۔ گوری چٹی، لال لال پھولے گال، ریشمی کالے بال اور بڑی بڑی آنکھیں جو کاجل لگانے سے اور بھی بڑی بڑی لگتی تھیں۔ سارے گاؤں میں شاید ہی کوئی ہوگا جو اسے دیکھنے نہیں آیا۔ بس ان ہی کے آنے جانے والوں میں سے کسی ہونسنے والے کی نظر لگ گئی۔ ابھی دو سال کی نہیں ہوئی تھی کہ چیچک نکل آئی۔ وہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ آنکھیں بچ گئیں۔ مگر سارے منہ اور بدن پر ہمیشہ کے لیے یہ چیچک کے کالے کالے داغ پڑ گئے اور بخار کی گرمی سے بھیجا کمزور ہو گیا اور زبان ہکلانے لگی۔

کسی کا کہنا یہ بھی تھا کہ سارا قصور اصل میں لاڈو دائی کا تھا۔ اس کے ہاتھوں گاؤں کا ہر بچہ جنم لیتا تھا۔ پیدا ہوئے بچے کی نال وہی کاٹتی تھی، وہی نہلاتی دھلاتی تھی اور وہی بچے کے منہ میں انگلی ڈال کر گلے کے سوراخ کو بڑا کرتی تھی۔ جب ہی تو لاڈو کے ہاتھوں پیدا ہونے والے بچے اتنے زور سے روتے تھے کہ سارے گاؤں کو پتہ چل جاتا تھا کہ کسی کے گھر ایک اور بچے نے جنم لیا ہے۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ نمبردار کی چوتھی بیٹی جس وقت پیدا ہوئی تو لاڈو دائی جلدی میں تھی، کیونکہ اسے نائب تحصیلدار کے ہاں بھی جانا تھا جس کی بیوی کو سویرے سے درد ہو رہا تھا اور وہاں سے اسے کم سے کم پانچ روپے فیس ملنے کی امید تھی اور اگر اللہ کے کرم سے بیٹا ہوا تو دس روپے انعام

بھی۔اس نے جلدی جلدی نال کاٹی پھر بچی کو نہلایا بھی لیکن منہ میں انگلی ڈال کر گلے کا سوراخ بڑا کرنا بھول گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بچی کے منہ سے کبھی کسی نے اونچی آواز نہیں سنی۔ اور جب پانچ برس کی عمر میں بولنا شروع کیا تو نہ صرف تتلا کر، بلکہ ہکلا کر اور جب دوسرے بچوں اور بچیوں نے اس کا مذاق اڑایا اور اس کے ہکلا کر بولنے کی نقل کر کے ہنستے تو اس نے منہ پر گویا تالا ہی لگالیا۔ بس کوئی بہت ہی ضروری بات ہوتی تو رک رک کر دو چار لفظ بولتی اور پھر چپ ہو جاتی اور کبھی بات کرتی بھی تو وہ اتنی سیدھی اور بچکانہ ہوتی کہ سننے والے بے اختیار ہنس پڑتے اور کہتے— بڑی بھولی ہے بچاری۔

نمبردار کے سات بچے تھے۔ تین لڑکے اور چار لڑکیاں، جن میں سب سے چھوٹی بھولی تھی۔ گھر میں کھانے پینے کو کافی تھا۔ دودھ، دہی، مکھن کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ سب کی صحت بڑی اچھی تھی۔ بڑا لڑکا سریندر چودہ برس کی عمر میں بھی باپ کے برابر لمبا اور صحت مند تھا۔ اس سے چھوٹی رادھا تیرہ برس کی عمر میں اچھی خاصی خوبصورت عورت لگتی تھی۔ نمبردار نے رادھا کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ لڑکے کا باپ بھی پاس کے گاؤں کا نمبردار تھا۔ اور لڑکا شہر میں میٹرک پاس کر کے داخل ہوا تھا۔ رادھا کی سسرال کی دیکھا دیکھی نمبردار نے اپنے بیٹوں کو بھی آگے پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا۔ اب گھر میں صرف لڑکیاں رہ گئیں۔ منگلا جو بارہ برس کی تھی اور جس کی شادی کی بات چیت ہو رہی تھی۔ چمپا دس برس کی تھی مگر نمبردار کی بیوی کا ارادہ تھا کہ منگلا کے ہاتھ پیلے کرتے ہی چمپا کی سگائی بھی کہیں کر دی جائے۔

مگر رات کو جب کھانے کے بعد آنگن میں نمبردار کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا تو اکثر اپنی بیوی سے کہتا: ”سریندر کی ماں! اور سب بچے تو ٹھکانے لگ جائیں گے مگر اس کمبخت بھولی کا کیا ہوگا؟ اس کو کون بیاہے گا؟“

وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی: ”جو بھگوان کو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔“

اور اپنی چھوٹی سی پلنگڑی پر لیٹی ہوئی پانچ سال کی بچی سوچتی یہ بیاہ کیا ہوتا ہے؟ اور بھگوان کہاں رہتا ہے؟

بھولی سات برس کی تھی کہ منگلا کا بیاہ بھی ہو گیا اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔ اسی برس ان کے گاؤں میں لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول بھی کھل گیا۔ تحصیل دار صاحب اسکول کا افتتاح کرنے آئے تو انھوں نے نمبردار سے کہا: ”تم کو اپنی لڑکیوں کو بھی اسکول میں داخل کرانا چاہیے تاکہ

دوسرے گاؤں والوں کے سامنے اچھی مثال قائم ہو۔

اس رات نمبردار نے اس معاملے میں بیوی سے صلاح کی۔ اس نے کہا: ''پاگل ہوئے ہو۔ لڑکیاں اسکول جائیں گی تو بدنام ہو جائیں گی۔ پھر ان کو بیاہے گا کون؟ پھر چمپا کی تو اب سگائی ہوگئی ہے۔ کون جانے اس بات پر وہ لوگ انکار ہی نہ کر دیں۔''

پھر نمبردار نے اسے سمجھایا: ''یہ سرکاری معاملہ ہے۔ تحصیل دار صاحب کو معلوم ہوگیا تو خفا ہوں گے۔ کون جانے مجھے برخاست ہی کر دیں۔ یہ سرکار نہ جانے لڑکیوں کو پڑھانے کے پیچھے کیوں پڑی ہے۔ پھر یہ نمبردار، ذیلدار، پٹیل اور پٹواری کو حکم دیا جاتا ہے کہ دوسرے گاؤں والوں کے لیے مثال قائم کرو۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔''

نمبردار کی بیوی سمجھ دار تھی۔ بولی: ''میں بتاؤں، بھولی کو اسکول میں داخل کر دو۔ ویسے بھی اس بے چاری کو کون بیاہنے والا ہے۔ نہ صورت نہ شکل ہے، نہ بھیجے میں عقل ہی ہے۔''

نمبردار نے بیوی کی رائے سے اتفاق کیا اور اگلے دن بھولی کو اسکول میں داخل کرانے لے گیا۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اسکول کیا ہوتا ہے۔ جب باپ نے کہا کہ چل میرے ساتھ تو وہ سمجھی کہ اسے گھر سے نکال رہے ہیں جیسے لکشمی کو نکال دیا تھا۔ لکشمی ان کی ایک بوڑھی گائے تھی جس سے بھولی بہت پیار کرتی تھی۔ اس لیے کہ یہ گائے کبھی اس کا مذاق نہیں اڑاتی تھی، نہ اس سے اوندھے سیدھے سوال کرتی تھی، جن سے بھولی کو اپنی جہالت اور کمتری کا احساس ہو۔ باپ کی طرح ڈانٹتی بھی نہیں تھی اور کبھی کبھی ماں کی طرح اسے کوستی بھی نہیں تھی۔ صرف اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے بھولی کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی کبھی اپنی گرم گرم زبان سے بچی کے گالوں کو چاٹتی تھی۔ لکشمی بوڑھی ہوگئی تھی۔ اب وہ دودھ نہیں دیتی تھی۔ اب وہ کبھی بچھڑا بھی نہیں دے سکتی تھی۔ بس کھڑی تکا کرتی تھی۔ سو نمبردار نے چپکے سے ایک قصائی کے ہاتھ سے پچیس روپے لے کر لکشمی کو گھر سے نکال دیا تھا اور قصائی لکشمی کو رسی سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ سوائے بھولی کے جو لکشمی کے ڈکرانے کی آواز سن کر گھر سے نکل آئی تھی۔ اس نے قصائی کے ہاتھ سے رسی چھڑانے کی کوشش کی مگر قصائی نے جھٹکا مار کر رسی چھڑا لی اور بھولی دور جا گری۔ وہ چلّانا چاہتی تھی ''میری لکشمی کو مت لے جاؤ۔ میری لکشمی کو مت لے جاؤ۔'' مگر غم اور غصے سے اس کی ہکلاہٹ اور بھی بڑھ گئی اور اس کی زبان سے سوائے ہے...... ہے...... ہے...... ہے کے اور کچھ نہیں نکلا۔ غریب لکشمی پیچھے مڑ مڑ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بھولی کی طرف دیکھتی رہی مگر

قصائی اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا اور بھولی وہیں زمین پر پڑی روتی رہی۔

سو جب اس کے باپ نے بھولی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور کہا ''چل میرے ساتھ۔ تجھے اسکول میں چھوڑ کر آؤں۔'' تو وہ سمجھی کہ لکشمی کی طرح مجھے بھی کسی قصائی کے حوالے کیا جا رہا ہے اور وہ زمین پر پچھاڑیں کھا کر رونے لگی۔

''اری مری کیوں جا رہی ہے؟ اسکول ہی تو لے جا رہا ہوں ماسٹرنی کے پاس۔ کسی قصائی کے حوالے تو نہیں کر رہا۔'' نمبردار نے ڈانٹ کر کہا اور اپنی بیوی کو حکم دیا: ''ذرا اسے ڈھنگ کے کپڑے تو پہنا دو۔ اسکول میں دوسری بچیاں کیا کہیں گی؟''

بھولی کے لیے نئے کپڑے بنے ہی نہیں تھے۔ چمپا کے جو کپڑے چھوٹے ہو جائیں یا پھٹ جائیں وہی بھولی کو مل جاتے تھے۔ پھر ان کو کبھی نہ دھویا جاتا نہ ان کی مرمت ہوتی۔ میلے چیکٹ ہو جاتے، پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے ہو جاتے تب بھی اس کو دوسرا جوڑا نصیب نہ ہوتا۔ مگر آج ماں نے اسے چمپا کا ایک پرانا مگر صاف جوڑا پہنایا، سر میں تیل ڈال کر چوٹی گوندھی۔ تب بھولی کو اطمینان ہوا کہ اسے قصائی کے حوالے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ شاید کسی اچھی جگہ لے جایا جا رہا ہے۔

بھولی جب اسکول پہنچی تو پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ نمبردار تو بڑی استانی کے سپرد کر کے چلا آیا اور بھولی گھبرا گھبرا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کئی کمرے تھے اور ہر کمرے میں اس جیسی کتنی ہی لڑکیاں چٹائی پر بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ بڑی استانی نے اسے ایک کمرے کے کونے میں سب سے پیچھے بٹھا دیا۔ ابھی تک بھولی کے یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اسکول کیا ہوتا ہے؟ اور وہاں بچے کیوں آتے ہیں؟ مگر اتنی بہت سی بچیوں کو دیکھ کر اسے اطمینان سا ہو گیا۔ اس کی بہنیں تو اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھیں۔ شاید ان لڑکیوں میں سے کوئی اس کی سہیلی بن جائے۔ جیسے لکشمی اس کی سہیلی تھی اور گائے کو یاد کر کے وہ پھر اداس ہو گئی۔

استانی اور بچیوں کی کچھ غیر متعلق آوازیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ مگر نہ تو بھولی کے سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور نہ ہی اسے ان کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ اسے تو دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں میں دلچسپی تھی۔ ارے واہ واہ! کتنی اچھی اچھی رنگین تصویریں ہیں۔ بالکل جیسے سچ مچ کی ہوں۔ لال لال گھوڑا جیسے گھوڑے پر تحصیل دار صاحب بیٹھ کر گاؤں میں آتے تھے اور کالی کالی بکری جیسے اس کے پڑوسی تیلی کی بکری ہے اور لال لال چونچ کا ہرا ہرا طوطا۔ جیسا اس نے آموں کے باغ میں دیکھا تھا اور کالی کالی چتیوں والی گائے۔ بالکل لکشمی جیسی ...... دفعتاً

بھولی نے دیکھا کہ استانی اس کے پاس کھڑی ہے اور اس سے سوال کر رہی ہے۔ بھو......بھو...... بھو اور ہکلاہٹ کے مارے وہ اپنا نام بھی بتا سکی۔

''بہن! اس کا نام بھولی ہے بھولی۔'' اور ساری لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑیں۔ اور بھولی کو ایسا لگا جیسے ان کی ہنسی کے طمانچے اس کے گالوں پر پڑ رہے ہیں اور شرم اور غصے سے وہ لال ہوگئی اور دانت کچکچا کر اس نے اپنا نام ادا کرنا چاہا۔

''بھو......بھو......بھو......''

اور پھر وہ رونے لگی۔...... زور زور سے......۔ ڈھاڑیں مار مار کر۔ یہاں تک کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ جب اسکول ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور سب لڑکیاں کلاس چھوڑ کر بھاگیں تب بھی وہیں بیٹھی رہی، سر جھکائے، سسکیاں لیتی رہی!

''بھولی!''

تو اسے سب ہی کہتے تھے حقارت سے، نفرت سے، مذاق سے۔ مگر استانی کی آواز میں ایسی نرمی تھی کہ بھولی کو ایسا لگا جیسے اس کے دل کے زخموں پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ استانی اس کے پاس کھڑی ہے۔

''اٹھو۔'' استانی نے کہا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب اپنا نام بتاؤ۔'' بھولی کو اس ڈر سے پسینہ آ گیا کہ پھر اسے اپنی ہکلاہٹ کے مارے ذلیل ہونا پڑے گا۔ پھر اس نے اس مہربان استانی کی خاطر کوشش کی۔

''بھو......بھو......بھو......''

''شاباش۔ شاباش۔ پورا نام بتاؤ۔''

''بھو......بھو......بھولی۔'' آخر کار نام پورا ہو ہی گیا اور بھولی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے بہت بڑا کام کیا ہو۔

''شاباش!'' استانی نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

''جب تمہارے دل سے ڈر نکل جائے گا تو تم اور سب کی طرح بولنے لگو گی۔''

بھولی کی آنکھوں نے استانی سے پوچھا: ''سچ؟''

''ہاں ہاں۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ بس تم روز اسکول آیا کرو۔ آؤ گی نا؟''

بھولی نے سر ہلا کر ''ہاں'' کہا۔

''یوں نہیں۔ زبان سے ہاں کہہ کر کہو۔ اگر تم سچ مچ یہاں آنا چاہتی ہو تو ہاں تمھاری زبان سے فوراً نکل آئے گا۔''

''ہ......ہ......ہاں!'' اور بھولی حیران رہ گئی کہ یہ کیسے ہوا۔

''دیکھا تم نے۔ یہ لو کتاب۔''

کتاب رنگین تھی اور اس میں بڑی اچھی اچھی تصویریں تھیں۔ کتا، بلّی اور بکرا اور گھوڑا اور طوطا اور شیر اور گائے، لکشمی جیسی گائے۔ ساتھ میں اردو کے کچھ لفظ بھی لکھے تھے۔

''یہ کتاب پڑھنا تو تمھیں ایک مہینے میں آجائے گا بھولی۔ پھر تم اس سے بڑی کتاب پڑھوگی۔ پھر اس سے بڑی...... اور پھر تم سب گاؤں والوں سے زیادہ پڑھ جاؤ گی۔ پھر تمھارا کوئی مذاق نہیں اڑائے گا۔ ہر کوئی تمھاری عزت کرے گا اور جو بات بھی تمھارے دل میں آئے گی، تم اس کا اظہار کرسکوگی۔ سمجھیں تم۔ شاباش! اب جاؤ۔ کل سویرے آنا۔''

بھولی کو ایسا محسوس ہوا جیسے مندر کے گھنٹے ایک دم بج پڑے ہوں۔ جیسے اسکول کے سامنے اُگے ہوئے کیکر کے پیڑ پر ایک دم سے لال لال پھول نکل آئے ہوں۔ جیسے وہ اپنی ہکلاہٹ کو دور کرکے وہ سارے گیت گانے لگی ہو جو اس کی بہنیں گایا کرتی تھیں اور جنھیں آج تک وہ نہ گا سکی تھی۔

اس نے سوچا میں گھر جاؤں گی اور باپو اور ماں اور چمپا مجھ سے پوچھیں گے کہ اسکول کیسا لگا تو میں انھیں بتادوں گی کہ اسکول کتنا بڑا ہے اور استانی کتنی اچھی ہے اور انھیں یہ خوبصورت کتاب دکھاؤں گی اور اس میں بنی ہوئی رنگین تصویریں۔ اور ان سے بات کرتے ہوئے ایک بار بھی نہیں ہکلاؤں گی۔

مگر جب وہ گھر پہنچی تو اس کے باپ نے کچھ نہیں پوچھا۔

اس کی ماں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا کہا ڈانٹ کر: ''چل یہ کپڑے اتار کر سنبھال کر رکھ گھر میں۔ دھول مٹی میں خراب کرے گی تو پھر خوب ہی درگت بنادوں گی تیری۔''

اور چمپا نے بھی کچھ نہیں پوچھا اور وہ اپنی ریشمی شلوار سیتی رہی جو اس کے جہیز کے لیے بن رہی تھی۔

سو بھولی کسی کو کچھ نہ بتا سکی۔ کاش لکشمی ہی ہوتی تو وہ اسے ہی اپنے اسکول کی اور اپنی استانی اور اپنی کتاب کے بارے میں بتاتی اور کہتی: ''دیکھ لکشمی! کسی کو کہنا نہیں مگر میں ایک دن سب کی

طرح سے فرفر باتیں کروں گی۔ استانی جھوٹ تھوڑی بولتی ہے۔''

مگر لکشمی تو کب کی قصائی کی چھری تلے آ چکی تھی۔ سو بھولی چپ چاپ اپنے کونے میں بیٹھی رہی اور اس نے اپنی کتاب کو اناج کی کوٹھی میں چھپا دیا مگر اس کا دل دھڑک دھڑک کر اعلان کر رہا تھا:

''بھولی بولے گی۔ بھولی بولے گی۔''

اور یوں سات برس گزر گئے۔

بھولی اسکول جاتی رہی۔ اس لیے کہ نمبردار کو اپنی ایک بیٹی کو تو پڑھا کر گاؤں کے لیے مثال قائم کرنی چاہیے۔

چمپا کا بیاہ ہو گیا۔ سریندر بی اے کر کے شہر کے ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔

نمبردار نے اپنا کچا مکان پختہ کروالیا۔

گاؤں کی آبادی اتنی بڑھی کہ وہاں اسکول کے علاوہ ایک تنبو والا سینما بھی قائم ہو گیا اور ایک کپاس کو صاف کرنے کا کارخانہ اور اب تو ڈاک گاڑیاں بھی ان کے اسٹیشنوں پر رکنے لگیں اور تحصیل دار تو کیا اب تو کبھی کبھی کلکٹر صاحب اور ایک بار تو منسٹر بھی وہاں کا دورا کرنے لگے۔

ایک رات کو اپنے پکے نئے مکان کی چھت پر پلنگ پر بیٹھ کر حقہ گڑ گڑاتے ہوئے نمبردار نے بیوی سے کہا: ''تو پھر بشمبر کو ہاں کہہ دوں؟''

''ہاں تو اور کیا۔ اس سے اچھا بر بھلا اس نگوڑی کو کہاں ملے گا۔ اچھی بڑی دکان ہے اپنا مکان ہے، آٹھ ہزار روپے نقد بھی ہیں۔ پھر بے چارہ جہیز دان کچھ نہیں مانگتا۔''

''وہ ٹھیک ہے مگر عمر ذرا زیادہ ہے نا؟ پہلی بیوی کے بچے بھی بڑے بڑے ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا؟ چالیس پچاس کی عمر بھی کوئی عمر ہووے ہے کیا۔ اب اس کلموہی کے لیے کوئی راج کمار آئے گا کیا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ بشمبر دوسرے قصبے کا ہے۔ نہیں تو کاہے کو کوئی پیغام دیتا۔ یہ رشتہ نہ ہوا تو عمر بھر کنواری رہے گی اور ہماری چھاتی پر مونگ دلے گی۔''

نمبردار نے کہا: ''پھر بھی ڈرتا ہوں نہ جانے لڑکی کیا کہے گی۔''

''ارے وہ پگلی کیا کہے گی۔ بھیجے میں عقل نہیں۔ منہ میں زبان نہیں۔ وہ تو بے چاری گائے ہے گائے۔ لکشمی کو تم نے قصائی کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ کچھ بولی تھی کیا؟''

''تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو۔'' اور پھر وہ حقہ گڑگڑانے لگا۔ اور بھولی جو ابھی سوئی نہیں تھی اور

یہ سب سن رہی تھی، بڑی دیر تک آسمان کو تکتی رہی جہاں لاکھوں ستارے جھلملا کر نہ جانے اس سے کیا کہہ رہے تھے۔

بشمبر ناتھ جس کی دوسرے قصبے میں پنساری کی دکان تھی، جہاں پر وہ ہلدی، دھنیا، نمک، گھی بیچتا تھا، بڑی بھاری برات لے کر آیا۔ نمبردار رام لال کی تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی چوتھی بیٹی کی قسمت یوں چمکے گی۔ رادھا، منگلا، چمپا جو اپنی سسرال سے بھولی کے بیاہ میں شرکت کرنے آئی تھیں، برات کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر جل ہی تو گئیں۔

''اس پگلی ہکلی مردار کی یہ قسمت!'' منگلا نے کہا۔

پھر رادھا نے کہا: ''اری اس کے دولہا کو بھی دیکھا ہے۔ مونچھوں میں خضاب لگاتا ہے۔''

اور چمپا بولی: ''میں نے سنا ہے کہ لنگڑاتا بھی ہے۔''

''ہاں اور یہ بڑے بڑے تو لڑکے ہیں اس کے۔''

اور یہ سب سوچ کر ان کو تھوڑی بہت تسلی ہوگئی کہ برات بہت شاندار سہی، مگر بھولی کا دولہا تو لنگڑا ہے، بڈھا ہے، براتیوں کو ہار پان تقسیم ہو رہے تھے۔ بینڈ باجا ایک فلمی دھن بجا رہا تھا:

''دلھنیا چھما چھم چھما چھم چلی۔''

پروہت نے کہا: ''مہورت کا وقت ہو گیا۔ اب کنیا دان ہونا ہی چاہیے۔''

بشمبر ناتھ تو بے تابی سے خود ہی سہرا ہلاتا ہوا ہون کنڈ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''لڑکی کو لاؤ۔ لڑکی کو لاؤ۔''

آوازیں باہر سے اندر کی طرف گئیں۔

ماں نے بھولی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ''آ بھولی! تو بڑی قسمت والی ہے۔''

بھولی نظریں جھکائے باہر آئی۔ زیور اور بھاری کپڑوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہون کنڈ کے پاس اسے دولھا کے برابر پٹڑے پر بٹھا دیا گیا۔

بشمبر ناتھ کے ایک دوست نے کہا: ''چل بھئی بشمبر! کنیا کو ہار پہنا۔'' اس نے ہار پہنانے کو اٹھایا۔ پاس کھڑی ہوئی ایک عورت نے گھونگھٹ سرکا دیا۔ ہار بشمبر کے جھرّی پڑے ہاتھوں ہی میں لرزتا رہا۔

''ٹھہرو۔'' اس نے اپنے دوست سے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ مگر آس پاس والوں نے سن ہی لیا۔ دلھن کے منہ پر گھونگھٹ پھر گر گیا۔

''ارے اس کے منہ پر تو چیچک کے داغ ہیں۔''بشمبر نے کہا۔

''تو اب کیا ہو سکتا ہے؟ تو بھی کون سا جوان پٹھا ہے۔''

اس کے دوست نے سمجھایا۔

''ارے یہ ایسی تھی تو ہمیں کم سے کم پانچ ہزار مانگنا چاہیے تھا۔''

''یہ پہلے سوچنا چاہیے تھا۔اب کیا برات واپس لے جائیں گے؟''

''نہیں نمبردار سے کہو پانچ ہزار لائے۔''

نمبردار رام لال کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔اتنی ذلت اس کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آج اس کمبخت بھولی کے ہاتھوں اس کی عزت کو یوں لٹنا تھا۔اور پھر ایک نہ دو پورے پانچ ہزار۔اتنی بڑی رقم وہ کیسے دے دے۔مشکل سے عمر بھر جوڑ کر رشوتیں لے لے کر چھ سات ہزار روپیہ تو اس نے جمع کیے تھے۔

اس نے بشمبر کے پاؤں میں اپنی پگڑی ڈال دی۔

''میری عزت کا سوال ہے بیٹا۔دو ہزار دیتا ہوں ابھی۔''

''نہیں پانچ ہزار۔ورنہ ہم جاتے ہیں۔''

''کچھ تو خیال کرو۔تو برات واپس لے گیا تو میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔''

''تو پھر نکالو پانچ ہزار روپے۔''

روتا ہوا نمبردار اندر گیا۔کانپتے ہوئے ہاتھوں سے الماری کھولی۔نوٹ گنے اور پورے پانچ ہزار دولہا کے آگے ڈال دیے۔

بشمبر کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔''لاؤ جی۔اب ہار دو۔''

ایک بار پھر دلھن کا گھونگھٹ سرکایا گیا مگر اس بار اس کی نظریں نیچی نہ ہوئیں۔وہ اپنے ہونے والے شوہر کو گھور رہی تھی اور آنکھوں میں نفرت غصہ نہیں صرف حقارت تھی۔

بشمبر کا ہاتھ اٹھا کہ ہار بھولی کے گلے میں ڈال دے مگر اس سے پہلے بھولی کا ہاتھ بجلی کی طرح کوندا اور اس نے ہار چھین کر پھینک دیا۔اسی لمحے پٹڑے سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔

سارے مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔جتنے منہ اتنی باتیں۔''کمبخت بدصورت بھی ہے اور بے شرم بھی۔کیا زمانہ آیا جی۔اسے تو سب بھولی سمجھتے تھے......''

''پتا جی!''بھولی کی آواز گونجی اور اس بار اس میں ہکلاہٹ کا شائبہ بھی نہ تھا۔اس کا باپ

اس کی ماں، اس کے بھائی اور بہنیں اور گاؤں کے لوگ یہ سن کر حیران رہ گئے۔

''پتاجی اٹھائیے اپنے پانچ ہزار۔ مجھے اس سے بیاہ کرنا منظور نہیں ہے۔''

''بھولی! اری بھولی! کمبخت کیا کہہ رہی ہے؟ ماں باپ کی ناک کاٹنا چاہتی ہے کیا؟ کچھ تو ہماری عزت کا خیال کر۔''

''تمھاری عزت کی خاطر میں اس بڈھے لنگڑے سے بیاہ کرنے کو تیار تھی۔ مگر اس لالچی کمینے سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔'' یہ لفظ دہرائے جارہی تھی جیسے اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔

''ارے ہم تو اسے گائے سمجھتے تھے، گائے۔''

بھولی یہ کہنے والے کی طرف تیزی سے گھومی: ''ہاں خالہ! مجھے سب گائے سمجھتے تھے۔ تبھی اس قصائی کے حوالے کیے دے رہے تھے۔ پر اب ہکلی بول رہی ہے اور بھولی اتنی بھولی نہیں رہی کہ جان کر اس دوزخ میں گر پڑے۔''

بشمبر ناتھ گالیاں بکتا ہوا برات کو واپس لے جارہا تھا۔ اس کے ساتھی خوفناک انتقام کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ نمبردار رام لال سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی بیوی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جب سب باہر والے چلے گئے اور ہون کنڈ کی آگ ٹھنڈی ہوگئی تب رام لال نے بیٹی کی طرف دیکھا اور بولا:

''جو ہوا سو ہوا، مگر اب تیرا کیا ہوگا؟''

اور وہ جو بھولی تھی، اور جو ہکلی تھی اور وہ جسے سب بے وقوف اور پاگل سمجھتے تھے بولی: ''گھبراؤ نا پتاجی! بڑھاپے میں تمھاری اور ماں کی خدمت کروں گی اور جہاں میں نے پڑھا ہے، اس اسکول میں بچوں کو پڑھاؤں گی۔ کیوں آپاجی! ٹھیک ہے نا؟''

استانی، جو ایک کونے میں کھڑی تھی بولی:

''ہاں بھولی! ضرور۔'' اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں وہ روشنی تھی جو ایک مصنف کی آنکھوں میں ہوتی ہے جب وہ اپنے شاہکار کی آخری سطر لکھتا ہے جو ایک مصور کی آنکھوں میں ہوتی ہے جو وہ اپنی تخلیق کی ہوئی تصویر کو مکمل دیکھتا ہے۔

(بشکریہ ہندوستانی ادب)

☆☆☆

ماں کا دل

ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

اسٹوڈیو میں حسبِ معمول ہنگامہ تھا۔ ہیرو کے سر پر نقلی بالوں کی ''وِگ'' بٹھائی جا رہی تھی۔ ہیروئن بار بار آئینہ میں اپنی لِپ سٹک کا معائنہ کر رہی تھی۔ ڈائرکٹر کبھی ڈائیلاگ رائٹر سے الجھ رہا تھا، کبھی کیمرہ مین سے۔ پروڈکشن منیجر اکسٹرا اسپلائر سے ایک کونے میں اپنا کمیشن طے کر رہا تھا۔

کیمرہ مین کے اسسٹنٹ نے روشنیوں کے کالے شیشے میں سے دیکھ کر کیمرہ مین سے کہا: ''شاٹ ریڈی۔'' کیمرہ مین نے اپنے کالے شیشے میں سے سین کا معائنہ کر کے ڈائرکٹر سے چلاّ کر کہا: ''شاٹ ریڈی۔''

ڈائرکٹر نے ہیرو کی کرسی کے پاس جا کر دھیرے سے کہا: ''شاٹ ریڈی۔''

ہیرو نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیا، پھر دو آئینوں میں اپنے سر کو آگے پیچھے سے دیکھا، وِگ کو دو تین بار تھپ تھپایا، نقلی بالوں کی ایک لٹ کو ماتھے پر گرایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی طرف دیکھ کر (جو ڈائیلاگ کی فائل لیے کھڑا تھا) ہیرو نے پوچھا: ''پکچر کون سی ہے؟''

''ماں کا دل''

''سین کون سا ہے؟''

''جی وہ بچّے والا سین ہے۔''

''بچّے والا سین؟ مگر اس فلم میں تو میری شادی ہی نہیں ہوئی۔ بچہ کیسے ہو گیا؟''

''جی نہیں، یہ آپ کا بچہ نہیں ہے۔ راستہ چلتے آپ کو ایک لاوارث بچہ مل جاتا ہے۔ بچے کو دیکھ کر آپ کو اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ اپنی ماں یاد آ جاتی ہے۔ آپ بچے کو گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور آپ بولتے ہیں......''

''ہاں تو ڈائیلاگ سناؤ۔'' اور یہ کہہ کر ہیرو پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

ڈائیلاگ رائٹر نے فوراً فائل کھول کر پڑھنا شروع کیا:

''یہ بچہ بھی کسی کی آنکھ کا نور ہے......''

ہیرو نے پوچھا: ''نور؟ نور کیا ہوتا ہے؟''

ڈائیلاگ رائٹر نے پنسل سے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا: ''جی نور، نور تو بس نور ہوتا ہے، جیسے نور محمد، نور الحسن وغیرہ۔ دراصل رائٹر نے نور کا قافیہ سرور میں ملایا ہے۔''

''پورا ڈائیلاگ پڑھو۔''

''یہ بچہ بھی کسی کی آنکھوں کا نور ہے، کسی کے دل کا سرور ہے۔ اگر آج یہ بھوکا ہے، مجبور ہے تو یہ سماج کا قصور ہے۔ کل یہی بچہ بڑا ہو کر ڈاکٹر، وکیل یا پلیڈر بن سکتا ہے......''

''یہ سب کیا بکواس ہے؟'' ہیرو نے کہا اور پھر ڈائرکٹر کی طرف مخاطب ہو کر: ''اور پھر اتنا بڑا ڈائیلاگ مجھے یاد بھی نہیں ہوگا۔''

ڈائرکٹر نے کہا: ''مجھے بھی ڈائیلاگ ضرورت سے زیادہ لمبا لگتا ہے۔'' اور پھر ڈائیلاگ ڈائرکٹر سے: ''کمار صاحب جیسا کہتے ہیں اسے چھوٹا کردو۔''

ڈائیلاگ ڈائرکٹر نے ڈائیلاگ کے پورے صفحے پر نیلی پنسل سے کانٹی کا نشان بناتے ہوئے کہا: ''کمار صاحب! آپ ہی بتایئے نا۔''

ہیرو نے سوچ کر کہا: ''تو لکھو: یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے......

''جی؟ آگے۔''

''بس اور کچھ نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔''

ڈائیلاگ ڈائرکٹر نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے: ''یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔ واہ واہ! کیا بات کہی ہے۔ کمار صاحب! آپ کو تو رائٹر ہونا چاہیے تھا۔'' اور پھر ڈائرکٹر سے مخاطب ہو کر: ''سر یہ تو پکچر کا تھیم ڈائیلاگ ہو گیا۔''

''تو پھر چلیے۔ شاٹ تیار ہے۔'' ڈائرکٹر نے ہیرو کو اشارہ کیا اور پھر جیسے ہی ہیرو اپنی کرسی سے اٹھا اور سب بھی کھڑے ہو گئے۔

''بچہ لاؤ۔'' پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی آواز گونجی۔

''بچہ لاؤ۔'' دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔

''سپلائر! پروڈکشن منیجر نے نعرہ لگایا: ''بچہ کہاں ہے؟''

ایک موٹی تازی اینگلوانڈین عورت جو نہ جوان تھی، نہ بوڑھی، آگے بڑھی۔ اس کی گود میں ایک بھورے بالوں والا گول گول چہرے، گول گول آنکھوں والا بچہ تھا جو نائلون کا فراک پہنے ہوئے تھا۔

''اس کا فراک تو بہت بڑھیا لگتا ہے۔ غریب بچے کا فراک ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے اعتراض کیا۔ ''ستیہ جیت رے کی فلموں میں دیکھیے، کتنی ریالزم (Realism) ہوتی ہے۔''

''ڈریس مین!'' دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلآیا۔

''جی صاحب!'' ڈریس مین نے جواب دیا۔

''بچے کا فراک بدلی کرو۔ کوئی میلا پھٹا ہوا کپڑا پہناؤ۔'' پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے حکم دیا۔

ڈریس مین نے ایک بکسے میں ہاتھ ڈالا اور چند میلے گندے چیتھڑے لیے بچے کی طرف بڑھائے۔

بچے کی ماں نے جیسے ہی ان گندے چیتھڑوں کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے بچے کو اپنی چھاتی سے لگالیا: ''نونو۔ ہمارا بے بی ڈرٹی کپڑا نہیں پہنے گا۔ کوئی بیماری لگ گئی تو......''

''مگر میم صاحب! دیکھیے ریالزم کے لیے ضروری ہے......'' تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے کہنا شروع کیا۔

بچے کی ماں بات کاٹتے ہوئے بولی: ''ہمارا بے بی اونلی ہائی کلاس پکچرز میں کام کرتا ہے۔ ہم سپلائر کو پہلے ہی بولا تھا ہمارا بے بی گندا کپڑا نہیں پہنے گا۔''

ڈائرکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا: ''رہنے دو۔ آج کل غریبوں کے بچے بھی نائلون کے کپڑے پہنتے ہیں۔''

کیمرے کے سامنے کھڑے ہوئے ہیرو نے میم صاحب کی گود کی طرف ہاتھ پھیلائے:

''کم آن بے بی۔''

بچہ ہمک کر ہیرو کی گود میں چلا گیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ فلمی دنیا کا محاورہ ہے کہ شوٹنگ کرتے وقت تین مصیبتیں آسکتی ہیں: گھوڑا، کتا اور بچہ۔

میم صاحب نے اپنے بھورے گھنے بالوں کو تھپکی دیتے ہوئے ہیرو کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا: ''ہمارا بے بی سویٹ ہے نا؟ بڑا ہو کر یہ بھی فلم کا ہیرو بنے گا۔''

کیمرہ مین نے ایک لائٹ کو بائیں سے ذرا دائیں سرکایا پھر واپس بائیں کو سرکا کر اسی جگہ رکھ دیا۔ پھر کیمرہ کی آنکھ میں جھانک کر دیکھا: ''کمار صاحب! ذرا آگے......بس بس بس...... بالکل ٹھیک ہے۔'' اور پھر چلاّ کر ''ریڈی فار ساؤنڈ ٹسٹ۔''

ساؤنڈ اسسٹنٹ نے مائکروفون آگے بڑھایا: ''کمار صاحب! ڈائیلاگ بولیے گا ایک بار۔''

ہیرو نے مائیکروفون کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا: ''یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔''

''ہاؤزدیٹ'' تینوں اسسٹنٹ ایک ساتھ چلاّئے جیسے کرکٹ کے میدان میں کسی کھلاڑی کو (L.B.W.) کرنے کے لیے سب فیلڈر چلا کر امپائر سے پوچھتے ہیں: ''ہاؤزدیٹ''

ساؤنڈ روم سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے جواب آیا: ''اوکے۔ ریڈی فار ٹیک۔''

پہلا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا: ''خاموش۔''

دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا: ''سائلنس۔''

تیسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا: ''بات چیت بند۔''

ڈائرکٹر نے کہا: ''ساؤنڈ اسٹارٹ۔''

ساؤنڈ روم سے جواب آیا: ''کیمرہ۔''

کیمرہ مین نے بٹن دبا کر کہا: ''رننگ (Running)۔''

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ پھر کیمرے کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ کر بولا: ''یہ بچہ بھی کسی............''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بچے نے ہیرو کے ماتھے پر گری بالوں کی لٹ پر ایک جھپٹا مارا اور ''وِگ'' اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ ہیرو کی گنجی چندیا اسٹوڈیو لائٹس کی روشنی میں چمک اٹھی۔

ڈائرکٹر گھبرا کر چلایا: ''کٹ''

پہلا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا: ''کٹ اِٹ۔''

دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا: ''کٹ اِٹ۔''

تیسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا: ''میک اَپ۔ ہیئر ڈریسر کو بلاؤ۔''

تین نوجوان کالج کی لڑکیاں جو کمار کی ''فین'' (Fan) تھیں اور خاص طور سے اس کی شوٹنگ دیکھنے آئی تھیں، یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئیں کہ ان کے محبوب ایکٹر کے سر کی چندیا بالکل صاف تھی اور انڈے کی طرح سفید۔

''ہائے رام!'' ایک نے دوسری سے کہا: ''یہ تو گنجا ہے۔''

دوسری نے ''ش ش ش'' کر کے کہا: ''آہستہ بولو۔ کہیں سن نہ لیں۔''

کمار غصے میں سیدھا اسٹوڈیو کے باہر جا چکا تھا۔ اور اب اس کے پرائیویٹ میک اپ روم میں ہیر ڈریسر دوبارہ اس کی ''وِگ'' کو فٹ کر رہی تھی۔

''اس بار میں چار ہیر کلپ لگا دیتی ہوں تا کہ کھینچنے پر وگ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔''

مگر کمار نے غصے سے کہا: ''میں اس بچے کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔''

جب دوبارہ وگ لگوا کر ہیرو واپس اسٹوڈیو میں پہنچا تو ڈائرکٹر بے بی کی ممی سے کہہ رہا تھا: ''سوری میم صاحب۔ آپ کے بچے کی اب چھٹی۔ آگے کسی سین میں ہم ضرور اس کے لیے کوئی کام نکالیں گے۔''

''دیٹس آل رائٹ (Thats all right)'' میم صاحب بولیں: ہم کو مالوم ہے شوٹنگ میں ایسا گول مال ہو جاتا ہے۔ اپنے منیجر کو بولو ہمارا چکتا کر دو۔''

پروڈکشن منیجر نے اکسٹرا سپلائر کو ساٹھ روپے دے کر پچھتر روپے کی رسید لی۔ سپلائر نے میم صاحب کو چالیس روپے دے کر پچپن کی رسید لی۔ میم صاحب بچے کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ ہی رہی تھیں کہ بے بی نے ایک اور جھپٹا مارا اور اپنی ماں کے سر سے اس کی وگ بھی کھینچ لی۔ میم صاحب نے جلدی سے اپنے نقلی بالوں کو دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا۔ اور جب اطمینان ہو گیا تو بولیں: ''یونا ٹی بے بی۔ ڈرائیور ہم کو دادر اسٹیشن چھوڑ دینا۔ ادھر سے ہم بائیکلہ ٹرین میں جائے گا۔''

اسٹوڈیو میں پھر ہنگامہ تھا۔

ڈائرکٹر پہلے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا: ''دوسرا بچہ لاؤ۔''

پہلا اسسٹنٹ پروڈکشن منیجر سے کہہ رہا تھا: ''دوسرا بچہ لاؤ۔''

پروڈکشن منیجر نے اکسٹرا سپلائر کو کونے میں لے جا کر کہا: ''آج تو تیری چاندی ہو رہی ہے۔ ایک بچہ اور لے آ۔ جتنا شریر ہو اچھا ہے۔ ایک دو اور بچوں کا بھی انتظام کر رکھنا۔''

اکسٹرا سپلائر پروڈیوسر کی موٹر لے کر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک تین چار برس کا موٹا تازہ بچہ لے کر آ گیا۔ ساتھ میں ایک کالا سا موٹا سا لمبے لمبے بالوں والا پہلوان نما آدمی۔ دھاریوں والی بنیان اور چار خانے کا تہمد باندھے۔

''ہم حاضر ہیں جی۔'' پہلوان نما آدمی نے ڈائرکٹر کو ایک فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔

''تم کون ہو؟''

''آپ نے نہیں پہچانا۔ میں ماسٹر گُٹھل ہوں۔ انڈسٹری کا پرانا آدمی ہوں۔ شہزادہ گلفام میں ولین کیا ہے۔ باغی شہزادی میں سائڈ ہیرو تھا۔ لال گھوڑا میں سائڈ ولین۔ اب بھی کیرکٹر کر لیتا ہوں۔ بولیے کیا حکم ہے؟ ہم حاضر ہیں۔''

ڈائرکٹر نے چڑ کر کہا: ''بھئی ہمیں اس وقت صرف ایک بچے کی ضرورت ہے۔''

''بچہ بھی حاضر ہے سرکار۔'' یہ کہہ کر پہلوان نما آدمی نے بچے کو آگے کر دیا۔

''اے ڈائرکٹر صاحب کو سلام کرو۔''

بچہ ہرے رنگ کی مخمل کا نیکر اور بش شرٹ پہنے تھا۔ ہاتھ میں ایک جھنجھنا لیے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بچوں جیسا نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو چھوٹے قد کا بنا دیا ہو۔ باپ کا حکم سنتے ہی اس نے بھی ایک فوجی سلام کیا اور ماتھے سے ہاتھ نہ ہٹایا جب تک باپ نے اگلا حکم نہ سنایا۔

''ابھی صاحب کو ٹوسٹ کر کے بتاؤ بیٹا۔''

اور وہ بچہ جس کا چہرہ بچوں جیسا نہیں تھا، دفعتاً ٹوسٹ کرنے لگا۔ جیسے وہ چابی والی گڑیا ہو۔

''شاباش بیٹا شاباش!'' باپ ٹوسٹ کی لے پر تالیاں بجاتا ہوا بولا۔ بچہ تھرک رہا تھا۔ اپنے کولھے مٹکا رہا تھا۔ کبھی آگے بڑھتا تھا، کبھی پیچھے ہٹتا تھا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔

آہستہ آہستہ سیٹ پر جتنے لوگ جمع تھے، وہ بچے کا ٹوسٹ ڈانس دیکھنے لگے۔ کیمرہ مین، اس کے اسسٹنٹ، لائٹوں والے چھوٹے موٹے کیرکٹر، اکسٹرا۔

تب پروڈیوسر نے ڈائرکٹر کے کان میں کہا: ''یہ سب بند کرو۔ کمار جی کو دن بھر کی شوٹنگ کا دس ہزار دینا ہے۔ اور شارٹ اب تک ایک نہیں ہوا۔''

ڈائرکٹر نے چلا کر کہا: ''کٹ اِٹ۔''

ٹوسٹ ڈانس کرتے کرتے بچہ ایک دم رُک گیا جیسے اس کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

ڈائرکٹر نے پہلے اسسٹنٹ کو حکم دیا: ''کمار جی کو بلاؤ۔''

پہلے اسسٹنٹ نے دوسرے اسسٹنٹ کو حکم دیا: ''کمار جی سے کہو بچہ آ گیا ہے۔ شاٹ تیار ہے۔''

تیسرا اسسٹنٹ میک اپ روم کی طرف بھاگا۔

ہیرو نے اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی پوچھا: ''بچہ کہاں ہے؟''

ہری رنگ کی نیکر والے بچے نے ہیرو کو فوجی سلام مارتے ہوئے کہا:

''گڈ مارننگ! ہاؤ ڈو یو ڈو؟'' اور یہ کہہ کر ہیرو کی طرف دیکھ کر اتنے زور سے آنکھ ماری کہ ہیرو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ہیرو نے بچے سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا: ''کیوں پہلوان! کام کرو گے؟ گھبراؤ گے تو نہیں؟''

بچے نے تتلاتے ہوئے جواب دیا: ''گھبلائیں گے تو آپ۔'' اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہیرو نے کھسیانا ہو کر پوچھا: ''کیا اس آفت کے پرکالے کو مجھے گود میں اٹھانا ہوگا؟''

کیمرہ مین چلایا: ''ریڈی فار ٹیک۔''

مختلف آوازیں اسٹوڈیو میں گونجیں: ''ریڈی فار ٹیک۔ آل لائٹس، میک اپ، ہیئر ڈریسر، ساؤنڈ ٹسٹ۔

''ہیرو نے کہا: ''ٹھہرو بھائی! پہلے اس پہلوان کو اٹھا کر دیکھتا ہوں۔''

''ساؤنڈ اسٹارٹ۔'' ڈائرکٹر نے آواز دی۔

''کیمرہ۔'' ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی آواز آئی۔

''رننگ۔ (Running)'' کیمرہ مین نے اعلان کیا۔

ہیرو نے بچے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ بچے نے آنکھ ماری۔ ہیرو کی زبان سے نکلا: ''یہ بچہ بھی...... یہ بچہ بھی......'' اور پھر اس کے بجائے بچہ بولا: ''کیوں بیٹا! ڈائیلاگ بھول گئے نا؟''

ہیرو کو ایسا لگا جیسے اس کی گود میں آدمی کا بچہ نہ ہو، کسی راکھشس کا بچہ ہو اور اس نے ''کٹ اِٹ'' کہہ کر بچے کو اس کے باپ کی طرف پھینکا۔

اور سو پہلوان صاحب بھی دس دس روپے کے چھ نوٹ جیب میں ڈال کر بچے کا ہاتھ

پکڑے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تیسرا بچہ لایا گیا۔ اس نے شاٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ہیرو کے سوٹ پر پیشاب کر دیا۔ ہیرو نے کہا: ''میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔''

چوتھا بچہ لایا گیا۔ یہ دیکھنے میں بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ سب کو یقین تھا کہ اب شاٹ بخیر وخوبی ہو جائے گا۔ لیکن جیسے ہی ہیرو نے اسے گود میں لیا، بچہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ رو رو کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ بچے کو ماں کی گود میں واپس کر دیا گیا تو فوراً چپ ہو گیا۔ دوبارہ ہیرو کی گود میں دیا تو چپکے سے چلا گیا۔ لیکن جیسے ہی کیمرہ چلنا شروع ہوا، اور ہیرو نے ڈائیلاگ بولا، ''یہ بچہ بھی ......'' کہ بچے نے نہ صرف رونا شروع کر دیا بلکہ اپنے ننھے سے پاؤں سے اتنے زور کی لات ماری کہ ہیرو کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی — ہیرو نے فیصلہ سنا دیا:

''میں اس بچے کے ساتھ بھی کام نہیں کروں گا۔ یا تو سیدھا سادا چپ چاپ بچہ لاؤ، نہیں تو سین کینسل کرو۔ گھنٹہ بھر میں شوٹنگ شفٹ بھی ختم ہونے والی ہے۔''

سپلائر نے کہا: ''اب میں کب تک بچے لاتا رہوں۔ اس طرح تو ساری بمبئی کے بچے ختم ہو جائیں گے۔''

پروڈکشن منیجر نے کہا: ''تجھے کیا؟ تیری تو چاندی ہو رہی ہے......''

''اور تمھاری نہیں؟'' سپلائر نے چڑ کر کہا۔

''اچھا بھئی ہم دونوں کی۔ اب ایک چپ چاپ سا بچہ لے آ کہیں سے۔''

''میں تو جتنے فلمی بچوں کو جانتا تھا، سب کو لے آیا۔ ہر ماں اپنے بچے کو فلم میں کام کرنے نہیں بھیجتی۔ یہی دو چار لوگ ہیں جو اپنے بچوں کا دھندا کرتے ہیں۔''

''ارے بھئی پیسوں کی خاطر کوئی بھی اپنے بچے کا دھندا کر سکتا ہے۔''

یہ بات کرتے کرتے وہ اسٹوڈیو کے باہر نکل آئے تھے۔ جہاں ایک بھنگن سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔

''اری ذرا ٹھہر۔'' پروڈکشن منیجر چلایا: ''سارے میں مٹی اُڑا رہی ہے۔ یہ وقت ہے جھاڑو دینے کا۔ صبح سویرے کیوں نہیں جھاڑو دی؟''

''بابو جی آج مجھے دیر ہو گئی تھی۔''

''دیر ہو گئی تھی تو پگھار کٹے گی۔ کوئی مفت کام کرتی ہے کیا؟''

''بابو جی!'' بھنگن کام بند کر کے گڑ گڑاتی ہوئی بولی: ''میرا بچہ بیمار ہے۔''

''بیمار ہے، کیا بیمار ہے؟''

''بابو جی! پتہ نہیں کیا بیمار ہے۔ دس دن سے بکھار نہیں اترا۔''

''تو پھر ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتی؟''

''محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تھا بابو جی! دو روپے فیس بھی دی تھی۔ وہ کہے اسے بچوں والے بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ ان کی فیس بیس روپے ہے۔ پھر دوا انجکشن کے لیے بھی دام چاہئیں۔ اگلے مہینے کی پگھار مل جاتی — تو بچے کا الاج ہو جاتا۔''

''جا بچے کو لے آ۔ اس کے علاج کے لیے روپے مل جائیں گے۔ پورے چالیس۔'' اکسٹرا سپلائر نے پروڈکشن منیجر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

پروڈکشن منیجر بولا: ''اری تیرے بچے کا فلم میں فوٹو آ جائے گا کمار جی کے ساتھ اور پیسے بھی ملیں گے۔ جلدی سے لے آ۔''

''ابھی لاتی ہوں بابو جی......'' بھنگن نے جھاڑو ٹوکری پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر سن! بچہ روئے گا، چلائے گا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ چپ چاپ رہنا چاہیے۔''

بھنگن اسٹوڈیو کے پیچھے ہی ایک جھونپڑیوں کی بستی میں رہتی تھی۔ اپنی جھونپڑی میں جانے سے پہلے اس نے پڑوسن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کیا ہے چاؤلی؟''

''بچہ بہت روتا ہے بہن۔ مجھے کام پر جانا ہے۔ وہ دوا دے دو جو تم کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو دیتی ہو۔''

پڑوسن نے ایک پُڑیا پکڑا دی۔ ''بس تھوڑی سی پانی میں گھول کر دیجیو۔''

چاؤلی اپنے جھونپڑے میں گئی۔ بچہ جھینگا چارپائی پر اکیلا لیٹا رو رہا تھا۔ چاؤلی نے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ بدن جل رہا تھا۔ روئے ہی جا رہا تھا۔ چاؤلی نے بھینچ کر بچے کو پیار کیا۔ ''نا رو میرے لال۔ چل میں تجھے فلم کمپنی میں لے چلتی ہوں۔ میرا بیٹا فلم کا ہیرو بنے گا۔ پھر تجھے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔''

''نا رو میرے لال...... نہ رو۔'' یہ کہہ کر اس نے پانی میں گھلی ہوئی کالی کالی دوا بچے کو چٹا دی۔ بچہ روتے روتے ہلکان ہو کر اب ہچکیاں لینے لگا تھا۔ ہچکیاں لیتے لیتے نڈھال ہو کر سو گیا۔

چاؤلی نے بچے کو چیتھڑوں میں لپیٹا اور اسٹوڈیو کی طرف چل دی۔

ایکسٹرا سپلائر نے کہا: ''روئے گا تو نہیں؟''

چاؤلی نے کہا: ''نہیں، بابو جی! مجے سے سو رہا ہے۔''

ڈائرکٹر نے پوچھا: ''اے یہ روئے گا تو نہیں۔''

پروڈکشن منیجر نے کہا: ''نہیں صاحب! بڑا شریف بچہ ہے۔ ماں کا دودھ پی کر مزے سے سو رہا ہے۔ آپ جتنے چاہیں شاٹ لیجیے۔''

ہیرو نے بچے کو گود میں لینے سے پہلے پوچھا: ''روئے گا تو نہیں؟''

''نہیں کمار جی۔'' ڈائرکٹر نے اسے یقین دلایا۔ ''بڑا خاموش بچہ تلاش کر کے منگوایا ہے۔''

ہیرو نے بچے کو گود میں لے لیا اور سوچا: ''شکر ہے اس کا وزن زیادہ نہیں ہے۔'' پھر وہ بولا:

''جلدی شاٹ لے لو۔ ابھی تو سو رہا ہے۔ اٹھ گیا تو یہ بھی ناک میں دم کرے گا۔''

''ریڈی فار ٹیک۔''

''ریڈی فار ٹیک۔''

''آل لائٹس۔''

''ساؤنڈ ریڈی۔''

''اسٹارٹ ساؤنڈ۔''

''کیمرہ۔''

''رننگ کلیپ''

''ماں کا دل، سین نمبر ۵۵، شاٹ نمبر سیون، ٹیک نمبر فور۔''

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کے چہرے کو دیکھا۔ بچہ اطمینان سے آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ اس کے معصوم چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ہیرو نے کیمرہ کی طرف دیکھ کر دل کی گہرائی سے آواز نکالی: ''یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔''

شاٹ کٹ ہو گیا۔ مگر کیمرہ مین نے کہا ایک ٹیک اور چاہیے۔ بچے کے چہرے پر روشنی ٹھیک نہیں پڑی تھی۔

ایک اور بار شاٹ دہرایا گیا۔ ایک بار پھر ہیرو نے کہا: ''یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔''

اسی وقت ایک ہوائی جہاز اسٹوڈیو کے اوپر سے گونجتا ہوا گزر گیا۔ لاؤڈ سپیکر میں سے ساؤنڈ

رکارڈسٹ کی آواز آئی: ''کٹ کٹ۔'' ہوائی جہاز۔

کسی نہ کسی وجہ سے تین بار اور شاٹ دہرایا گیا۔ ٹیک نمبر نو کو 'او کے'' کیا گیا۔

ہیرو نے بچے کو پروڈکشن منیجر کے حوالے کیا۔ بچہ اب بھی سو رہا تھا۔

پروڈکشن منیجر نے بچہ اکسٹرا سپلائر کی گود میں دیا۔

اکسٹرا سپلائر نے چاؤلی کی گود میں بچہ دیا اور ساتھ ہی چالیس روپے دے کر اس سے پچھتر روپے کی رسید پر انگوٹھا لگوالیا۔

''جا اب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا اور اچھی طرح علاج کروا۔''

''بابو جی! سیدھی وہیں جاتی ہوں۔ ٹیکسی کر کے۔ آپ کی کرپا سے اس کا الاج ہو جائے گا۔ آپ کے بچے جئیں۔

بچوں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے سکریٹری نے پہلے فیس لے لی۔ پھر ڈاکٹر نے بچے کا معائنہ کیا۔

''مگر یہ تو مر چکا ہے۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ لگاتے ہی کہا۔ اور چاؤلی کو ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے۔ پھر بھی وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی: ''ڈاکٹر صاحب! کیا ہوا میرے لال کو؟ اسے تو صرف بکھار آ رہا تھا۔''

''بخار سے نہیں، لگتا ہے تمھارا بچہ زہر سے مرا ہے۔ کیا دیا تھا اسے کھانے کو؟''

''کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب! جرا سی افیم دی تھی چپ کرانے کو۔''

....

سال بھر بعد ''ماں کا دل'' کی سلور جبلی کے موقع پر ایک بڑے نیتا نے تقریر کرتے ہوئے کہا: ''میں اس فلم کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ہیرو اور ہیروئن کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی فلم میں سچ مچ ایک ہندوستانی ماں کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔''

☆☆☆

زعفران کے پھول

''آؤ مسافر! یہاں اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں۔ وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمھاری...... ؟ پنکچر ہوگیا ہے...... ؟ کوئی بات نہیں۔ اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے۔ اب بیس کوس کی تو بات ہی ہے......نہیں بیٹا! مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہیے اور پھر پیسہ لے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون...... ؟ اکیلی جان ہوں؟ ذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں۔ چشمے سے پانی بھرتی ہوں۔ دھان کوٹ دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے۔ پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی۔ اور چاہیے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن......تم بھی کہتے ہوگے کس بکواس سے پالا پڑ گیا ہے......''

''کیا کہا تم نے بیٹا......! نہیں نہیں، گلِ لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے......ٹھیک کہتے ہو۔ زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں......اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان، خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں......

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے......؟ ابھی تمھاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی......موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں۔ بیٹا! پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آجائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر مہکے گی۔ اور تمھاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے، زعفران کا

رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟...... پر کوئی نہ بتا پائے گا کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہونا......؟ دیوانی بڑھیا، جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے...... ہے نا......؟ پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟...... یا ابھی تمھاری موٹر کے ٹھیک ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سُن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟...... خیر جو بھی ہو، سننا چاہتے ہو تو سنو......

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں۔ پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار آ جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلھن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوئی ہے۔

تمھاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا...... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بے چارہ کھیت میں جا کر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے۔ جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا:

''عجیب بات ہے کوئی بھی نہیں آئی۔''

میں نے پوچھا: ''کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو؟''

تو جواب ملا:

''ہنسی، ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے۔ حالانکہ کتابوں میں تو......''

تو بیٹا تب پتہ چلا کہ بے چارہ کتابوں میں پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آ گئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا ہو گیا مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آ گئی اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا۔ کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے

مارے بُرا حال تھا۔

......میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی...... بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں...... ہاں تو زعفرانی...... کیا کہا...... زعفرانی کون؟...... ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی...... نہیں بتایا تھا؟...... بھول گئی ہوں گی...... لو دیکھ لو، یاد کا یہ حال ہے بیٹا...... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی۔ لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ کدال مچایا کرتی تھی۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے۔ زعفرانی! زعفرانی!!...... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں...... ہاں تو جب وہ جوان ہوگئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں۔ مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی وبصورتی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تو دُبلی تھی جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لڑکی بچے کیسے جنے گی؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو، دیدے پھٹے ہوئے۔ اوپر سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں۔ نہ چھوٹے کا خیال، نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی سے مطلب۔ میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی۔ وہ بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا۔ میں سوچتی، ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا؟ پر وہاں تو جس کو دیکھو، وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تُلا ہوا تھا...... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا......

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ بھلا ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون سا بر مل سکتا تھا؟...... میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کُھل گئی...... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہوگیا۔ خدا اسے جنت نصیب کرے۔ اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہوگئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہوگئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے، میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم بچی کو کون بیاہے گا؟

......سیکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بُری۔کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں۔کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں۔کبھی برف میں تباہ ہوجاتی ہیں۔کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں، کبھی دوسرے کی۔قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔اور بیٹا! کبھی کبھی راجا کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔پر راجہ پرجا کا کیا مقابلہ۔صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہوتی جاتی ہے۔مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے۔......کئی برس کی بات ہے، ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا نورو چلّاتا ہوا آیا:

''ماں! ماں! شیر کشمیر آئے ہیں شیر کشمیر۔''

بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا۔میں چلّاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جاکے بندوق لے کے آویں......تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو......کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچّے، بھاگے چلے جارہے ہیں۔میں نے سوچا، شیر کو پکڑلیا ہوگا، تبھی تو عورتیں بچّے بھی نڈر ہوکر جارہے ہیں۔چلو میں بھی تماشہ دیکھوں.........

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔گاؤں کے اس سرے پر......اے وہ دیکھو۔ان درختوں کے پیچھے......ایک اسکول ہے......اب تو مڈل کا ہوگیا ہے۔پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی——ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔اور سامنے نہ شیر نہ چیتا۔ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔لوجی، یہ تھا وہ شیر کشمیر......! میں نے کہا: ''لوخواہ مخواہ ہی ڈرایا۔شیر تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں؟ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کررہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہوگا۔اب تھوڑی دیر میں کالا توا رکھ کے بھونپو والا باجا بجائے گا۔پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا۔اسی انتظار میں، میں بھی وہاں جاکر کھڑی ہوگئی۔پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا۔اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔یا اللہ! اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔وہ باتیں ہی ایسی کررہا تھا کہ دل دہل جائے۔ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔آپس میں ایک ہوجانا چاہیے۔لڑکوں لڑکیوں کو پڑھانا چاہیے۔پڑھ لکھ

کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جاکے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے، وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھے بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں......

تم تو جانتے ہی ہو تالاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو، سارے پانی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام اور چین، صلح، شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین، جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت۔ ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں، اس کو بدلنے پر تلا ہوا۔ میں کہتی ہوں ارے تمھارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمریں انھیں راجوں مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے، روکھی سوکھی کھا کر صبر سے کاٹ دیں۔ تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تلے ہوئے ہو...... پر میری کون سنتا ہے بیٹا...... وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا۔ تم میری باتوں سے اکتا گئے نا......؟ وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں، ہاں بیٹا۔ اس کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کہتے ہوگے یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ زعفران کے پھول لال ہوتے...... یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں۔ پر تم بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا ہے اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے۔ اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پر تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو۔ غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے آگے میرے لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سناٹا چھٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا۔ نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے..........

.... جب تک باپ زندہ رہا، تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے۔ اس کا مرنا تھا کہ جس کا

جدھر منہ اٹھا، ادھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی۔ بڑا غلام نبی کہنے لگا، میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا، چکلا سینہ تھا اس کا۔ چھ مہینے بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہوگیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ماتھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڈھا، جہاں بوجھا سنبھالنے کے لیے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانستا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہوگئی تیری۔ کیا بیمار ہے؟ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اٹھانے والوں کے ماتھے پر ایسا گڈھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش ہوگئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہوگئی ہے...... چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا نورو بھی ساتھ ہولیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا تو لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نورو کو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آکر کہا غلام نبی کی ماں! اب تمھاری خیر نہیں۔ تمھارا منجھلا بیٹا نورو شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں کشتی چلاتا ہے رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جا جا کے تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا بی مینڈ کی کو بھی زکام ہوا۔ وہ شیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کسان کے چھوکرے کو دیکھو، یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا نہ میں اس کی ماں......

............زعفرانی؟ تو اس کا ذکر کرنا ہی بھول گئی۔ تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی گیا تھا کون۔ بس میں، زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں۔ اور یہاں آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سنا، سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہوگئی تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھو۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے، کبھی پانی بھرتے، کبھی اون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولھا جلتا۔ میں نے کہا غفورا! دس برس کا ہوگیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پر لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں! ہم تو غفورا کو پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہوگئی ہے۔ پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا، مدرسے میں داخل کروا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں؟ پھر اس کے

بیاہ نہ ہونے کا بھی دکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہوگئی۔ مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے۔ اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی...... پر بیٹا اس لونڈیا پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا۔ دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی...... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے۔

......جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ بیس اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل وصورت میں حور کا بچہ نہیں تھی تو وہ کانی بھینگی، چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جانو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے سینما (بائسکوپ) ناچ رنگ، نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کتنے آوارہ ہوگئے ہیں۔ ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آرہی ہے۔ زاروقطار روتے ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ تو کچھ جواب نہیں دیا۔ روئے چلی جا رہی ہے۔ اری کم بخت! کچھ کہے گی بھی کیا ہوا؟ کسی نے مارا، گالی دی۔، چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا؟ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی۔ بیٹا، بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ کہنے لگی:

''ماں! میرا بیاہ کردو۔'' اور پھر رونے لگی۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے، ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر اگا اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بدارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہول دل میں تھی۔ میں ابھی تک پتے کی طرح تھرتھر کانپ رہی تھی اور رورہی تھی جب ذرا ہچکیاں رکتیں تو یہی کہتی:

''ماں! میرا بیاہ کردو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی......''

اب تم ہی بولو بیٹا! غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے...... پھر بھی میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے تو یہ فکر دور ہو جائے۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زمین زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن ایک آدمی آیا۔ شکل وصورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ وہی ماتھے پر پٹے کا نشان۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی۔

پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا:

''غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمد و۔'' یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوں گے۔ وہ بولا:

''غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کر دیں۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمد و کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''غلام نبی کا کیا حال ہے؟ وہ نہیں آیا؟''

محمد و کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوئی۔ ٹھہر ٹھہر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

''ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اسے دق ہوگئی تھی۔'' اور بس چپ ہو گیا۔

...... بیٹا تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے...... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو، ماں نو مہینے بچّے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچّہ اس کے خون، اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے۔

میرا تو جو حال ہوا سو ہوا، زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا۔ چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی فکر اور بھی پڑ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار رہتی کہ پڑھ۔ تختی لکھ، مدرسے کا کام کر۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی۔ جیسے اسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اسے نہ جانے کیوں......؟

ہاں اور محمد و کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری ایام کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔

کب اور کیسے بیمار پڑا؟ علاج ہوا یا نہیں؟ کیا سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟

اور جب محمد و نے کہا:

''ہاں بہت سوں کو۔'' تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا:

''تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟...... نہ جانے کیوں......

......میرے کہنے سے محمد و ہمارے ہاں تین دن اور ٹھہرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا:

''کیوں محمد و! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟''

وہ بولا:

''چھوڑ کر کیا کروں گا ماں جی؟ اور کوئی کام آتا نہیں ہے۔ اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے، نہ ماں نہ باپ۔''

میں نے جلدی سے پوچھا:

''اور بیوی؟''

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''کب کی مرگئی۔''

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں۔ پر میں نے کہا:

''دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟''

اس کو تین دن میں، میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھریاں پڑ گئیں۔

''مجھ سے کون بیاہ کرے گا ماں جی؟''

......تو بیٹا یوں زعفرانی کا بیاہ محمد و سے طے پایا۔

............کیا کہا؟ زعفرانی کی رائے؟ بیٹا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں؟ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمد و اسے بیاہنے آئے گا تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سن کر خوش ہوگئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں...... پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہوگئی ہے۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بیٹا آخر ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو

دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمدو آنے والا تھا، اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھول دار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کی کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اسی شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دیں ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر ویر سے ڈرے میری بلا۔ پر اور عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے سوچا میں ہی کیوں نکو بنوں۔ سو میں نے بھی سلوالی......

اتنا غصہ آیا مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکا یک سارے گاؤں میں شور مچ گیا ''شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے۔'' مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا...... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا...... پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آوازیں ہوئیں تو یہ سوچ کر کہ شاید محمدو اور اس کے ساتھی برات لائے ہوں گے، مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا، لیے ''شیر کشمیر زندہ باد، ڈوگرا راج! مُردہ باد'' کہتے پھر رہے تھے اور ہمارا نورو چھے اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا اور زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا ''ک ش م ی ر چھوڑ دو......'' اور زعفرانی دروازے پر کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اس نے ایک بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

.... ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلّانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی اور اس میں سے سپاہی کود کر بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے۔ میں دیوار کی طرف دوڑی جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا ہوا کھریا مٹی سے لکھ رہا تھا۔ غفورا اب نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا۔ میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی اور

بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انھیں حرفوں کو دہراتے رہے جنھیں وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا: ''ک ش م ی'' اور ابھی 'ر' نہیں کہہ پایا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی لی اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی...........

...........اور اس کے بعد کیا ہوا بیٹا یہ مجھے ایسا یاد ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو، جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو، مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جائے......

......زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ملتی جلتی ہوا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں...... آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی......اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس مردوں سے آگے عورتیں اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ۔ اور یہ سارا مجمع گاتا ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمھاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھیں اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف، زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

......ایک تڑاخہ۔ دس بارہ تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے۔ اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے۔ میں ادھر بھاگی۔ پر جب تک میں پہنچوں، زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی۔ عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کے بجائے خون......خون مٹی میں مل رہا تھا۔

اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پر مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا:

''میرا بیاہ ہو گیا ماں!''

......یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گلِ لالہ کی طرح سرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔

......سنی بیٹا تم نے میری کہانی۔ پر تم کہاں ہو؟...... چلے گئے نا تم......؟ میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمھاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سن پاؤ گے۔

......موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں بیٹا! پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندیں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر سے مہکے گی اور تمھاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے کہ: ''اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے؟'' ...... پر کوئی نہ بتا پائے گا کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔''

☆☆☆

آئینہ خانے میں

ساٹھ برس تک وہ مجھ سے کتراتا رہا۔ مگر پھر آخر ایک دن ہمارا آمنا سامنا ہو ہی گیا۔

میں نے کہا: ''بات کیا ہے؟ میں نے تو کبھی تمھیں قرض نہیں دیا۔ پھر ہمیشہ کیوں مجھ سے آنکھیں چراتے ہو؟''

اس نے کہا: ''میں تم سے شرماتا بھی ہوں، ڈرتا بھی ہوں۔ مگر میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتا ہوں تو صرف تم سے۔ محبت کیا ہے اور نفرت کیا ہے؟ سچ پوچھو تو یہ بھی نہیں معلوم۔ محبت اور نفرت دونوں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ شاید اسی لیے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سمجھتے ہو میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''آج مل ہی گئے ہو تو دو دو باتیں ہو جائیں۔ میں تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ سب کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔''

''یوں کہو میرے ڈھول کا پول کھولنا چاہتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''تب ہی تو میں تمھارا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ کیوں دنیا کے سامنے میری مٹی پلید کرنا چاہتے ہو؟ بہت سے ایسے چہرے ہیں جن پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔''

''مگر میں نے تو کبھی کسی آئینے پر پردہ پڑا نہیں دیکھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں دبلا آدمی موٹا نظر آتا ہے، دوسرا آئینہ ہوتا ہے جس میں چھوٹے قد کا آدمی لمبا دکھائی دیتا ہے۔ بدصورت سے بدصورت آدمی کو آئینے میں اپنا چہرہ خوبصورت ہی لگتا ہے۔ اگر آئینے سچ بولتے تو دنیا میں ایک آئینہ بھی نہ بچتا۔ سب چکنا چور کر دیے جاتے۔''

اس نے کہا: ''تو پھر مجھے بھی ایک آئینہ سمجھو۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو پھر بتاؤ کیا دکھائی دیتا ہے؟''

وہ ایک چھوٹے قد کا گنجا سا آدمی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، آنکھوں کے گرد

کالے کالے حلقے جیسے کتنی ہی راتوں سے نہ سویا ہو۔ چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں تونہیں ہیں مگر ماتھے پر گہری لکیریں بتارہی ہیں کہ غم کے کتنے ہی طوفان اس پر سے گذر گئے ہیں جیسے اس کی زندگی کا ہر برس سات سوتیں دن کا گذرا ہو۔

میں نے پوچھا: ''تم اسے پہچانتے ہو؟ پہلے کبھی دیکھا ہے اسے؟''

اس نے کہا: ''صورت جانی پہچانی لگتی ہے مگر یادنہیں آتا کہاں اور کب دیکھا ہے؟

میں نے کہا: ''غور سے دیکھو۔ کہیں آئینے میں اپنی صورت تونہیں دیکھ رہے ہو؟''

اس نے کہا: ''لاحول ولاقوۃ! کیا تم مجھے اتنا بدصورت سمجھتے ہو؟ انٹلکچولز کی طرح میرا ماتھا اونچا ضرور ہے مگر میں گنجانہیں ہوں۔ مانا کہ بیل جیسے دیدے نہیں ہیں میرے، مگر آنکھیں اتنی چھوٹی بھی نہیں ہیں جیسے کسی نے ریت میں تھوک دیا ہو۔نہیں جی۔ میں اس گنجے کھوسٹ کونہیں جانتا۔''

میں نے کہا: ''دوست! یہی تو مشکل ہے۔ انسان چاند کا جغرافیہ جانتا ہے مگر اپنا چوکھٹا نہیں پہچانتا۔''

وہ چڑ کر بولا: ''کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔ میں تو تمھاری زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔''

''کیوں؟''

''ایک مضمون لکھنا ہے۔ اپنے بارے میں۔ مطلب یہ کہ تمھارے بارے میں۔''

''کیا اس مضمون کے پیسے ملیں گے؟''

''شاید۔''

''تو یوں کہو مجھے بیچنا چاہتے ہو اور سب تو بیچ چکے ہو۔ اپنا قلم، اپنا دماغ۔ سنا ہے اپنا دل بھی کئی بار گروی رکھ چکے ہو۔ اب رہ کیا گیا ہے؟ چلو مجھے بھی بیچ ڈالو۔''

''تو پھر اپنے حالات زندگی بتاؤ۔''

''تاریخ پیدائش جون ۱۹۱۴ء۔ تاریخ وفات ابھی معلوم نہیں۔''

''ان دو تاریخوں کے درمیان کیا ہوا؟''

''سچ بتاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بالکل سچ!''

''سچ تو یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ میری ہستی سے دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ کوئی لیلیٰ مجنوں جیسا لازوال عشق نہیں ہوا۔ کوئی لافانی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آرٹ کا کوئی شاہکار تخلیق نہیں ہوا۔ کوئی نیا براعظم دریافت نہیں ہوا۔''

''تو پھر ساٹھ برس کی عمر میں تم نے کیا کیا؟''

''جھک ماری۔ پچاس ہزار گھنٹے دوستوں کے ساتھ گپ ماری۔ پچاس ہزار چائے کی پیالیاں پیں۔ ایک لاکھ سفید کاغذ کے ورق سیاہ کیے۔ پندرہ ہزار گھنٹے سنیما کے اندھیرے میں کاٹے۔ سوا سو فاؤنٹین پین خریدے گھسے اور کھوئے۔ سات ٹائپ رائٹروں کو پیٹ پیٹ کر کھٹارہ بنادیا۔ پانی پت، علی گڑھ، دہلی اور بمبئی، ہانگ کانگ، شنگھائی، ٹوکیو، پیکنگ، لندن، پیرس، نیویارک اور ماسکو کی سڑکیں ناپیں۔''

''اس سب اوٹ پٹانگ پروگرام سے تو یہ پتا نہیں چلتا کہ تم کرتے کیا رہے؟ آخر تمھارا پیشہ کیا ہے؟''

''ادیب اور نقاد کہتے ہیں۔ ایک اخبارچی ہوں۔ جرنلسٹ کہتے ہیں میں فلم والا ہوں۔ فلم والے کہتے ہیں میں ایک سیاسی پروپیگنڈسٹ ہوں۔ سیاست داں کہتے ہیں میں کمیونسٹ ہوں۔ کمیونسٹ کہتے ہیں میں بورژوا ہوں......''

''مگر تم سچ مچ کیا ہو؟''

''کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟ سچ یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں۔''

''پھر بھی سنا ہے کہ تم نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔''

''یہ الزام تو لگایا گیا ہے مگر آپ ثابت نہیں کرسکتے۔ ایک تنقید نگار نے تو میری کتاب پڑھ کر فتویٰ دے دیا تھا کہ کتاب میں نے کسی اور سے لکھوا کر اپنے نام سے چھپوادی ہے۔''

''سنا ہے تم نے کئی فلمیں بھی بنائی ہیں۔''

''آہستہ بولو۔ کہیں کوئی فنانسر نہ سن لے۔ اور ڈگری لے کر میرا پلنگ اور تین کرسیاں اور ستائیس من پرانی کتابیں اور سترہ من ردّی کاغذ قرقی کرنے نہ آجائے۔''

''اچھا یہ بتاؤ تمھارے دل کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟''

''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔'' دل چاہتا ہے کہ میرے سر پر گھنے سیاہ بال اُگ آئیں اور ایک بار میں پھر جوان ہو جاؤں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ٹالسٹائی کے ''وار اینڈ پیس'' جیسا ناول لکھ دوں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ایک ایسی فلم بنادوں، جس کا ساری دنیا میں چرچا ہو۔ دل چاہتا ہے میں ماؤنٹ ایوریسٹ پر چڑھ جاؤں۔ اسپوتنک میں بیٹھ کر چاند کی سیر کر آؤں۔ دل چاہتا ہے کہ میرے پاس ایک خاص کمرہ ہو جس میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں ہوں اور ایک ریڈیو گرام ہو اور دنیا کی بہترن موسیقی کے ریکارڈ ہوں اور زمین پر چٹائی کا فرش ہو اور لیٹنے کے لیے ایک گدّا ہو۔ ایک بجلی کا سمادار ہو جس میں ہر وقت چائے بنتی رہے۔ کئی فاؤنٹین پین ہوں، بہت بڑی روشنائی کی بوتل ہو اور سوریم کاغذ ہو اور وقت ہو — اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لیے، اپنی پسند کی کتابیں اور کہانیاں لکھنے کے لیے، اپنے خاص دوستوں سے گپ کرنے کے لیے، سونے کے لیے وقت ہو اور کبھی کبھی سوچنے کے لیے بھی وقت ہو۔''

تو پھر یہ بتاؤ کہ تم نے لکھنا کب شروع کیا اور کیوں؟''

''میں نے لکھنا شروع کیا جب میں کالج میں پڑھتا تھا، مگر کیوں؟ اس کی وجہیں تین تھیں۔ میرا اُٹھگنا قد اور دُبلا پتلا جسم، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس میں سب سے بُرا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا اور یونیورسٹی میں صرف کھلاڑیوں ہی کی قدر کی جاتی تھی۔ مگر میرا جی چاہتا تھا کہ میرا بھی نوٹس لیا جائے۔ میں بھی کوئی ایسا کام کروں کہ یونیورسٹی میں میرا چرچا ہو۔ سو میں نے یونین کی ڈبیٹس میں حصہ لینا شروع کیا۔ پھر یونیورسٹی میگزین میں لکھنا شروع کیا۔ پھر افسانے لکھے...... پھر کتابیں......

دوسری وجہ — برٹش سامراج جس نے مجھے پہلے مقرر کیا، پھر جرنلسٹ اور پھر مصنف بنادیا۔ جلیانوالہ باغ والے قتل عام سے اگلے برس کا ذکر ہے۔ میں شاید پانچ چھے برس کا تھا۔ جب ہمارے قصبے کے سینکڑوں بچوں کو جرنیلی سڑک کے کنارے کھڑا کیا گیا، صبح سے شام تک سڑک پر فوج کے گھوڑسوار رسالے گذرتے رہے اور لال منہ کے انگریز، سپاہی، ان کی بندوقیں، رائفلیں، سنگین مشین گنیں، توپیں دیکھ کر بچوں کے دل دہلتے رہے۔ اور یہی اس پریڈ کا مقصد تھا کہ بچوں کے دل میں سامراج کی فوجی طاقت کی دہشت بٹھادی جائے۔ مگر نتیجہ اس کا الٹا نکلا۔ ایسی ہی ایک پریڈ پنجاب کے ایک اور قصبے میں ہوئی تھی۔ ایک بچے کے دل میں انگریزی سامراج کے لیے ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ بڑا ہو کر وہ دہشت پسند انقلابی بن گیا۔ اس کا نام تھا بھگت سنگھ۔ ہزارں

اور بچوں نے بڑے ہوکر کسی انگریز پر پستول تو نہیں چلایا مگران کے دلوں میں بھی انقلابی، سیاسی خیالات پروان چڑھتے رہے۔ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں کمزور تھا۔پستول اور بم نہیں چلاسکتا تھا۔میں نے سوچا سامراج کے خلاف میرا ہتھیار میری آواز ہوگی۔میرا قلم ہوگا۔

تیسری وجہ — اٹھارہ برس کی عمر میں مجھے کسی سے محبت ہوگئی اور باوجود اور بہت سی محبتوں کے وہ پہلی محبت بیالیس برس بعد اب بھی جوان ہے اور اکیس برس کی عمر میں مجھے اس محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ایسی حالت میں ناکام عاشق کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں۔یا تو وہ خودکشی کرتا ہے۔(مگر میں موت سے ڈرتا تھا اور اب بھی ڈرتا ہوں) یا وہ شاعری کرتا ہے اور شراب پیتا ہے۔(مگر مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور شراب مجھے کڑوی اور بدبودار لگتی تھی) اور یا وہ افسانے لکھتا ہے اور ان افسانوں میں اپنے ناکام عشق کی داستان کو ڈھال کر اپنے گھائل دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔(اور سو یہی میں نے کیا)

میں نے پوچھا:''تو کیا تم سمجھتے ہو ہر ناکام عاشق افسانہ نگار بن سکتا ہے؟''

اس نے جواب دیا:''ہر ایک ناکام عاشق افسانہ نگار نہیں بن سکتا مگر اس کو افسانہ نگار بنانے میں اس کی محبت کی ناکامی بھی مدد کرسکتی ہے۔اسی لیے میں نے اپنے قلمکار بننے کی تین وجہیں بتائی ہیں۔ان تینوں کو اپنے ذاتی معاملے سے ہٹا کر ایک عام اصول کی طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ادب کی تخلیق کے تین محرک ہوسکتے ہیں۔لکھنے والے کی اپنی انفرادیت اور خودی — اس کے اپنے جذباتی تجربات وحادثات اور اس کا سماجی،اقتصادی اور سیاسی ماحول —''

میں نے کہا:''تم اپنی کہانیوں اور ناولوں میں سماجی اور اقتصادی اور سیاسی ماحول پر اتنا زور دیتے ہو،شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں تم محض ایک جرنلسٹ ہو،ادیب نہیں ہو۔''

میری تخلیقات پر لوگ جو چاہیں لیبل لگائیں مگر وہ وہی ہیں (اور وہی ہوسکتی ہیں) جو میں ہوں۔اور میں جو بھی ہوں، وہ جادو یا کسی معجزے کا نتیجہ نہیں ہے۔ایک انسان اور اس کے سماج کے عمل اور ردعمل سے تخلیق ہوا ہے۔انسان کا کیریکٹر ہی نہیں اس کی قسمت بھی داخلیت اور خارجیت دونوں کے تانے بانے سے بنتی ہے اور اس حقیقت سے کوئی نہیں انکار کرسکتا چاہے وہ مارکس کا چیلا ہو یا فرائڈ کا پیرو۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں نفسیات کا تانا زیادہ اہم ہے یا معاشیات کا بانا۔

اب میں اس کی باتوں سے خاصا بور ہوچکا تھا۔اس لیے میں نے انٹرویو کا آخری سوال

پوچھا: ''کیا تم کوئی واقعہ بتا سکتے ہو جس کا تمھارے کیریکٹر اور زندگی پر گہرا اثر پڑا ہو؟''
ایسے تو ہزاروں واقعات ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں ہر روز کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا واقعہ ہوتا ہے جو بظاہر ہم بھول جاتے ہیں۔مگر جو دل و دماغ پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑ جاتا ہے ان سب کو یاد کرنے بیان کرنے کے لیے تو پوری کتاب چاہیے پھر بھی وہ فوجی پریڈ والا واقعہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ایک اور سنائے دیتا ہو۔چاہے تو اسے ایک کہانی سمجھ لو— مگر یہ ایک سچی کہانی ہے، جس کا عنوان ہے:

اندھیرے کا ہمراہی

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۷ء جب آزاد ہندستان اور آزاد پاکستان میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔
شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے، وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر محفوظ مسلم علاقوں میں چلے گئے۔صرف میں اور میری بیوی مجی اپنے سمندر کے کنارے والے فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔
چند سنگھی سورماؤں اور لیگی مجاہدوں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔لیکن مجی نے (جو آج دنیا میں نہیں ہے) کہا اگر شیواجی پارک میں ہمارے لیے زندہ رہنا ناممکن ہے تو پھر زندہ رہنا ہی بیکار ہے اور سو ہم وہیں رہے۔
میں ان دنوں ''بمبئی کرانیکل'' اخبار میں کام کرتا تھا— ایک رات کو میں دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا۔دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔کرفیو لگا دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔
راستے میں دادر کی ایک اندھیری گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آرہا ہے۔(میں فطرتاً کوئی بہادر نہیں ہوں۔اگر میں اس خطرناک زمانے میں اندھیرے اجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا) میں نے سوچا آج میری موت آگئی۔مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آگیا ہے، میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ایک لمحے کے لیے

وہ بے چارہ ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لیے میں نے پوچھا: ''کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟''

اس نے کہا: ''ہاں نو بجے کا کرفیو ہے اِدھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔''

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

''کیوں بھئی! تم کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''شیواجی پارک — اور تم؟''

''میں بھی شیواجی پارک۔''

''وہاں رہتے ہو کیا؟''

''ہاں۔''

''کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمھارا؟''

میں اس سوال کا انتظار کر ہی رہا تھا اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے وسنت ڈیسائی ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔، اس سے تو اسے شبہ کیا، یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔''

سو میں نے کہا: ''میرا نام احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔''

اس نے کہا: ''تم پیپر میں کام کرتے ہو نا؟''

''میں نے کہا: ''ہاں، بمبئی کرانیکل میں۔''

''اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟''

میں نے کہا: ''کئی برس سے ہم یہیں رہتے ہیں۔''

اور اتنے میں ہم پولیس کے سپاہیوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں کرفیو نہیں تھا۔

میرے ہمراہی نے کہا: میٹنگ میں چل رہے ہو عباس بھائی؟''

میں نے پوچھا: ''کون سی میٹنگ؟''

''سُورکشن دل بنا رہے ہیں۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے۔''

میں نے کہا: ''چلو ضرور چلتا ہوں۔''

سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں شریک ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے۔

''آؤ آؤ عباس بھائی آؤ!''

چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک سُورَکشن دل بنایا جائے۔ کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چُنا گیا تھا اس کا نام تھا خواجہ احمد عباس۔''

اور جن لوگوں نے میرے نام پر اپنے ہاتھ اٹھائے ان میں وہ بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھتا تھا۔

میں نے سوچا جلسے کے بعد اس سے ملوں گا مگر جلسے کے بعد جو افراتفری ہوئی ہے اس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ مگر اس آدمی نے میری زندگی کے ایک نہایت نازک موقعے پر انسانیت میں میرا اعتقاد (جو اس وقت ڈگمگا سکتا تھا) پھر مستحکم کر دیا اور اپنی یادوں کے اندھیرے میں اب بھی اس گمنام انجانے ہمراہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

''کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمھارا؟''

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں:

''احمد عباس، خواجہ احمد عباس'' جو ساٹھ برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ میرے پڑنانا تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالی، جن کی ''مسدس حالی'' کے تین سو اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ لیکن جنھوں نے کبھی اپنے لیے یا اپنی اولاد کے لیے اس کی رائلٹی کا ایک پیسہ نہیں لیا۔ کیونکہ وہ کتاب انھوں نے قوم کو جگانے کے لیے لکھی تھی۔ اس کی بکری سے پیسے بنانے کے لیے نہیں۔ اور میرے باپ تھے خواجہ غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا۔ کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا۔ جنھوں نے ایک بار گھر کے نوکر چھوکرے کو ''الو کا پٹھا'' کہنے کی یہ سزا دی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بنا کھانا پانی کے بند کر دیا تھا۔ جب تک میں نے ہاتھ جوڑ کر اس لڑکے سے معافی نہ مانگی تھی۔ اور اس طرح انھوں نے مجھے سکھایا کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہے۔ اور جنھوں نے مرتے دم میرے لیے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی۔ سوائے انسانیت

کے چند اصولوں کے اور میری والدہ تھیں سرورۃ النساء بیگم، جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہوئی تھیں۔ لیکن جو آخری دم تک تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا شکار نہ ہوئیں اور فسادات کے دنوں میں کتنی ہی تکلیفیں اٹھا کر بھی انسان دوستی کا دامن نہ چھوڑا۔ مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی بھی اولاد ہوں۔ میرے عزیز اور رشتے دار پاکستان میں تو ہیں ہی، مگر انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں — امریکہ اور روس میں، انگلستان، چین اور جاپان میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا کہ ایک یوروپین شاعر جان ڈون نے کہا ہے ؂

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے
ہرانسان زمین کا ایک ذرہ ہے
ہر انسان کی موت میری موت ہے"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

تب میں نے کہا: "بے شک ساری انسانیت تمھارے اندر سمائی ہوئی ہے۔ لیکن نہ بھولو کہ اور کسی سے زیادہ تم پر میرا حق ہے۔ اگر تم نے کبھی مجھے اپنے آپ سے جدا کیا تو تم کروڑوں میں سے صرف ایک اکائی رہ جاؤ گے۔ انسانیت عظیم ہے اس لیے ہر انسان کی ایک خودی ہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس خودی میں خدائی بھی ہے لیکن تم بھی اتنا تو مانو گے کہ انسان میں خودی ہے اور ہر خودی میں ایک انسان ہے۔ یعنی تم میں میں ہوں جیسے مجھ میں تم ہو۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس نے میری آنکھوں میں اور پھر وہ میری نگاہ کے آئینے میں ایسے کھو گیا جیسے "میں" اور "وہ" کبھی الگ ہوئے ہی نہیں تھے۔

☆☆☆

میری موت

لوگ سمجھتے ہیں کہ سردار جی مارے گئے۔

نہیں، یہ میری موت ہے۔ پرانے ''میں'' کی موت۔ میرے تعصبات کی موت۔ اس منافرت کی موت جو میرے دل میں تھی۔

میری یہ موت کیسے ہوئی؟ یہ بتانے کے لیے مجھے اپنے پرانے مردہ ''میں'' کو زندہ کرنا پڑے گا۔ میرا نام شیخ برہان الدین ہے۔

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم اور مسلمانوں کا خون سستا ہو گیا تو میں نے سوچا واہ ری قسمت! پڑوسی بھی ملا تو سِکھ۔ حق ہمسائیگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں سکھوں پر ہنستا بھی تھا۔ ان سے ڈرتا بھی تھا اور کافی نفرت بھی کرتا تھا۔ آج سے نہیں بچپن سے۔ میں شاید چھے برس کا تھا جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلّا پڑا: ''ارے وہ دیکھو! عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی!'' جیسے جیسے عمر گزرتی گئی، یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچّے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں مثلاً یہ کہ اسے نمونیہ ہو گیا تھا یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہتیں: ''اب سے دور کسی سکھ فرنگی کو نمونیہ ہو گیا تھا اب سے دور کسی سکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کوسنا ۱۸۵۷ء کی یادگار ہے جب ہندو مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور ان کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی۔ صرف ایک مبہم سا خوف، ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب، ڈر انگریز سے بھی لگتا تھا اور سکھ سے بھی۔ مگر انگریز سے زیادہ۔ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا۔ ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا۔ سوچا کہ اب کی بار سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ ٹکٹ خرید لیا اور

ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدّوں پر خوب کودا۔ باتھ روم کے آئینے میں اُچک اُچک کر اپنا عکس دیکھا۔ سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا۔ روشنیوں کو کبھی جلایا کبھی بجھایا۔ مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منہ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلاڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھس آئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفو چکر ہو گیا اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا۔ یہاں دیکھا تو کئی سکھ داڑھیاں کھولے، کچھے پہنے بیٹھے تھے۔ مگر میں ان سے ڈر کر درجہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ڈر سکھوں سے بھی لگتا تھا اور انگریزوں سے ان سے زیادہ۔ مگر انگریز، انگریز تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے جو میں بھی پہننا چاہتا تھا اور ڈیم بلاڈی فول والی زبان بولتے تھے جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حاکم تھے اور میں چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا تاکہ دنیا مجھے بھی مہذب اور متمدن سمجھے مگر سکھوں سے جو ڈر لگتا تھا، وہ حقارت آمیز کتنے عجیب الخلقت تھے یہ سکھ، جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال منڈانا کچھ مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ ابا کے اس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں۔ میں نے بال خوب بڑھا رکھے تھے تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں جیسے انگریز کھلاڑیوں کے۔ ابا کہتے: ''یہ کیا، عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں۔'' مگر ابا تو تھے ہی پرانے دقیانوسی خیال کے۔ ان کی بات کون سنتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو سر پر اُسترا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے......

ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کی عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی ان کی داڑھیاں تھیں اور پھر داڑھی۔ داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ابا کی داڑھی جس کو نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا تایا ابا کی نوکیلی اور چونچ دار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھتی ہی جائے۔ بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا مل کر بڑھائی جائے اور جب کئی فٹ لمبی ہو جائے تو اس میں کنگھی کی جائے جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں...... عورتیں یا مجھ جیسے اسکول کے فیشن ایبل لڑکے۔ اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی اور وہ بھی اس میں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ...... میرے دادا جان

ٹھہرے اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجا گیا۔ کالج میں پنجابی لڑکے پڑھتے تھے ان کو ہم دہلی اور یوپی والے پنچ، جاہل اور اُجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ، نہ کھانے پینے کی تمیز۔ تہذیب وتمدن چھو نہیں گئے تھے۔ گنوار، لٹھ۔ یہ بڑے بڑے لسّی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑے دار فالودے اور لپٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑتے ہیں۔ اسّی، تُسی، ساڈے، تُہاڈے...... لاحول ولاقوۃ۔ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا انھوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرے میں جگہ دے دی۔ میں نے سوچا چلو جب ساتھ ہی رہنا ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کرلی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا۔ لطیفے خوب سنایا کرتا تھا۔

اب آپ کہیں گے ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا، یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سناتا تھا وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے جن کو سن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات وخصائل، ان کی نسل کی خصوصیات اور اجتماعی کیرکٹر کا بخوبی علم ہوگیا تھا۔ بقول غلام رسول:

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو ان کی عقل بالکل خبط ہوجاتی ہے۔ اس ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کیے جاسکتے ہیں مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرت سر کے ہال بازار سے گزر رہے تھے۔ چوراہے پر ایک سکھ کانسٹبل نے روکا اور پوچھا: ''تمھاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے؟'' سائیکل سوار سردار جی گڑگڑا کر بولے: ''جمعدار صاحب! ابھی ابھی بجھ گئی۔ گھر سے جلا کر تو چلا تھا۔'' اس پر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا: ''چلو بھئی کوئی بات نہیں۔ لائٹ بجھ گئی ہے تو اب جلالو۔'' اور اسی قسم کے سیکڑوں واقعے غلام رسول کو یاد تھے اور انھیں جب وہ پنجابی مکالموں کے سناتا تھا تو سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑجاتے تھے۔ اصل میں ان کو سننے کا مزہ پنجابی ہی میں تھا۔ کیونکہ اجڈ سکھوں کی عجیب غریب حرکتوں کے بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اجڈ زبان ہی میں ہوسکتا ہے۔

سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے تھے جیسا کہ ایک ثبوت تو غلام رسول کا (جس

نے سیکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔اس کے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے نمازی مسلمانوں کے جو ہر اٹھوارے جمعہ کے جمعہ غسل کرتے ہیں، یہ سکھ کچھا باندھ سب کے سامنے نل کے نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نہ جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے تو میں بھی سر میں لائم جیوس، گلیسرین لگاتا ہوں جو کسی قدر گاڑھے گاڑھے دودھ سے مشابہ ہوتی ہے، مگر اس کی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیومر فیکٹری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکھڑپن، بدتمیزی اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ اب دنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ مگر پھر یہ سکھ مسلمانوں کے رعب کو نہیں مانتے تھے۔ کرپانیں لٹکائے، اکڑ اکڑ کر مونچھوں بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول کہتا ان کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوڑے کئی سال گزر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہاسٹل چھوڑ نئی دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کرلیا۔ شادی ہوگئی۔ بچے ہوگئے مگر کتنی ہی مدت کے بعد مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا جب ایک صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آئے — یہ راولپنڈی سے بدلی کرا کر آئے تھے کیونکہ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیشن گوئی کے بموجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سورما بنتے تھے۔ کرپانیں لیے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے ان کی ایک نہ بنی۔ ان کی داڑھیاں مونڈ کر ان کو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی ان کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسب عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ رہیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جارہی تھیں، وہ یا تو جعلی تھیں اور یا سکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے خود اپنی عورتوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگایا تھا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جواں مردی کی دھاک بیٹھی ہے۔

اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں تو ان کا کیا قصور ہے کہ وہ تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں ان لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ ہاں تو سکھوں کی نام نہاد بہادری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو ماسٹر تارا سنگھ لاہور میں کرپان نکال کر مسلمانوں کو دھمکیاں دے۔ پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر میرا سینہ عظمتِ اسلام کی روح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی۔ حالانکہ موت کے منہ سے بچ کر آئے تھے مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بے وقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انھوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نہ جانے سکھوں کا کون سا تہوار تھا، اس دن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی۔ (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو دے دی)۔ پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوئی سوکھا سا جواب دے دیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے منہ دو چار باتیں کر لیں تو یہ پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہیں۔ کون اپنی زبان گندی کرے ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لیے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پوچھ کر آئے کیا بجا ہے؟ انھوں نے کہلوا دیا: ''بارہ بج کر دو منٹ ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا: ''بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ'' اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار بے وقوف بنانے کے لیے سرداری جی سے پوچھا: ''کیوں سردار جی! بارہ بج گئے؟'' اور وہ بے شرمی سے دانت پھاڑ کر جواب دیتے: ''جی اساں دے تاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں'' اور یہ کہہ کر ہنسے۔ گویا یہ بڑا انداق ہو۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اول تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں۔ کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ رکھتے ہوں گے اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دیے جائیں۔ پر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ چند روز بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی اور ان کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی، سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی، اچھا

ناک نقشہ، بڑی خوبصورت ۔ کم بختوں کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتیں چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں ان کو گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم ان کی ہمت نہ ہوئی کہ ادھر کا رخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہوگئی۔ راولپنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ آئے تھے۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پا کر ان پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جامِ شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں دہلی میں آنے شروع ہوئے تھے، اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہوگیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی۔ اس لیے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیج دیا اور خود خدا پر بھروسہ کر کے ٹھہرا رہا۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا، اس لیے میں نے پوری ایک ویگن بک کرالی مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اس دن سنا کہ پاکستان جانے والی گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ اس لیے سامان گھر میں ہی پڑا رہا۔

۱۵ اگست کو آزادی کا جشن منایا گیا مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی تھی، میں نے چھٹی منائی اور دن بھر لیٹا ڈان اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا۔ دونوں میں نام نہاد — آزادی کے چیتھڑے اڑائے گئے تھے اور ثابت کیا گیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قائداعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لے کر ہی رہے۔ اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آ کر امرتسر کو ہندستان کے حوالے کر دیا، حالانکہ دنیا جانتی ہے امرتسر خالص اسلامی شہر ہے۔ اور یہاں کی سنہری مسجد جو (Golden Mosque) کے نام سے دنیا میں مشہور ہے...... نہیں وہ تو گردوارہ ہے اور (Golden Temple) کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہے۔ سنہری مسجد ہی نہیں، جامع مسجد بھی، لال قلعہ ہے۔ نظام الدین اولیا کا مزار، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ کا مدرسہ۔ غرض کہ چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آج اسی دہلی بلکہ کہنا چاہیے شاہ جہان

آباد پر ہندو سامراج کا جھنڈا بلند کیا جارہا ہے۔'' رولے اب دل کھول کے اے دیدۂ خونبار......
اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا، تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا، ہم سے چھین لیا گیا تھا اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان جیسے اُجڈ اور غیر متمدن علاقے میں زبردستی بھیجا جارہا ہے۔ جہاں کسی کو شستہ اردو زبان بھی بولنی نہیں آتی۔ جہاں شلوار جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی پاؤ بھر میں بیس چپاتیوں کے بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے، قائداعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہوگی، مگر پھر بھی دلی چھوڑنے کے خیال سے دل مرجھایا ہی رہا...... شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نکال کر کہا: ''کیوں بابو جی! تم نے آج کچھ کھشی نہیں منائی؟'' تو میرے جی میں آئی کہ اس کی داڑھی میں آگ لگادوں۔ ہندستان کی آزادی اور دل میں سکھا شاہی آخر رنگ لا کر ہی رہی۔ اب مغربی پنجاب سے آئے ہوئے رفیوجیز (Refugees) کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر وہاں سے بھاگے تھے۔ یہاں آکر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے پھرتے تھے۔ کانگریسی پروپیگنڈا مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا اور اس بار کانگریسیوں نے یہ چال چلی کہ بجائے کانگریس کے نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگریسی ہوں یا مہا سبھائی، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دنیا کو دکھانے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتلِ عام شروع ہوگیا۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سیکڑوں گھر پھونک دیے گئے۔ چاندنی چوک کے مسلمانوں کی دوکانیں لوٹ لی گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہوگیا۔ یہ تھا کانگریس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا نئی دہلی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں۔ کمانڈر ان چیف یہاں رہتا ہے۔ کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا۔ کیونکہ اس دن مجھے پراوڈنٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا۔ اور دراصل اسی لیے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی۔ ابھی گول مارکیٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اس نے کہا: ''یہ کیا کر رہے ہو؟ واپس جاؤ۔ باہر نہ نکلنا۔ کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔'' میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے اسکوائر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ کہنے لگے: ''شیخ جی! فکر نہ کرنا۔ جب تک ہم سلامت ہیں، تمھیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔'' میں نے سوچا اس کی داڑھی کے پیچھے کتنا مکر چھپا ہے۔ دل میں تو خوش ہے۔ چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے۔ مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ بلکہ شاید مجھے چڑھانے کے لیے یہ کہہ رہا ہے۔ کیونکہ سارے اسکوائر میں بلکہ تمام سڑک پر میں تنِ تنہا مسلمان تھا۔

پر مجھے ان کافروں کا رحم و کرم نہیں چاہیے۔ میں سوچ کر اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے میری دونالی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فساد شروع ہوئے تھے، میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

''کیوں حضور! کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟''

یہ میرا وفادار ملازم ممدو تھا۔

''میری بندوق کیا ہوئی؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے معلوم ہے۔ شاید اس نے چھپائی ہے یا چرائی ہے۔

''بولتا کیوں نہیں؟'' میں نے ڈانٹ کر کہا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ ممدو نے میری بندوق چُرا کر اپنے چند دوستوں کو دے دی جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

''کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں، دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھون کر رکھ دیں گے۔ بھون کر۔''

''دریا گنج میں میری بندوقوں سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہوئی؟ میں تو یہاں نہتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمے دار ہوگا؟''

میں نے ممدو سے کہا کہ وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لے کر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں ۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اب ان سے کبھی ملاقات ہوگی بھی یا نہیں۔ لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کاش میں نے پراوڈنٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے......

''ست سری اکال...... ہر ہر مہادیو''

دور سے آوازیں قریب آ رہی تھیں ۔ یہ بلوائی تھے، یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے اور ان میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آ سکتے ہیں۔ ''ست سری اکال۔ ہر ہر مہادیو۔''

آوازیں اور قریب آ رہی تھیں۔ میری موت قریب آ رہی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے: ''شیخ جی! تم ہمارے کوارٹر میں آ جاؤ۔ جلدی کرو۔'' بغیر سوچے سمجھے اگلے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گزر گئی۔ کیونکہ میں وہاں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ایک لاری آ کر رکی اور اس میں سے پندرہ نوجوان اترے۔ ان کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ ''کوارٹر نمبر ۸، شیخ برہان الدین۔'' اس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا اور غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دنیا میری آنکھوں کے سامنے اُجڑ گئی۔ کرسیاں، میز، صندوق، تصویر، کتابیں، دریاں، قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے ہر چیز لاری پر پہنچا دی گئی۔

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے، یہ کون سے کم لٹیرے تھے؟ باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے: ''ٹھہریے صاحب! اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے۔ ہمیں بھی اس لوٹ میں حصہ ملنا چاہیے'' اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ بھی لوٹ میں

شامل ہو گئے۔ کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آ رہا ہے، کوٹ، سوٹ کیس، کوئی میری بیوی بچوں کی تصویریں بھی لا رہا ہے۔ اور یہ سب مالِ غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار! زندہ رہا تو تجھ سے بھی سمجھوں گا۔ پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انھیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں......''

''ارے اندر آؤ تو سہی۔''

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سردار جی ننگی کرپان ہاتھ میں لیے مجھے اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے ایک بار اس دڑھیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا اور پھر کرپان کو، جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوتِ موت دے رہی تھی۔ بحث کرنے کا موضوع نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہو گی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا۔ میں نے سوچا ان دس بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا، جھجکتا ہوا خاموش۔

''اِتھے نہیں، اوس اندر آؤ۔''

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔ میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چوندھیائی جا رہی تھیں۔

''یہ لو جی، اپنی چیزیں سنبھال لو۔'' یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انھوں نے اور ان کے بچوں نے جھوٹ موٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بولی: ''بیٹا! ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے۔'' میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے اور اس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اس کی چابیاں مل جاتیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا۔''

''چابیاں تو اس کی پاکستان میں ہوں گی۔ بھاگ گیا، ڈرپوک کہیں کا۔ مسلمانوں کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا—''

ننھی موہنی میری بیوی کی چند ریشمی قمیض اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اس نے یہ سنا۔ وہ بولی: ''تم بڑے بہادر ہو۔ شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے۔ وہ تو پاکستان نہیں

گئے۔‘‘

’’نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منہ کالا کر گیا۔‘‘

’’منہ کالا کیوں کرتے۔ ، وہ تو ہمارے ہاں......‘‘

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لیے بند ہوگئی۔ بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہوگئی۔ مگران بلوائیوں کے لیے یہی کافی تھا۔ سردار پر جیسے خون سوار ہوگیا۔ انھوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی اور خود باہر نکل گئے۔ باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہ ہوا۔ تھپڑوں کی آواز — پھر موہنی کے رونے کی آواز اور اس کے بعد سردار جی کی آواز، پنجابی گالیاں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں؟ میں چاروں طرف سے بند تھا۔ اس لیے ٹھیک سنائی نہ دیتا تھا۔

اور پھر — گولی چلنے کی آواز — سردارنی کی چیخ —

لاری روانہ ہونے کی گڑگڑاہٹ اور پھر تمام اسکوائر پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے اور ان کے سینے کے قریب، سفید قمیص خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ ان کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر رہا تھا۔

’’سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟‘‘ میری زبان سے نہ جانے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا خیالات، محسوسات، تعصبات کی دنیا کھنڈر ہوگئی تھی۔

’’مجھے کرجا اتارنا تھا بیٹا۔‘‘

’’قرضہ؟‘‘

’’ہاں راولپنڈی میں تمھارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور ابجت بچائی تھی۔‘‘

’’کیا نام تھا اس کا سردار جی؟‘‘

’’گلام رسول۔‘‘

’’غلام رسول!‘‘

اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکہ کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کیے، ایک...... دو...... تین...... چار...... پانچ......

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف گئیں جیسے مسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا جان یاد آ گئے

جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔سردار جی کی شکل ان سے کتنی ملتی تھی۔ چھ......سات......آٹھ......نو
جیسے وہ ہنس رہے ہوں۔ان کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

دس......گیارہ......بارہ

جیسے وہ کہہ رہے ہوں ''جی اساں دے ہاں تو چوبیں گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔''

پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز بہت دور سے آئی: ''میں کہتا نہ تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔اب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ـــــ ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دے دی۔''

پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے، میں مرا تھا!

☆☆☆

پرنیتا کماری کے پان

پرنیتا کماری کے پانوں کا ذکر ایسے آتا تھا جیسے کلوپٹرا کی ناک کا یعنی دونوں لازم وملزوم تھے۔

لوگ کہتے تھے ان فلم اسٹاروں کے نخرے تو دیکھو۔ کم از کم بیس روپے روز کے تو پان ہی کھاتی ہے۔ کھانا تو رہا الگ۔ کم سے کم دو مرغیاں تو کھاتی ہوگی، دو وقت میں — حالانکہ جو پرنیتا کماری کو قریب سے جانتے تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ صرف پان کھاتی ہے۔ ایک اگال دان اس کے ساتھ چلتا تھا، جسے اس کی سہیلی ہمراز اور ہیر ڈریسر گل بانو سنبھالتی تھی۔ ہر چند منٹ کے بعد پرنیتا کماری کے سامنے پیش کرتی تھی اور پرنیتا کماری اس میں پیک کرتی رہتی تھی۔

پرنیتا کماری کے شوہر نرمل کمار سرحدی تھے۔ سرحد کے رہنے والے تو نہیں تھے مگر بستی ضلع کے ایک گاؤں سے آئے تھے جو نیپال کی سرحد کے قریب تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنا نام نرمل کمار سرحدی رکھا تھا۔ پہلے تو دبلے پتلے تھے مگر جب چوٹی کی اسٹار گھر میں ہو تو — یا یوں سمجھو سونے کی لکشمی دیوی گھر میں آ گئی ہو تو پھر کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے؟ ڈاکٹر، نرسیں، نرسنگ ہوم، انجکشن، دوائیاں چند مہینے میں نرمل کمار سرحدی کی سیرت اور صورت ہی بدل گئی۔ لوگ کہتے تھے دونوں میں محبت بھی بہت تھی۔

نرمل کمار سرحدی آئے تو تھے گانے لکھنے کے لیے، پھر ڈائیلاگ لکھنے شروع کیے پھر کہانیاں لکھیں۔ آخر پرنیتا کماری کو لے کر ایک فلم بنانی شروع کی اور برسوں تک وہ فلم بنتی رہی۔ آخر کار ریلیز ہوئی تو ہٹ بھی ہوگئی۔ مگر نرمل کمار سرحدی کا کایا پلٹ پرنیتا کماری کے دم سے ہوا تھا۔ وہ دبلے پتلے سے موٹے ہو گئے تھے اور پرنیتا کماری جو کسی زمانے میں کافی پھولی ہوئی لگتی تھی، دُبلی ہونا شروع ہوگئی۔ اور اب تو کہا جاتا تھا کہ ایسے لگتی ہے جیسے بانس کو ساڑی لپیٹ دی گئی ہو۔ مگر اس کا چہرہ اتنا حسین تھا کہ ایک کلوز اپ لوگوں کو دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھا۔ ایکٹرس بھی غضب کی

تھی۔ جذبات نگاری کی تو ماہر تھی۔ بغیر گلیسرین جب ضرورت ہو رو پڑتی اور شاٹ ختم ہونے کے بعد فوراً ہنسنے لگتی تھی۔

لوگ کہتے تھے کہ نرمل کمار سرحدی پیدائشی شاعر اور آرٹسٹ ہے۔ ایسے آدمی کو کچھ تو زندگی میں تنوع چاہیے۔ اب پرنیتا کماری سے وہ کچھ اُکتا گئے تھے۔ صرف فکر یہ رہتی تھی کہ پرنیتا زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اس طرح پروڈیوسروں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کرلیں۔ سارے ''ایوارڈ'' پرنیتا کماری کو کب کے مل چکے تھے۔ تو وہ پان کھاتی تھیں اور اشعار کہتیں۔ رعنا تخلص فرماتی تھیں۔ شعر تو فنی اعتبار سے معمولی ہوتے تھے لیکن ان میں درد کافی ہوتا تھا۔

''پرنیتا تم شعر کیوں کہتی ہو؟'' ایک صحافی نے پوچھا۔

''اپنے دل کی تسلی کے لیے۔'' پرنیتا نے جواب دیا۔

''کیا نرمل صاحب تمھارے دل کی تسلی نہیں کر پاتے؟''

''اس سوال کا جواب ان سے پوچھیے۔'' پرنیتا نے جواب دیا۔

مگر واقعہ یہ تھا کہ نرمل کمار سرحدی کو ایک گھاٹن مل گئی تھی جو ان کے کپڑے دھونے کے لیے خود پرنیتا نے مقرر کی تھی۔ کپڑے دھوتے دھوتے رات کو ان کے پیر دبانے لگی اور پیر دباتے دباتے ان سے ہم بستری کرنے لگی۔

مگر یہ تعلقات نہایت سلیقے کے ساتھ پروان چڑھتے رہے۔ نہ کوئی اسکینڈل ہوا نہ فلمی رسالوں میں کچھ چھپا۔

اسی زمانے میں پرنیتا کماری کو کھانسی رہنے لگی۔ شاید دمہ بھی تھا۔ پیٹ میں اپھارہ بھی رہنے لگا۔ کسی نے بتایا کہ آپ ایک تمباکو کا پان کھانے کے بعد کھالیا کیجیے۔ ایک پان سے دو پان اور اب تو سو پان سے بھی تسلی نہیں ملتی تھی۔ پان میں تمباکو جو کھاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تمباکو کا ایک نشہ ہوتا ہے۔ جب پان نہ ملے تو حالت غیر ہو جاتی ہے۔

ہر ہیرو جو پرنیتا کماری کے ساتھ کام کرتا اسے پرنیتا سے ہلکا پھلکا عشق ہوتا۔ اجیت کمار کی بیوی بہت حسین تھی اس لیے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم اس چکر میں نہ پڑے گا۔

''آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟'' اجیت سے پانوں کا پیکٹ لیتے ہوئے پرنیتا نے پوچھا۔

''ایک پان کے لیے ایک بوسہ۔ یہ سودا بُرا نہ رہے گا۔''

جب اجیت بوسہ دینے کے لیے جھکا تو پرنیتا نے اپنا منہ بند کرلیا اور گال پیش کردیا۔

''جانم!'' وہ ہمیشہ پرنیتا کو پرائیویٹ میں جانم ہی کہتا تھا: ''اس کا مطلب؟''

''جو چاہے سمجھ لیجیے۔''

''تمھیں پایئریا ہے؟ منہ سے بد بو آتی ہوگی؟''

''یہی سمجھ لیجیے۔''

''فورہنس ٹوتھ پیسٹ استعمال کیجیے یا منہ میں چنستان کی گولیاں رکھا کیجیے۔''

''میں سب استعمال کر چکی ہوں۔ بو نہیں جاتی۔''

اس نے ایک طویل بوسہ لیا۔ یہاں تک کہ گال کو کاٹ لیا۔ اپنے گال کو شیشے میں دیکھتے ہوئے اس نے کہا: ''بڑے شریر ہو تم۔'' اور جیسے ہی وہ ڈریسنگ روم سے اپنے میک اپ روم میں گیا، پرنیتا کماری نے گل بانو سے کہا کہ اگال دان لائے۔ اگال دان آتے آتے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ آخر کار جب ڈھیر ساری پیک اگال دان میں کر دی تو تھوڑا سکون ملا۔

اب پرنیتا ہرجائی مشہور ہو گئی تھی — ہر کوئی اس کے عشق کا دم بھرتا۔ جس نے ایک بار اس کے ساتھ کام کر لیا وہ یہی کہتا تھا گویا عشق کی سب منزلیں طے کر چلا ہو۔

حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ پرنیتا اپنے گالوں کو، ماتھے کو، آنکھوں کو چومنے کی اجازت ہر کسی کو دے دیتی تھی۔ مگر اس کے ہونٹوں کا مزہ صرف نرمل کمار سرحدی ہی نے چکھا تھا۔ اور اس نے بھی کئی برس ہوئے پرنیتا کو چومنا چھوڑ دیا تھا اور گھاٹن ہی پر گزارا کرتا تھا۔

انمول کپور

سندیپ کمار

رائٹر چمن دہلوی

بھجن کمار

بیجو چٹرجی

پرنیتا کے عاشقوں اور سابق عاشقوں کی فہرست لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ اور اب ان سب کی جگہ ڈاکٹر بھاسکر نے لے لی تھی جو امریکہ سے ایم ڈی لے کر آیا تھا اور جس کی شہرت پرنیتا نے سنی تھی۔ ڈاکٹر جوان تھا، خوبصورت تھا۔ جب پرنیتا کا سکریٹری اسے لینے گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

''فلم اسٹار ہیں تو اپنے گھر کی ہوں گی۔ مجھ سے علاج کرانا ہے تو ان کو یہاں آنا ہوگا۔''

ڈاکٹر بھاسکر نے باوجود اپنی ولایتی ڈگری کے ایک میونسپل اسپتال میں پریکٹس کرنا شروع کی تھی اور یہاں ہی وہ امیر وغریب ہر مریض کا علاج کرتا تھا۔ کوئی اسپیشل وارڈ سارے اسپتال میں نہیں تھا۔ جو امیر مریضوں کے لیے مخصوص کیا جائے۔

جب پرنیتا کماری اپنے پانوں کے ڈبے کو لیے پان چباتی ہوئی اس کے اسپتال کی سیڑھیوں پر چڑھی تو ڈاکٹر کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کیونکہ اسپتال میں لفٹ نہیں تھا۔

ڈاکٹر بھاسکر نے پرنیتا کی بیماری کو ایک نظر میں بھانپ لیا اور اس کو اسکریننگ مشین کے سامنے کھڑا کر دیا۔ پرنیتا کے کپڑے آپ ہی آپ اتر گئے اور ایکس رے اسکرین پر اب ایک دبلا پتلا ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ گل بانو کو بھی ڈاکٹر نے باہر بھیج دیا تھا۔

پھر بھاسکر نے پوچھا: ''تمھیں معلوم ہے کون سی بیماری ہے تمھیں؟''

اس نے جواب دیا: ''جی معلوم ہے۔''

''کیا بیماری ہے؟'' بھاسکر نے پوچھا۔

''میرے ایک پھیپھڑے میں ٹی بی ہے۔'' پرنیتا نے جواب دیا۔

''دونوں پھیپھڑوں میں ٹی بی ہے آپ نے اس کا علاج تک نہیں کرایا۔''

''جی نہیں۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔''

''اس طرح آپ ایک لمبے راستے سے آتم ہتیا کر رہی ہیں۔''

''یہی سمجھ لیجیے۔''

''لیکن آپ کو ٹی بی ہی نہیں ہے ساتھ ہی دل میں بھی نقص ہے۔ والو (Valve) اتنا چھوٹا پڑ گیا ہے جتنا خون آپ کے دل میں پمپ کر کے جانا چاہیے اس کا چوتھائی بھی نہیں پہنچ رہا ہے۔ شاید آپریشن کرنا پڑے۔ آپ تو بڑی اسٹار ہیں یہاں غریبوں کے اسپتال میں رہنا پسند کریں گی؟''

''اگر الگ کمرہ مل جاتا تو۔''

''نہیں مل سکتا۔ جنرل وارڈ میں رہنا ہوگا، ورنہ کسی اور ڈاکٹر سے علاج کرا لیجیے۔ وہ دو سو روپے روز کے کمرے میں رکھ کر آپ کو مار ڈالے گا اور میں آپ کو مفت مارنے کو تیار ہوں۔''

اس بات پر پرنیتا کو ہنسی آ گئی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ تو میری موت کا ایسے ذکر کر رہے ہیں جیسے آپ نے طے کر لیا ہے

کہ اس کمبخت کو بچانا محض وقت برباد کرنا ہے۔''

''نہیں، میں خدا نہیں ہوں، مگر بخدا تمھیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''یہ تو نجمہ کا پرانا ڈائیلاگ ہے۔''

''ضرور ہوگا۔ امریکہ جانے سے پہلے شاید یہ پکچر دیکھی تھی۔ آپ کے منہ میں کیا ہے؟''

''پان کی پیک۔''

''اسے باہر نکالیے۔''

''اگال دان منگوا دیجیے۔''

''نہیں، اگال دان نہیں ملے گا۔'' اور یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اسے کھول کر ہاتھ میں لے لیا: ''اس پر آپ کو پیک کرنی ہوگی۔''

پرنیتا پہلے تو ہچکچائی پھر پان کی پیک رومال پر کردی۔ آدھی پان کی پیک ضرور تھی مگر بعد میں خون کی قے ہوئی۔

''آپ کتنے پان روز کھاتی ہیں؟''

''کوئی سوسوا سو۔''

''تمباکو کے ساتھ؟'' بھاسکر نے اس کے رومال پر جو خون اور پان کی پیک پڑی تھی، اس کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ ایسی حالت میں تمباکو کے پان کھانا آپ کے لیے زہر ہے؟''

''جی ہاں، جب ہی تو کھاتی ہوں اور اس لیے بھی کہ خون کی قے کا شبہ نہ ہو، ہر وقت منہ میں تمباکو والا پان رکھتی ہوں۔''

''آپ بھی ایک عجیب کیریکٹر ہیں۔''

پرنیتا کو ڈاکٹر کے بھولے پن پر پیار آ گیا۔

''وہ تو میں ہوں ہی فلم لائن میں کسی سے پوچھ لیجیے۔''

''مجھے تو صرف آپ کے علاج میں دلچسپی ہے اور بس۔'' ڈاکٹر نے جلدی سے اپنی ڈاکٹری کا نظر آنے والا لبادہ پہن لیا۔

''اور بس نہیں۔ یہ تو ہماری ملاقات کی شروعات ہے۔''

''اچھا تو آپ آج سے ہی داخل ہو سکتی ہیں۔''

''اگر میں کہوں کل؟ تو کیا اعتراض ہے آپ کو؟''
''جتنی جلدی آپ یہاں آئیں گی، آپ کے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔''
''کل میں ضرور آجاؤں گی۔ پان وغیرہ لانے ہیں نا؟''
''میں نرس سے کہہ دوں گا کہ آپ کو پان نہ دیا جائے۔''
''یہ کس کا حکم ہے؟''
''یہ میرا حکم ہے اور یہاں میرا حکم ہی چلتا ہے۔''
''یہ تو میری جیسی بے وقوف بھی جانتی ہے۔''

....

اگلے دن پرنیتا اسپتال کے جنرل وارڈ میں داخل ہوگئی۔ اس سے پہلے کوئی فلم اسٹار میونسپلٹی کے اسپتال میں داخل نہ ہوئی تھی، فوٹو گرافر اور جرنلسٹ اس واقعے کو دیکھنے اور بیان کرنے آئے۔ یہ ڈیموکریسی کی طرف ایک اہم قدم تھا۔

جنرل وارڈ کے ایک طرف ایک برآمدہ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر بھاسکر کے حکم سے وہاں چکیں لگادی گئیں اور بیچ میں ایک پردہ لٹکا دیا گیا۔ اس طرح وہ وارڈ کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی ایک الگ کمرہ سمجھا جاسکتا تھا۔

پہلے دن ڈاکٹر نے ایک بڑی عمر کی نرس مقرر کی جس کا کام یہ دیکھنا تھا کہ کوئی پرنیتا کو پان نہ لاکر دے۔ پرنیتا نے ایکٹنگ کے ہر حربے کو اس نرس پر استعمال کیا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

''ایک پان، بس ایک پان منگا دو ڈارلنگ، میں تمھیں سو روپے انعام دوں گی۔''

سو روپے کے ذکر پر نرس کے منہ میں پانی آگیا مگر اس وقت ڈاکٹر بھاسکر کے آنے کا وقت تھا۔ جب بھاسکر آیا تو اس نے اگال دان کا معائنہ کیا، اس میں لگا ہوا خون لیبارٹری میں معائنے کے لیے بھیجا۔ ٹی بی جرم نکلے۔

پرنیتا کماری کے چہرے پر جو لالی تھی، وہ پینٹ اور پاؤڈر کی تھی۔ اب تو اسپتال کی دوسری مریضاؤں کی طرح بیماری کی زردی چھاگئی۔ دو روز میں اس کے پرانے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر بھی اسے نہ پہچان سکے۔

ڈاکٹر بھاسکر نے اس سے صاف صاف کہا ''آپ کو ایک بیماری نہیں ہے۔ تین تین بیماریاں ہیں۔''

''سب سے پہلی بیماری کیا ہے؟''

''تپ دق، جسے ٹی بی کہتے ہیں۔''

''اور دوسری؟''

''دل کی حالت خراب ہے۔ کافی خون نہیں ملتا اسے۔''

''اور تیسری بیماری؟''

''چھالیاں اور تمباکو چبانے سے آپ کے گلے کی نلی میں کینسر ہو گیا ہے۔''

پرنیتا بے اختیار ہنس پڑی اور ہنستی رہی جب تک آنکھوں میں آنسو نہ آ گئے۔

''ہاؤ ڈرامیٹک! لاعلاج کینسر!''

''مگر یہ کینسر لاعلاج نہیں ہے۔ ابھی شروعات ہے۔''

''تو علاج آپ شروع کریں گے؟''

''مرچ مسالہ بند۔''

''جی؟''

''جی'' ڈاکٹر بھاسکر نے یقین کے ساتھ کہا۔

اس دن ڈاکٹر بھاسکر کے حکم سے پرنیتا کے گھر سے جو مرغن مرچ مسالہ کا کھانا آتا تھا، وہ بند ہو گیا اور اسے اسپتال کی بغیر گھی کی کالی پتلی دال اور سوکھی چھوٹی چھوٹی روٹیاں ملنے لگیں۔

پہلے وقت تو اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اگلے وقت پھر وہی کھانا آیا، مگر ساتھ میں ڈاکٹر بھاسکر۔

''آپ کھانا کھائیے۔ میں آپ کو کھاتے دیکھوں گا۔''

تب پرنیتا نے مشکل سے ایک پھلکا زہر مار کیا۔ بعد میں ایک گلاس دودھ کا آیا۔ بھوک سے بے حال ہو رہی تھی۔ ایک گھونٹ میں دودھ پی گئی۔

''دیٹ از اے گڈ سائن۔ پہلا قدم تو آپ نے لے لیا۔ تمباکو کھا کر آپ نے اپنی بھوک کو بھگا دیا تھا۔''

رات کو نرمل کمار سرحدی آئے۔ ساتھ میں پریس فوٹو گرافر اپنے کیمرے اور فلیش لیے ہوئے۔ "What a wonderful story to cover."

''اتنی بڑی فلم اسٹار اور جنرل وارڈ میں پڑی ہے۔''

''سنا ہے یار ڈاکٹر بھاسکر ہے نوجوان اور خوبصورت آدمی۔''

پلنگ کے ایک طرف ڈاکٹر کو کھڑا کردیں اور دوسری طرف نرمل کمار سرحدی کو اور جنرل وارڈ بیک گراؤنڈ میں۔''

مگر فوٹوگرافر اور جرنلسٹ کو باہر ہی روک دیا گیا۔ بھاسکر وہاں خود موجود تھا۔

"I am her husband"

''آپ مجھے نہیں روک سکتے۔''

''آپ کو کوئی نہیں روک رہا۔'' بھاسکر نے کہا: ''مگر یہ بھیڑ اندر نہیں جا سکتی۔''

''کون ہو تم؟''

''میں ڈاکٹر بھاسکر ہوں اس اسپتال کا انچارج۔''

اب نرمل کمار سرحدی نے ہار مان لی اور ڈاکٹر بھاسکر کے ساتھ چلا گیا۔ ڈاکٹر بیڈ کے پاس اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

''ہیلو ڈارلنگ!'' نرمل کمار سرحدی نے رقت بھری کیفیت پیدا کرتے ہوئے بیوی سے کہا: ''یہ کہاں آ گئی ہو تم؟ میں تو تمھیں بریچ کینڈی میں داخل کرانا چاہتا تھا۔ یہاں کا ڈاکٹر تو بڑا اقصائی ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح بیماروں کو سمجھتا ہے۔''

''اب تو میں اس سے ہی علاج کراؤں گی۔ مجھے تو فائدہ بھی محسوس ہوتا ہے۔''

''آج مجھے (Deep-x-Ray) دی گئی ہیں۔ گلے میں ناسور ہو گیا ہے نا۔''

''یہ سب پان کھانے کے نتیجے ہیں نا؟''

''جی ہاں۔ مگر اب میں نے پان کھانے بالکل بند کر دیے ہیں۔''

''کس کے حکم سے؟''

نرمل کمار سرحدی واپس چلا گیا۔ اس نے ڈاکٹر بھاسکر کو ایک ہزار روپے دینے کی کوشش کی۔ مگر بھاسکر نے یہ کہہ کر ان روپیوں کو لوٹا دیا کہ ''ان روپیوں سے علاج نہیں ہوگا۔ یہ سب آپ اپنے ہی پاس رکھیے۔''

چند روز بعد فلم گوسپ میں نکلا کہ ''وہ کون سی فلم اسٹار ہے جو ایک معمولی میونسپل اسپتال میں پڑی ایک ڈاکٹر کا انتظار کرتی رہتی ہے؟''

ایک ہفتے بعد Film Scandals میں ساری کہانی پھر دہرائی گئی اور اس بار سارے میں

اصل ناموں کے ساتھ۔ اور یہ ہیڈ لائنز دی گئی ''ڈاکٹر اور شادی شدہ فلم اسٹار کا سنسنی خیز رومانس۔''

نرمل کمار سرحدی سے جب اس کی فلم اسٹار بیوی کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے حسب معمول اس کو ایک معمولی افواہ سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ ڈاکٹر بھاسکر نے اس سلسلے میں انٹرویو ہی نہیں دیا۔

رات کو دس بجے کے قریب ڈاکٹر بھاسکر جب آخری بار اپنے مریضوں کو دیکھنے آیا تو وہ پرنیتا کماری کے پاس بھی آیا اور اس سے بھی پوچھا: ''یہ پریس والے آپ کے بارے میں ہمیشہ ہی ایسے اسکینڈل چھاپا کرتے ہیں؟''

''جی ہاں، مگر اس بار آپ بے چارے بھی ان کی لپیٹ میں آ گئے کیوں ڈاکٹر صاحب! کیسا لگتا ہے آپ کو؟''

''ایسا لگتا ہے جیسے گندگی کے ایک تالاب میں ڈھکیل دیا گیا ہوں۔''

''پھر؟''

''پھر کیا، اگر کوئی جرنلسٹ یہاں آیا تو اس کا جبڑا میں توڑ ڈالوں گا۔ چاہے مجھے خود ہی بعد میں پلاسٹک سرجری کرنا پڑے۔''

''ائی ایم رئیلی سوری فور یو ڈاکٹر''

''کوئی بات نہیں۔ اب آپ سو جایئے۔''

اور اس نے فوراً روشنی بجھا دی۔

پرنیتا انتظار کر رہی کہ اس اندھیرے کا ڈاکٹر فائدہ اٹھائے گا مگر ڈاکٹر کو ابھی اپنے پندرہ مریضوں کو گڈ نائٹ کہنا تھا اس لیے اس کے مضبوط قدم لکڑی کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے دور ہوتے گئے۔

اور من ہی من میں پرنیتا کماری نے سوچا کہ اس وقت مجھے ایک پان کوئی لادے تو میں ایک پکچر میں مفت کام کرنے کو تیار ہوں۔ پھر اس نے سوچا کہ اس نے تو اپنے شوہر کی کمپنی کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچا ہوا ہے۔ وہ کیسے کوئی کنٹریکٹ بذات خود کر سکتی ہے۔ پھر اس نے من ہی من میں ایک پان کی قیمت ایک لاکھ روپے مقرر کی۔ مگر وہاں اسپتال میں بلیک منی کہاں ملتی تھی۔ سوا سی ادھیڑ بن میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ سلیپنگ پلز کا اثر تھا۔ جب جاگی تو نرس اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگا رہی تھی۔

شام کو جب نرمل کمار سرحدی اس سے ملنے آئے تو اس سے پرنیتا کماری نے چپکے سے کہا:
''جانِ من! ایک تمبا کو کا پان چپکے سے مجھے لا دو۔''
''آج تو مشکل ہے میری جان۔ مگر کل سے تمھیں مل جایا کرے گا۔''
اگلے دن نرمل کمار سرحدی کے ذریعے سے پان پرنیتا کماری کو پہنچ گیا۔ رات کو کھانسی کا ایک دورہ پڑا اور اگال دان میں کتنا ہی خون پان کی پیک کے ساتھ ملا ہوا پڑا ملا۔ ڈاکٹر بھاسکر نے اگال دان اپنے کمرے میں منگوایا اور اس کا امتحان کرنے کے بعد وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا سیدھا پرنیتا کماری کے پاس پہنچا۔
''ہیلو ڈاکٹر بھاسکر!'' پرنیتا کماری نے اپنے پیلے چہرے پر مسکراہٹ کھلاتے ہوئے کہا۔
''ہیلو۔ یہ زہر کس نے لا کر دیا؟''
''کون سا زہر ڈاکٹر؟''
''یہی تمباکو والا پان؟''
''ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔''
''تمباکو کا کیا! کوئی پان میں نے دس دن سے نہیں کھایا۔''
''پھر یہ کیا ہے؟'' اگال دان پر پڑے ہوئے سرخ دھبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔
''یہ تو خون ہے ڈاکٹر۔ آپ بھی نہیں پہچانتے؟'' پرنیتا نے مسکرا کر جواب دیا۔
''اچھا تو تم نہیں بتاؤ گی؟ مجھے ہی تمھارے گرد پہرہ زیادہ سخت کرنا پڑے گا۔'' یہ کہا اور وہ لمبے لمبے قدم دور ہوتے گئے۔
پرنیتا کماری نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کمزوری کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نرس نے دیکھا اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔
اس رات نرمل کمار سرحدی اپنی بیوی سے ملنے اسپتال پہنچا تو اس کی تلاشی لی گئی۔ مگر پان اس نے دھوتی میں چھپا رکھا تھا۔ اسپتال والوں کو کوئی شبہ نہ ہوا۔
پرنیتا کماری کے پاس پہنچ کر اس نے پان پیش کرتے ہوئے کہا: ''یہ لو اپنا پان۔ آج جان پر کھیل کر لایا ہوں۔ ڈاکٹر نے تو چاروں طرف پہرہ لگا رکھا ہے۔ مگر میں بھی استاد ہوں۔''
یہ کہہ کر اس نے پان پرنیتا کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اور اس طرح روز پان آتے رہے۔

یہاں تک کہ ڈاکٹر بھاسکر نے ہار مان لی اور پہرہ اٹھا دیا۔

''پرنیتا!'' ڈاکٹر نے رات کو کہا۔

''جی، ڈاکٹر صاحب۔''

''کل تمھارا آپریشن ہوگا۔ بہت خطرناک اور لمبا آپریشن ہوگا۔ تیار ہو؟''

''کم سے کم آج رات کو پان نہ کھانا۔''

''بہت اچھا ڈاکٹر صاحب۔''

''گڈ نائٹ۔''

''گڈ نائٹ۔''

ڈاکٹر گیا تو پرنیتا کماری نے تکیے کے نیچے اپنا ہاتھ ڈالا اور تمباکو والا پان نکال کر منہ میں رکھ لیا۔ آج وہ پان کا پورا مزہ اٹھانا چاہتی تھی۔

اگلے دن جب نرس آپریشن کے لیے پرنیتا کو تیار کرنے آئی تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

پرنیتا کماری بستر پر مری پڑی تھی۔ ڈاکٹر بھاگا بھاگا آیا۔

''پرنیتا! تم نے آخر آتم ہتیا کر ہی ڈالی۔ ہمیں بچانے کا چانس بھی نہ دیا۔'' اور یہ کہہ کر ڈاکٹر نے بڑی Unprofessional حرکت کی۔ جھک کر پرنیتا کماری کے مردہ ہونٹوں کو چوم لیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ تمباکو والے پان میں کیا خوشبو اور کیا مزہ ہوتا ہے۔

اس دن سے ڈاکٹر بھاسکر نے بھی روزانہ تمباکو والے پان کھانا شروع کر دیے — یہی ایک طریقہ تھا ان کے پاس پرنیتا کماری کی یاد کو اپنے پاس رکھنے کا!

☆☆☆

دیوالی کے تین دِیے

پہلا دِیا

دیوالی کا یہ دیا کوئی معمولی دیا نہیں تھا۔ دیے کی شکل کا بہت بڑا بجلی کا لیمپ تھا جو سیٹھ لکشمی داس کے محل نما گھر کے سامنے کے برآمدے میں لگا ہوا تھا۔ بیچ میں یہ دیوں کا سمراٹ دیا تھا اور جیسے سورج کے اردگرد ان گنت ستارے ہیں، اسی طرح اس ایک دیے کے چاروں طرف بلکہ اوپر نیچے بھی ہزاروں بلب بجلی کے تاروں میں ایسے جگمگا رہے تھے جیسے مالن ہاروں میں چنبیلی کے سفید پھولوں کو گوندھتی ہے۔

برآمدے کے ہر محراب میں ان بجلی کے دیوں کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ چھت کے کنگروں کے ساتھ ساتھ ستاروں سے بھی زیادہ جگمگاتے ہوئے قمقموں کی جھالریں جھول رہی تھیں۔ سنگِ مرمر کے ہر ستون پر بجلی کے تاروں کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور اس میں پکے ہوئے انگوروں کی طرح لال، ہرے، نیلے، پیلے بلب لگے ہوئے تھے۔ سارے گھر میں کچھ نہیں تو دس ہزار بجلی کے یہ دیے شام سے ہی دیوالی کا اعلان کر رہے تھے۔ دیوی لکشمی کا انتظار کر رہے تھے۔

مگر ان سب میں سب سے زیادہ نمایاں وہ ایک ہی دیا تھا۔ دیوی کا سمراٹ جو اپنی روشنی سے شام کے دھندلکے کو دوپہر کی طرح روشن کیے ہوئے تھا، یہ دیا سیٹھ لکشمی داس امریکہ سے لائے تھے۔ جب وہ وہاں اپنی کمپنی کے لیے بجلی کا سامان خریدنے گئے تھے—— دراصل یہ دیوی کا سمراٹ انھیں ذاتی کمیشن کے طور پر بھینٹ کیا گیا تھا مال سپلائی والی امریکن الیکٹرک کمپنی کی طرف سے۔ اور اس کو دیکھتے ہی سیٹھ لکشمی داس نے سوچ لیا تھا کہ اب کی بار دیوالی پر یہ امریکن دیا ہی دیوی لکشمی کا سواگت کرے گا۔

اور آج شام ہی سے یہ دیا اپنی بھڑکیلی امریکن شان سے جل رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف دس ہزار اور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سیٹھ لکشمی داس کا کہنا تھا کہ سب تہواروں میں دیوالی ہی سب

سے اہم اور برتر تہوار ہے۔ دیوالی کی رات جہاں اس کا سواگت کرنے کو روشنیاں ہوتی ہیں وہاں دیوی لکشمی آتی ہے۔ سو وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ ہر دوسرے سیٹھ اور بیوپاری کے گھر سے زیادہ روشنیاں لکشمی محل میں ہونی چاہئیں۔ ان کو یقین تھا کہ جتنی روشنیاں زیادہ ہوں گی اتنی ہی زیادہ لکشمی دیوی کی مہربانی بھی ہوگی اور شاید تھا بھی یہ سچ۔ بیس بائیس برس پہلے جب ان کی چھوٹی کپڑے کی دکان تھی، تب ان کے گھر میں کڑوے تیل کے سو دیے جلا کرتے تھے۔ پھر جب جنگ ہوئی اور ان کو فوجی کمبل سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو ان کے نئے گھر پر ایک ہزار دیے جگمگانے لگے۔ پھر جب آزادی آئی اور سیٹھ لکشمی داس کو ایک بہت بڑے ڈیم بنانے کے لیے مزدور سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو دیوالی کی رات کو ان کے بنگلے پر پانچ ہزار بجلی کے بلب جگمگا اٹھے اور اس سال جبکہ انھوں نے ایک امریکن کمپنی کے ساتھ مل کر کئی کروڑ کا کارخانہ قائم کرلیا تھا جس میں انھیں لاکھوں روپے مہینے کی آمدنی کی امید تھی، اگر انکم ٹیکس افسر کوئی گڑبڑ نہ کرے۔

اس مرتبہ تو انھوں نے اپنے لکشمی محل میں ایسی روشنی کی تھی کہ ایک بار تو دیوی لکشمی کی آنکھیں بھی چکاچوند ہو جائیں۔ اتنی بہت روشنیاں اور خصوصاً امریکن دیوی کے سمراٹ کو دیکھ کر دیوی خوش ہوگئی تو کون جانتا ہے کہ اگلی دیوالی تک سیٹھ جی پانچ چھ اور کارخانے اور دو چار بینک خریدنے کے قابل ہو جائیں۔

ہاں تو دیوالی کی رات تھی اور سیٹھ صاحب الیکٹرک انجینئر کو ہدایت دے رہے تھے کہ بجلی کے کنکشن اور فیوز وغیرہ کا خاص خیال رکھے کیونکہ کسی کی بھول سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی بجلی فیوز ہو کر اندھیرا ہو گیا تو خطرہ ہے کہ دیوی لکشمی ناخوش ہو کر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نہ چلی جائے۔ اس لیے الیکٹرک انجینئر نے ایک جنریٹر بھی لگایا ہوا تھا تا کہ پاور کے کرنٹ میں کوئی گڑبڑ ہو تو جنریٹر سے بنائی ہوئی بجلی کام آئے۔

یکایک سیٹھ صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محل بھر میں لگے ہوئے سارے بجلی کے قمقموں کی روشنی اور تیز ہوگئی ہو— ''دیوی لکشمی آگئی۔'' انھوں نے خوش ہو کر کہا: ''مگر انجینئر نے سمجھایا کہ کرنٹ کے گھٹنے بڑھنے سے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روشنی زیادہ یا کم ہو جاتی ہے۔

''تو پھر تمھاری ڈیوٹی یہ ہے کہ دیکھتے رہو کہ روشنی زیادہ ہوتی رہے۔ ایک پل کے لیے بھی کم نہ ہو۔''

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب برآمدے کی سنگِ مرمر کی سیڑھیاں اتر کر باغ کی طرف آ رہے تھے

جہاں ہر پیڑ کی شاخوں میں جگمگاتے ہوئے ''پھل'' جھول رہے تھے کہ انھوں نے ایک عورت کو سڑک پر کھڑا دیکھا۔

عورت گاؤں سے آئی لگتی تھی۔ اس کے بدن پر میلا گھاگرا تھا، جس کا رنگ کبھی لال رہا ہوگا۔ اسی رنگ کی چولی تھی اور سر پر اوڑھنی تھی۔ وہ بھی موٹے لال کھدر کی مگر چھپی ہوئی۔ اپنے سر پر وہ میلے کچیلے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری اٹھائے ہوئے تھی۔ اس کے کپڑے نہ صرف میلے تھے بلکہ پھٹے پرانے پیوند بھی لگے تھے۔

''کوئی غریب بھکارن ہوگی۔'' سیٹھ داس نے دل میں سوچا۔

''کیوں مائی! کیا چاہیے؟'' انھوں نے سیڑھیاں اترتے پوچھا اور قریب جانے پر انھوں نے دیکھا کہ عورت غریب سہی، مگر جوان ہے اور رنگت سانولی ہونے پر بھی خوبصورت ہے۔

''ایک رات کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیے۔ سیٹھ جی! بڑی دور سے آئی ہوں۔''

''نا بابا معاف کرو۔'' وہ جلدی سے بولے۔ من ہی من میں انھوں نے سوچ لیا تھا کہ ایک انجانی غریب جوان عورت کو رات بھر کے لیے گھر میں رکھنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے راتوں رات گھر میں سے روپیہ پیسہ یا زیور سونا چرا کر بھاگ جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے بلیک میل کر کے روپیہ وصول کرے۔ سیٹھ جی کا لڑکا جوان تھا۔ وہ کہیں اس انجانی عورت کے چکر میں نہ آجائے۔

پھر بھی انھوں نے سوچا دیوالی کی رات ہے۔ کسی بھکارن کو دھتکارنا بھی نہیں چاہیے۔

''بھوکی ہو تو کھانا کھلوائے دیتا ہوں۔ لڈو، پوری جو جی چاہے کھاؤ۔''

''میں بھکارن نہیں ہوں سیٹھ جی۔''

''اس نے اپنے سر پر دھری ہوئی گٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: ''میرے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے۔ مکئی کی روٹی ہے، چنے کا ساگ، گاؤں کا اصلی گھی، دہی ہے، دودھ ہے۔ آپ کے سارے گھر کو پیٹ بھر کے کھلا سکتی ہوں۔ مجھے تو رات بھر ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیے۔''

اس کی حاضر جوابی سے سیٹھ جی اور گھبرائے۔ انھوں نے سوچا ایک معمولی گاؤں کی عورت کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ یوں سوال جواب کرے۔ کہیں یہ عورت انکم ٹیکس والوں کی سی آئی ڈی تو نہیں ہے؟

''نا بابا معاف کرو۔ ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا گھر دیکھو۔''

''تو پھر دوسرا ہی گھر دیکھنا پڑے گا سیٹھ جی۔'' یہ کہا اور وہ عورت اپنی گٹھری سنبھالتی ہوئی چلی

گئی۔

سیٹھ جی مڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے واپس برآمدے میں جا رہے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس امریکن دیے کی روشنی کچھ پیلی پڑتی جا رہی ہے۔ ''یہ پاور ہاؤس کا کرنٹ پھر نیچے جا رہا ہے۔'' اور پھر چلا کر کہا: ''انجینئر! جنریٹر تیار رکھو۔ دیے بجھنے نہ پائیں۔'' الیکٹرک انجینئر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا:

''سیٹھ جی! کرنٹ بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے جنریٹر بھی تیار ہے۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں۔''

''گھبراؤں کیسے نہیں۔'' سیٹھ کا دل نہ جانے کیوں ایک عجیب بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔ جانتے نہیں دیوالی کی رات ہے۔ ایک پل کو بھی اندھیرا ہو گیا اور وہی دیوی کے آنے کا سمے ہوا اور دیوی روٹھ کر کہیں اور چلی گئی ـــ تو ـــ تو ـــ؟

دوسرا دِیا

انکم ٹیکس افسر لکشمی کانت تیل کی بوتل لے کر اپنے فلیٹ کی بالکنی میں نکلا تو اس نے دیکھا کہ سامنے سیٹھ لکشمی داس کا محل بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔

''ہاں کیوں نہ ہو!'' اس نے سوچا کروڑوں روپیہ بلیک کا جو موجود رکھا ہے۔ دس ہزار کیا دس لاکھ بجلی کے بلب لگا سکتا ہے۔''

پھر اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی بالکنی کی منڈیر پر جو سو دیے اس نے سجا رکھے ہیں ان میں سے ایک دیے کی لو دھیمی ہوئی جا رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا ''کہیں دیا بجھ نہ جائے۔ شگون ہی برا نہ ہو جائے!'' اور جلدی سے اس نے بوتل کا تیل دیے میں اُلٹ دیا۔ دیا سلائی سے لو بھی اوپر کی تو اسے ایسا لگا کہ نہ صرف اس دیے کی بلکہ سو دیوں کی روشنی ایک دم سے تیز ہو گئی۔

''دھنیہ ہو دیوی۔'' اس نے دیوار پر لکشمی کی تصویر کے آگے پرنام کرتے ہوئے کہا: ''اس برس تو تمھاری کرپا رہی ہے۔''

پھر اس نے کرسی پر آرام سے بیٹھ کر اپنا جاسوسی ناول اٹھایا جو ختم کے قریب تھا اور جس کا ہیرو اس وقت ڈاکوؤں کی سنہری ٹولی کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو رسوئی سے اس کی بیوی چلائی: ''اجی او! ذرا دیکھنا تو کون ہے؟''

''منگو سے کہو نا دیکھے کون ہے۔'' اس نے ناول سے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''منگو کو میں نے بازار بھیجا ہے، مٹھائی لانے۔'' رسوئی سے آواز آئی۔

''تو گنگا کو بھیجو۔'' گنگا ان کے یہاں برتن مانجھنے پر ملازم تھی اور صبح شام کام کرنے آتی تھی۔

''گنگا مرداوتو آج چھٹی منا رہی ہے۔ کہتی تھی بائی ہماری بھی آج دیوالی ہے۔ آج ہم کام نہیں کریں گا۔ سو میں نے بھی چڑیل کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔

گھنٹی ایک بار پھر بجی۔

''اچھا، اب تم ہی اٹھ جاؤ نا۔'' ''ضرور سیٹھ جی کے ہاں سے مٹھائی آئی ہوگی۔''

''کیا صرف مٹھائی ہی آئی ہے یا کچھ اور؟'' اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

مگر جب اس نے دروازہ کھولا تو سیٹھ جی کا ملازم نہیں ہے۔ ایک عورت صورت سے گنوار لگتی تھی، کپڑے بھی پھٹے پرانے۔ سر پر ایک میلے سے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری تھی مگر تھی جوان اور خوبصورت۔ لکشمی کانت نے دل ہی دل میں سوچا۔ جوانی اور خوبصورتی پر بھی انکم ٹیکس لگنا چاہیے۔''

مگر اونچی آواز سے اس نے پوچھا: ''کیوں، کیا چاہیے؟''

''بابو جی! بڑی دور سے آئی ہوں۔ گھر لوٹنے کا سمے نہیں رہا۔ ایک رات کو ٹھہرنے کا ٹھکانہ مل جائے تو بڑی کرپا ہوگی۔ میں کہیں کونے میں پڑ رہوں گی۔''

لکشمی کانت نے ایک بار پھر اس عورت کی جوانی کا جائزہ لیا۔ پھر مڑ کر کن انکھیوں سے رسوئی کی طرف دیکھا جہاں اس کی بیوی بیٹھی پوریاں تل رہی تھی۔ لاجو موٹی تھی، اس کے منہ پر چیچک کے نشان تھے۔ مگر وہ جہیز میں دس ہزار نقد لائی تھی۔ اس کے سب رشتے داروں نے مبارکباد دے کر کہا تھا: ''لکشمی کانت! سچ مچ تیرے گھر میں تو لکشمی آئی ہے۔''

لکشمی کانت نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پوریاں بیلنے کے لیے لکڑی کا بیلن تھا اور پھر ہلکی سی ٹھنڈی سی سانس لے کر اس انجانی عورت کی طرف مخاطب ہوا:

''آئی کہاں سے ہو؟''

''بڑی دور سے آئی ہوں بابو جی۔ مگر اس وقت تو سیٹھ لکشمی داس کے ہاں سے آئی ہوں۔''

''کیوں سیٹھ جی نے تمھیں نکال دیا......؟''

''ہاں بابو جی، یہی سمجھو نکال ہی دیا۔''

''اور وہاں سے تم سیدھی یہاں چلی آئیں؟''

''ہاں بابو جی!''

لکشمی کانت نے کتنے ہی جاسوسی ناول پڑھے تھے اور اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی سرمایہ دار کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا ہتھیار کوئی ایسی عورت بھی ہو سکتی ہے۔

''تو سیٹھ جی نے مجھے یہ دیوالی کی بھینٹ بھیجی ہے؟'' اس نے دانت بھینچ کر کہا۔

''اس گٹھری میں کیا ہے؟''

''اس میں مکئی کی روٹی ہے بابو جی۔ چنے کا ساگ اور گاؤں کا اصلی گھی ہے اور دودھ ہے، دہی ہے۔''

''بس بس رہنے دو۔'' اسے یقین تھا کہ یہ سب بکواس ہے۔ جاسوسی ناولوں کے مطابق اس گٹھری میں زیور ہوگا۔ نشان لگے ہوئے نوٹ ہوں گے۔ رات کو یہ گٹھری اس گھر میں چھوڑ کر یہ عورت چمپت ہو جائے گی اور جب سیٹھ اس کو پکڑوانے کی دھمکی دے گا تو بغیر کچھ لیے دیے اس کے انکم ٹیکس کے رٹرن پاس کرنے ہوں گے۔

''جاؤ دوسرا گھر دیکھو۔'' اس نے عورت کی جوانی کا آخری بار جائزہ لینے کے بعد ایک اور ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر دیا۔

''کون تھا؟'' لاجو رسوئی سے چلائی۔

''کوئی نہیں—''

''کوئی نہیں تھا تو اتنی دیر کس سے باتیں کر رہے تھے؟''

''میرا دماغ مت کھاؤ۔ کوئی بھکارن تھی۔''

بھکارن تھی تب ہی اتنی دیر میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ میں تمھیں خوب......''

ایک بار پھر گھنٹی بجی۔

دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''جاؤ، لگتا ہے پھر تمھاری بھکارن آئی ہے۔'' بیوی نے حکم دیا۔

لکشمی کانت نے دروازہ کھولا تو سفید وردی پہنے ایک ڈرائیور ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا سنہری ڈبہ لیے کھڑا تھا۔

''سیٹھ لکشمی داس نے دیوالی کی مٹھائی بھیجی ہے۔''

لکشمی کانت ڈبہ لے کر اندر آیا تو لاجو نے جلدی سے ڈبہ لے لیا اور ڈرائیور سے چلا کر بولی:
''اچھا بھائی سیٹھ جی سے ہمارا نمستے کہنا اور دیوالی کی مبارکباد۔''
دروازہ بند کر کے لکشمی کانت کمرے میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ بیوی نے پھر ڈانٹا: ''ارے یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، جلدی سے دِیوں میں تیل ڈالو۔ ان کی روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔''

تیسرا دِیا

دیا صرف ایک تھا جو جھونپڑی کے سامنے ٹمٹمار ہا تھا۔ دیے میں تیل بھی بہت کم تھا۔
اندر کھاٹ پر لکھو پڑا تھا۔ اس کا نام بھی لکشمی چند ہوتا تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں سے چل کر شہر آیا تھا مگر مل میں اور جھونپڑیوں کی بستی میں اسے لکھو ہی لکھو کہتے تھے۔ غریب مزدور کو اور خصوصاً جب وہ بے کار ہو اور بیمار بھی ہو، بھلا کون لکشمی چند کہہ سکتا تھا۔
اس کی بیوی گنگا ایک کونے میں بنے ہوئے چولھے پر بھات پکا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ بچوں کو بھات کے ساتھ کھانے کو کیا دوں؟ بارہ آنے گھر میں تھے۔ اس کی وہ لکھو کی دوا لے آئی تھی۔ مالکن نے کھڑے کھڑے نکال دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس نے دیوالی کی چھٹی مانگی تھی۔ پندرہ دن کی پگار تھی، وہ بھی نہیں دی کہہ دیا تھا: ''دیوالی بعد آنا۔ آج کے دن ہم لکشمی کو گھر سے باہر نہیں نکالتے۔'' اتنے میں اس کے دونوں بچے باہر سے بھاگتے ہوئے آئے۔ بڑا سات برس کا تھا چھمن اور چھوٹی چار برس کی تھی مینا۔
چھمن بولا: ''ماں، ماں! سیٹھ جی کے محل میں اتنے دیے جل رہے ہیں کہ لگتا ہے رات نہیں دن ہے۔ اور ایک دیا تو اتنا بڑا ہے کہ سب اسے دیوی کا سمراٹ بولتے ہیں۔''
اور مینا نے بھنک کر کہا: ''ماں! بھوک لگی ہے۔''
مگر چھمن نے اسے ڈانٹ دیا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں کہتا ہوں ماں! ہمارے ہاں ایک ہی دیا کیوں جل رہا ہے؟''
''اس لیے بیٹا کہ ہم غریب ہیں۔ تیل کے لیے پیسے نہیں کہ اور دیے جلا سکیں۔''
اور کھانستے ہوئے لکھو نے کھاٹ پر سے آواز دی: ''اری تو پھر یہ دیا بھی بجھا دے۔ اس جھونپڑی میں اندھیرا ہی ٹھیک ہے۔''

''ہائے رام!'' گنگا جلدی سے بولی: ''دیوالی کی رات کو دیا بجھا دوں؟ اندھیرے میں دیوی لکشمی نہیں آئے گی۔''

لکھوا تنے زور سے چلایا کہ پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ مگر کھانستے کھانستے بھی وہ بولتا گیا: ''دیوی سیٹھ لکشمی داس کے محل میں جائے گی۔ لکشمی چند کے گھر نہیں آئے گی۔ نہ بجھا چراغ — تھوڑی دیر میں تیل ختم ہو جائے گا تو آپ سے آپ ہی بجھ جائے گا۔''

چھمن جو کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا، چلّایا: ''بابا! دیکھو ہمارے دیے کی لو آپ سے آپ اونچی ہوتی جا رہی ہے۔''

''پاگل ہوا ہے بے۔'' لکھوا سے ڈانٹ ہی رہا تھا کہ یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گیا کہ باہر رکھے ہوئے دیے کی روشنی اب جھونپڑی میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔

دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔

گنگا نے دروازہ کھولا تو دیے کی روشنی میں دیکھا ایک عورت کھڑی ہے۔

''کیا ہے بہن؟''

''ایک رات کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیے۔ بڑی دور سے آئی ہوں۔''

''تو اندر آؤ نا۔''

وہ عورت دروازے میں سے اندر آئی تو اس کے ساتھ ہی چراغ کی روشنی بھی اندر آ گئی۔

لکھو نے کہا: ''ہمارے پاس تو بس یہی جھونپڑی ہے۔ ہو گی تو تکلیف، مگر اتنی رات گئے اور کہاں جاؤ گی۔ کھاٹ بھی ایک ہی ہے۔ مگر میں اپنا بستر اُدھر زمین پر کر لوں گا۔''

عورت زمین پر بڑے آرام سے پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ''نہیں بھائی! تم بیمار ہو۔ تم کھاٹ پر سوؤ۔ میں دھرتی ہی سے نکلی ہوں۔ دھرتی ہی سے مجھے سکھ آرام ملتا ہے۔''

گنگا نے کہا: ''لگتا ہے شہر میں پہلی بار آئی ہو؟ کہو دیوالی کی روشنیاں دیکھیں؟''

''ہاں'' عورت نے تھکی ہوئی سی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: ''دیوالی کی روشنیاں بھی دیکھیں۔ دیوالی کا اندھیرا بھی دیکھا۔''

گنگا اس کا مطلب نہ سمجھی۔ لکھو بھی کھاٹ پر پڑا سوچتا رہا۔ یہ عورت تو کوئی بڑی ہی انوکھی باتیں کرتی ہے اور اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ جیسے اس کی چھاتی پر سے کھانسی کا بوجھ آپ سے آپ اتر گیا ہو۔ وہ جو سات دن سے کھاٹ پر پڑا تھا، بے سہارا اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا: ''گنگا آج تو مجھے

بھی بھوک لگی ہے۔ نکال کھانا مہمان کے لیے بھی۔

گنگا نے ہانڈی چولھے پر سے اتارتے ہوئے شرمندہ ہوکر کہا: ''بھات تو ہے مگر ساتھ کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ نہ جانے تم سوکھا بھات کھا بھی سکوگی بہن؟''

''تم میری فکر نہ کرو۔'' عورت نے اپنی گٹھری سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے پاس سب کچھ ہے۔ دراصل یہ میں تمھارے لیے ہی لائی تھی۔''

''ہمارے لیے؟ پر تم تو ہمیں جانتی ہی نہیں تھیں۔''

''میں تمھیں اچھی طرح جانتی ہوں بہن۔ لکھو بھائی کو بھی، پچھمن اور مینا کو بھی۔''

یہ کہہ کر اس نے گٹھری کھولی تو کھانے کی خوشبو سونگ کر بچے اس کے پاس آ گئے۔

''اس میں کیا ہے؟'' لکھو نے کھاٹ سے اتر کر چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

عورت نے ایک ایک چیز نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

''یہ ہیں مکئ کی روٹیاں، مکھن لگی ہوئی۔ یہ ہے چنے کا ساگ۔ یہ ہے گاؤں کا اصلی گھی۔ یہ ہے دیوالی کی مٹھائی۔ اصلی کھوئے کے پیڑے۔ یہ ہے دہی، اور اس لٹیا میں بچوں کے لیے گائے کا دودھ ہے۔ شہر کی طرح پانی ملا نہیں ہے۔''

اور یہ سن کر سب ہنس پڑے۔ مگر اتنا کھانا دیکھ کر لکھو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ روٹی کا لقمہ بناتے ہوئے بولا: ''یہ سب ہو تو پھر آدمی کو اور کیا چاہیے۔''

وہ کھانا کھاتے جا رہے تھے اور اس انجانی عورت کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے جا رہے تھے جو نہ جانے کہاں سے ان کے لیے یہ ساری نعمتیں لے کر آ گئی تھی۔

کھانا کھا کر وہ سب آرام سے بیٹھے۔ تب گنگا نے کہا: ''بہن! آج تمھاری بدولت ہماری دیوالی ہو گئی۔''

اور لکھو ہنس کر بولا: ''نہیں تو دیوالہ ہی دیوالہ تھا۔ تمھارا شکریہ کیسے ادا کریں بہن۔ ہمیں تو تمھاری پوجا کرنی چاہیے۔''

اور عورت نے کہا: ''شکریہ تو مجھے تمھارا ادا کرنا چاہیے۔ میں اس سارے شہر میں پھری، مگر کسی نے مجھے رات بھر کے لیے آسرا نہیں دیا۔ سوائے تمھارے سب محلوں کے سب بنگلوں کے دروازے بند تھے۔ میرے لیے کھلا تھا تو صرف تمھاری جھونپڑی کا دروازہ۔ اب میں ہر برس تمھارے ہاں آیا کروں گی دیوالی پر۔''

گنگا نے کہا: ''بہن! تم کل سویرے چلی جاؤ گی تو ہم تمھیں یاد کیسے کریں گے؟ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟''

اور اس کا جواب سن کر وہ سب بڑی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اس عورت نے کہا: ''میں یہیں تم لوگوں کے پاس رہتی ہوں۔ میں ان کھیتوں کے پاس رہتی ہوں جہاں لکھو بھیا کے بابا اناج اُگایا کرتے تھے۔ اور میں اس کارخانے میں بھی رہتی ہوں جہاں لکھو بھیا مشینوں سے کپڑا بنتے ہیں۔ جہاں کہیں انسان اپنی محنت سے اپنی ضروریات پیدا کرتا ہے۔ میں وہیں رہتی ہوں اور دیوالی کی رات کو میں ہر اس گھر میں پہنچ جاتی ہوں جہاں ایک چراغ میں بھی مجھے انسانیت اور سچی محبت جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔''

تھوڑی دیر جھونپڑی میں سناٹا رہا۔ اب اس اکلوتے ننھے سے دیے کی روشنی اتنی تیز ہوگئی تھی کہ جھونپڑی کا کونا کونا جگمگا اٹھا تھا۔ اور دور سیٹھ لکشمی داس کے محل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ شاید کرنٹ اور جنریٹر دونوں فیل ہوگئے تھے اور بابو لکشمی کانت کی بالکنی کے سارے دیے بھی تیل ختم ہو کر بجھ گئے تھے۔

''دیوی!'' گنگا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''تمھارا نام کیا ہے؟''

اور اس عورت نے مسکرا کر جواب دیا: ''لکشمی!''

☆☆☆

اجنتا

اجنتا ہندستان کے آرٹ کی معراج ہے۔ دنیا میں اس کا جواب نہیں...... بڑے بڑے انگریز اور امریکن یہاں آ کر دم بخود رہ جاتے ہیں...... یہ غار ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہیں۔ ان کو کھودنے، تراشنے، ان میں مجسمے اور تصویروں کو بنانے میں کم سے کم آٹھ سو برس کا عرصہ لگا ہوگا...... مہاتما بدھ کے اس مجسمے کو دیکھیے......''

سرکاری گائیڈ کی منجھی ہوئی آواز غار کی اونچی پتھریلی چھت سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اٹھائیس روپے ماہوار تنخواہ اور روپیہ ڈیڑھ روپے روزانہ بخششیں کے عوض وہ اپنا طوطے کی طرح رٹا ہوا سبق دن میں نہ جانے کتنی بار دہراتا تھا۔ نرمل کو اس کی آواز ایسی معلوم ہوتی جیسے رہٹ چل رہا ہو یا چرخہ یا کولھو۔ روں، روں، روں، روں۔ ایک بے معنی، بے روح آواز کا لامتناہی سلسلہ جو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔

بھارتی — جو آرٹ کی پرستار بھی تھی اور خود آرٹ کا ایک نادر نمونہ بھی — گائیڈ کے الفاظ پر سر دھن رہی تھی۔ ہزاروں برس پرانے آرٹ کے اس اتھاہ سمندر میں وہ ڈوب جانا چاہتی تھی۔ ہر تصویر، ہر مجسمے، ہر ستون، ہر محراب، ہر پھول اور پتّی کو دیکھ کر اس کے منہ سے تعریف کا چشمہ بے اختیار پھوٹ نکلتا تھا— ''اوہ نرمل! یہ دیکھو۔ اوہ! نرمل وہ دیکھو...... مہاتما بدھ کے چہرے پر کتنا سکون اور شانت اکسپریشن ہے۔ اس اپسرا کے بالوں کا سنگھار تو دیکھو...... ہاؤ سویٹ...... کتنا سندر...... ہاو ونڈرفل......

نرمل خاموش تھا۔ وہ نہ گائیڈ کی روں روں سن رہا تھا اور نہ بھارتی کے پُر جوش تعریفی جملے...... اس کی نگاہیں دیوار پر بنائی ہوئی تصویروں پر ضرور تھیں۔ مگر اسے سوائے رنگین دھندلے دھبوں کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا...... اس کے کان گائیڈ کی رٹی ہوئی تقریر کو سن رہے تھے۔ پر اب تک وہ صرف آواز تھی۔ بے معنی دھیما دھیما شور، چرخے یا کولھو رہٹ کی روں روں کی طرح...... بھارتی

جب بولتی تو نرمل کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں پر کوئی غیر متعلق اور قطعی غیر ضروری چوٹ پڑی ہے...... جیسے گرمی کی دوپہر میں تانبے کی طرح تپتا ہوا آسمان ایک اڑتی ہوئی چیل کی ہیبت ناک چیخ سے گونج اٹھے......

نہ جانے وہ کس نمبر کے غار میں تھے۔ نہ جانے وہ کس تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے......

گائیڈ کی روں روں جاری تھی...... "یہ دیکھیے، ایک پچھلے جنم میں سنیاسی کے روپ میں مہاتما بدھ اُپدیش دے رہے ہیں۔ بنارس کے راجہ کی یہ نرتکی مہاتما بدھ کے اُپدیش سنتی ہے...... راجہ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ خود جا کر سنیاسی سے سوال جواب کرتا ہے...... تم کون ہو اور کیا اپدیش دے رہے ہو......؟ وہ کہتے ہیں، "میں شانتی اور سچائی کا ذکر کر رہا ہوں......" راجہ اپنے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ وہ سنیاسی کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان تلوار سے کاٹ ڈالے۔ پر ہر بار مہاتما بدھ نے یہی کہا کہ شانتی اور سچائی تو میرے دل میں ہے۔ ناک، کان، ہاتھ، پاؤں میں نہیں ہے۔ یہ دیکھیے ان کے زخموں سے خون......"

"خون!"

گائیڈ کی بے معنی، لامتناہی روں روں میں سے ایک لفظ نے نرمل کے دماغ پر ہتوڑے کی طرح ایک چوٹ لگائی۔

خون!

اجنتا کے گاروں کی پتھریلی دیواریں یک لخت فضا میں تحلیل ہوگئیں— اب وہاں نہ مجسمے تھے، نہ تصویریں، نہ ستون— نہ گائیڈ اور نہ بھارتی— نہ سرسبز پہاڑیاں، نہ وہ سریلے شور کے ساتھ بہنے والی ندی— نہ آرٹ اور نہ تاریخ— نہ دھرم اور نہ مذہب— نہ مہاتما بدھ اور نہ بنارس کا ظالم راجہ......

خون!

خون کی ندیاں، خون کے دریا، خون کا سمندر۔ اور ان خونی لہروں پر بہتا ہوا نرمل۔ پھر بمبئی واپس پہنچ گیا۔ وہی خونی بمبئی جس سے بھاگ کر اس نے تین سو میل پرے اور ڈیڑھ ہزار برس پرانے غاروں میں پناہ لی تھی......

یکم ستمبر— شام کو حسب معمول وہ اپنا کام ختم کر کے گرگام اپنے دوست وسنت کے دفتر گیا

تھا کہ دونوں ساتھ ٹرین سے دادر جائیں گے کہ خبر آئی کہ شہر میں ہندو مسلم کا فساد ہو گیا ہے۔ کام چھوڑ کر ہر کوئی اس مضمون پر رائے زنی کرنے لگا۔

''تم دیکھنا، یہ فساد چند گھنٹے میں دب جائے گا۔ اس بار گورنمنٹ نے پوری تیاریاں کر رکھی ہیں......''

''پر آج کیسے ہو گیا؟ مسلم لیگ کالے جھنڈوں کا مظاہرہ تو کل کرنے والی ہے......''

''یہ کلکتہ کی خبروں کا اثر ہے......''

''سنا ہے کئی ہزار چھرے پکڑے گئے ہیں......''

''سنا ہے گول پیٹھا پر پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر کو ایک مسلمان پرانے جوتوں کا ہار پہنا رہا تھا......''

''سنا ہے بھنڈی بازار میں مسلمانوں نے کئی ہندوؤں کو مار ڈالا......''

''پر تم فکر نہ کرو۔ اب کے ہندو چپکے بیٹھنے والے نہیں ہیں......''

اتنے میں ایمبولنس کار کی گھنٹی کی آواز آئی اور سب کھڑکی کی طرف بھاگے۔ سامنے ہر کشن داس اسپتال کے دروازے میں زخمیوں کی موٹر داخل ہو رہی تھی۔ ایک گٹھے ہوئے جسم کے راہ گیر نے جو دھوتی اور میلی دھاری دار قمیص اور کالی مرہٹہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسپتال کے دربان سے پوچھا:

''یہ کون تھے؟ ہندو یا مسلمان؟''

دربان نے جو موٹر میں جھانک چکا تھا، جواب دیا:

''ایک مسلمان، دو ہندو۔''

اور فوراً کونے کے ہندو ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

ساری چرنی روڈ پر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہوٹل کے سب دروازے بند تھے۔ صرف بیچ والے لوہے کے جنگلے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ٹرام دیر ہوئی بند ہو چکی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ ہاں اوپر کی منزلوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب تناؤ تھا جیسے تنا ہوا ڈھول چوٹ پڑنے کا منتظر ہو۔

یکایک سینڈ ھرسٹ روڈ کے چوراہے کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہر شخص کی نگاہیں آواز کی سمت پھر گئیں۔ ایک دبلا سا نوجوان کرتا پاجامہ پہنے آ رہا تھا۔ بالکل بے فکر جیسے شہر میں فساد ہوا ہی نہیں تھا۔

''سالے کی ہمت تو دیکھو!'' ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں سے ایک آدمی نے کہا اور گٹھے ہوئے جسم کے آدمی کا ہاتھ دھاری دار قمیص کے نیچے اپنی میلی دھوتی کی تہوں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

بے فکر دبلا نوجوان اب وسنت کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ اس کے ململ کے کرتے میں سے اس کی ہڈیاں نظر آ رہی ہیں۔ سانولا رنگ، چھوٹا سا قد مگر اچھا ذہین چہرہ۔ کوئی کلرک یا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں نرمل کا جی چاہا، چلا کر کہے: ''میاں بھائی! ذرا سنبھل کے آگے جانا۔ بڑا خراب وقت ہے۔'' پر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور چشم زدن میں اس نے ایک چمکیلی چھری کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔

چھری دستے تک دبلے پتلے نوجوان کی کمر میں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ ایک بار بے اختیار اٹھے۔ شاید بچاؤ کرنے کے لیے۔ مگر اگلے لمحے میں وہ چکرا کر گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے ایک کراہتی ہوئی آواز نکلی جو فریاد بھی تھی اور آخری ہچکی بھی۔

''ہائے بھگوان!''

اور ہوٹل کے مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

''ارے یہ تو ہندو ہے ہندو۔''

''نہیں رے سالا بن رہا ہے۔''

''پاجامہ پہنے ہندو کیسے ہو سکتا ہے؟''

''سالے کا پاجامہ کھول کر ختنہ دیکھو۔''

چھری ابھی تک نوجوان کی کمر میں لگی ہوئی تھی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کئی آدمیوں نے بڑھ کر سسکتی ہوئی لاش کو پلٹ دیا اور ایک نے کمر بند کی ڈوری کو کھینچ کر گرہ کھولی۔

نرمل کی آنکھیں شرم سے بند ہو گئیں۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غلاظت کے ڈھیر میں اس کا منہ رگڑ دیا ہو۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل لاش کو پھر الٹ کر زخم میں سے اپنی چھری باہر کھینچ رہا تھا۔

''یہ تو مشٹیک ہو گیا۔''

اس نے کہا اور اپنی میلی دھوتی میں سے ایک کترن پھاڑ کر اس سے چھری کا خون پونچھنے لگا۔

چھری جب زخم سے باہر نکلی تو نرمل نے دیکھا کہ زخم سے سیاہی مائل گاڑھا گاڑھا خون بہہ نکلا اور مقتول نوجوان کے کپڑوں کو رنگتا ہوا سڑک پر پھیل گیا......

خون!

'خون خرابے، فساد، دنگے سے دور یہ کتنی سندر اور شانت دنیا ہے نرمل!''

بھارتی نے نرمی سے پریم سے نرمل کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ ایک لہر نے اسے خونی سمندر کے باہر کنارے پر لا پھینکا۔

''کیا؟ کیا کہا تم نے بھارتی؟''

''میں کہہ رہی تھی اجنتا کے ان خاموش پُرسکون غاروں میں ہم بمبئی کے خون خرابے سے کتنی دور معلوم ہوتے ہیں۔ کئی ہزار برس دور، یہاں تم ضرور ان خوفناک نظاروں کو بھول سکو گے جو تم نے بمبئی میں دیکھے ہیں......''

بچاری بھارتی! حسین اور حسن پرست بھارتی! اس کا دل پریم سے کتنا بھرپور تھا اور اس کا دماغ سمجھ بوجھ سے کتنا خالی۔ اسے نرمل سے واقعی محبت تھی اور وہ اسے ایک منٹ کے لیے بھی دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جس دن فساد شروع ہوا اس سے اگلے دن ہی وہ جان گئی کہ نرمل کا نازک اور حساس دماغ اس خون خرابے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چرنی روڈ کے خون کے بعد جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نرمل نے تین دن کھانا نہ کھایا اور نہ ہی وہ سو سکا۔ اس کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے کسی کو اس کی وجہ نہ بتائی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا بھی تو اس نے ٹال دیا۔ پر بھارتی سے وہ ہر بات کہہ دیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر نرمل نے اس خونیں واقعہ کی تمام ہولناک تفصیل اس کو سنا دی۔

''اس دبلے پتلے نوجوان کی صورت اب بھی میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ بھارتی! اس کی آخری چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس نے میری نیند اڑا دی ہے۔ رات کو سوتا بھی ہوں تو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک خون کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں اور کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔''

اور گھونگھر والے بالوں میں اپنی ملائم انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بھارتی نے کہا:

''بیچارہ نرمل!''

اپنی محبت، اپنی باتوں، سنیما، گراموفون، ریڈیو کس کس طرح سے اس نے اپنے دوست کے

دل سے اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ ناکامیاب رہی۔ نرمل کی شگفتگی، اس کی مشہور ظرافت، اس کی حاضر جوابی سرے سے غائب ہوگئی تھی۔ وہ جب کبھی بھی بھارتی سے ملنے آتا تو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا اور اس کی وحشت بھری آنکھیں ٹکٹکی باندھے فضا میں نہ جانے کیا دیکھتی رہتیں؟

''میں جانتی ہوں نرمل، تمھارے حساس دماغ کو کتنا گہرا گھاؤ لگا ہے۔ مگر بھگوان کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو اور اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کرو۔''

وہ جواب دیتا:

''ہاں بھول ہی جانا چاہیے۔'' اور وہ سوچتا: ''کون کون سے واقعات بھلانے کی کوشش کروں؟''

نرمل کمار قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل اور دماغ لے کر آیا تھا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں، مضامین، انشائے لطیف اور افسانے ملک کے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ امیر باپ کی بیٹی بھارتی اس کی ادبی قابلیت کی قدرداں اور مداح تھی۔ اس کا بس چلتا تو نرمل کے لیے کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوبصورت بنگلہ بنوادیتی، جہاں وہ سکون سے اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہتا۔ مگر وہ تو ایک روزانہ اخبار میں رپورٹر تھا۔ بھارتی اکثر کہتی کہ اس جیسے ادیب کے لیے جرنلزم اختیار کرنا سراسر ظلم تھا۔

نرمل کہتا ''موجودہ ہندستان میں ادبی تخلیق صرف دماغی تعیش ہے اور لکھنے والے کے لیے اخبار نویسی ہی پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔'' اس کے علاوہ رپورٹر کی حیثیت سے وہ زندگی کے ڈرامائی عناصر سے دوچار رہتا۔ عدالت کے مقدموں، تھانے کوتوالی کی وارداتوں، مزدوروں کی ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں میں اس کو انسانی سیرت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا اور یہی مشاہدات اس کے تخلیقی سانچے میں ڈھل کر ایسے مضامین، افسانے اور نظمیں بن جاتے تھے جن میں زندگی کی سچائی کی تڑپ اور زندگی کی روح نظر آتی تھی۔

رپورٹر کی حیثیت سے نرمل کو فساد کے زمانے میں بھی سارے شہر میں گھومنا پڑتا تھا۔ سینڈھرروڈ، بھنڈی بازار، پائیدھونی، بائیکلہ، بریل، دادر سارا شہر میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر محاذ پر خون اور قتل کے واقعات ہورہے تھے۔ یہاں ایک مسلمان ڈبل روٹی والا مارا گیا۔ وہاں ایک ہندو دودھ والے کو کسی مسلمان نے چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔ ایک پٹھان کا خون ہوا، وہاں ایک پوربی بھیا

قتل ہوا۔ یہاں ایک دس برس کے بچّے کو کسی نے ذبح کر دیا، وہاں ایک گیارہ برس کے بچّے نے ایک راہ چلتے آدمی کی پسلیوں میں چاقو بھونک دیا۔

سارا شہر ''ہندو بمبئی'' اور ''مسلمان بمبئی'' میں منقسم ہو گیا۔ کسی ہندو کی جرأت نہ تھی کہ بھنڈی بازار میں قدم دھر سکے۔ کسی مسلمان کی ہمت نہ تھی کہ پائیدھونی سے گزر سکے۔ پاکستان اور اکھنڈ ہندستان قائم ہو گئے تھے۔ نرمل اور دوسرے رپورٹروں کو اکثر پولیس یا فوج کے ساتھ لاریوں میں گشت کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن ایک گورے سارجنٹ نے نرمل سے کہا:

''تم کانگریسی پاکستان نہیں چاہتے؟ پھر بھی اس وقت بمبئی میں پاکستان قائم ہے یا نہیں؟''

اگلے دن ایک انگریز ٹامی نے نرمل اور اس کے ساتھی رپورٹروں سے کہا:

''تم لوگ تو کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگاتے تھے نا؟ ہم سے کہتے تھے کہ نکل جاؤ، ہندستان چھوڑ دو۔ اب ہم چھوڑنے کو تیار ہیں تو کیوں ہماری خوشامد کرتے ہیں کیوں ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو؟ ہماری حفاظت کا مطالبہ کرتے ہو؟ ہندو کہتے ہیں ہمیں مسلمانوں سے بچاؤ۔ مسلمان کہتے ہیں ہمیں ہندوؤں سے بچاؤ۔ پر دونوں ہماری حفاظت، ہماری توپوں اور بندوقوں کے محتاج ہیں۔ دونوں کہتے ہیں Dont quit India'' اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے ہندستان کی آزادی کا محل اڑاڑا دھم گر پڑا ہو۔ جیسے پچھلے سو برسوں کی تمام قومی روایتیں ایک لمحے میں مٹی میں مل گئی ہوں...... ترک موالات اور تحریک خلافت، سودیشی اور بائیکاٹ، جلیان والا باغ کی قربانی، گاندھی جی اور علی برادران، بھگت سنگھ، ستیہ گرہ اور سول نافرمانی...... تمام نعرے اور قومی گیت ہندستان کا اتحاد اور ہندستان کی عزت اور آبرو...... آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری...... ہر چیز مٹی میں مل گئی ہو۔

''مٹی میں مل کر بھی اس کندن کی چمک نہیں گئی۔'' گائیڈ بک رہا تھا۔

''اجنتا ہندستان کے آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری کا لافانی شاہکار ہے۔'' بھارتی کہہ رہی تھی۔

مگر نرمل کو اس اندھیرے غار میں بجلی کی پیلی پیلی روشنی کے گھیرے میں بھی سوائے پھیکے پھیکے رنگوں کے چند بے معنی دھبوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ نہ حسن، نہ آرٹ، نہ معنی، نہ مقصد۔ بجائے احساس حسن کے اس کا دل ایک عمیق غصے، ایک بے پناہ نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چلّا اٹھتا:

''یہ سب کیوں؟ یہ ہزاروں آدمیوں کی ہزاروں برس کی محنت کیوں؟ اور کس لیے؟ یہ پہاڑ

کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری کیوں......؟ اور کس لیے؟ بے کار ہیں یہ سب۔ یہ ساری محنت بے کار تھی۔ دنیا کے لاکھوں برس کے ارتقا میں ایک لغو اور مضحکہ خیز لمحہ......بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تا کہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے......اجنتا سے ہندستان نے نہ کچھ سیکھا ہے اور نہ سیکھے گا۔ یہ غار دنیا سے، اصلیت سے، سچائی سے فرار کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اجنتا نہ صرف بے کار ہے بلکہ ایک زبردست جھوٹ ہے، دھوکہ ہے، فریب ہے۔

گائڈ نرمل کے خوفناک خیالات کی رو سے بے خبر اپنی رواں رواں کیے جا رہا تھا۔

''یہ دیکھیے مہاتما بدھ گھوڑے پر چڑھے بازار میں سے گزر رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر کتنی شانتی ہے——اور دیکھیے یہ عورتیں۔ اپنے اپنے گھروں پر سے ان کو کتنی معتقدانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔'' اور بھارتی کہہ رہی تھی:

''نرمل دیکھو! ان عورتوں کے چہرے پر کتنی حسین وجدانیت طاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت اور ان کی ماں متا کو کچھ اجنتا کے آرٹسٹ ہی سمجھے ہیں......''

''ہندستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت، ان کی ماں متا۔''

نرمل کا دل چاہا کہ قہقہہ مار کر اتنے زور سے ہنسے کہ غار کی پتھریلی دیواریں لرز اٹھیں، یہ چٹانیں تھرتھرا جائیں۔ یہ غاروں کا سلسلہ اس کے نعرۂ حقارت سے گونج اٹھے۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ماں متا۔ جھوٹ، سراسر جھوٹ۔ دھوکہ، خود فریبی۔

نرمل نہ کمیونسٹ تھا اور نہ کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھتا مگر ایک دن وہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں پارٹی سکریٹری پورن چند جوشی کا بیان لینے گیا تھا کہ یکا یک سڑک کی طرف سے کچھ شور کی آواز آئی اور سب کھڑکیوں کی طرف بھاگے۔ جھانک کر دیکھا تو ایک بوڑھا سفید داڑھی والا بوری مسلمان اپنے خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ اور ساتھ کے مکان کی بالکنی پر اور اس کی نچلی منزل کی دہلیز پر مرہٹہ عورتوں کا ایک گروہ کھڑا ہنس رہا تھا جیسے کوئی نہایت دلچسپ اور مزے دار تماشا ہو رہا ہو۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح! اس کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ماں متا!!!!

ایک ریڈ کراس کی موٹر آئی اور بوڑھے بوری مسلمان کی لاش کو اٹھا کر لے گئی اور سامنے والے مکان میں سے ایک مرہٹی عورت بالٹی ہاتھ میں لٹکائے نکلی اور جہاں بوڑھے کا خون گرا تھا، وہاں نہایت اطمینان سے پانی بہا کر سڑک کو دھو گئی۔ اور کئی روز نرمل کے کانوں میں ان عورتوں کے قہقہے ایک خوفناک شور بن کر گونجتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس بوڑھے کی سفید داڑھی جو خود کے خون سے رنگین ہوگئی تھی، ایک بھیانک بگولہ بن کر پھڑ پھڑاتی رہی اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ تمام ہندستان کی عورتیں کسی ایسے خوفناک اور خونی مذاق پر ہنس رہی ہیں، جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح! اس کی شانت آتما!!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!

نرمل کے بہت سے دوست مسلمان تھے۔ مگر فساد کے دنوں میں وہ ان کے محلوں میں نہیں جا سکتا تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی رپورٹر اور دوست حنیف کو سخت بخار اور سرسام ہو گیا ہے۔ نرمل سے نہ رہا گیا اور بھنڈی بازار پہنچ ہی گیا۔ جہاں ایک چال میں حنیف اکیلا رہتا تھا۔

کرافورڈ مارکیٹ پر سوائے نرمل کے تمام ہندو بس سے اتر گئے۔ وہ خود کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کی وضع قطع سے یہ ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ سے بعض تو اسے پارسی سمجھتے تھے۔ مگر پھر بھی جوں جوں بس بمبئی کے ''پاکستانی'' علاقے میں جا رہی تھی، اس کا دل خوف اور پریشانی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا ہٹا کٹا ''غنڈہ نما'' مسلمان نوجوان اس کے دل کی دھڑکن سن کر سمجھ جائے گا کہ روڈ پر اس دبلے پتلے نوجوان کو ایک ہندو غنڈے نے ''مشٹیک'' سے مار ڈالا تھا۔ اور دفعتاً نہ جانے کیوں اس کی کمر کی ریڑھ کی ہڈی کے پاس کھجلی سی محسوس ہونے لگی اور ایک خیالی چاقو کا تیز پھل اس کی پسلیوں میں پیوست ہوتا گیا۔

باٹلی والا اسپتال کے پاس وہ بس سے اتر کر پٹری پڑی چلا تو اسے چاروں طرف قاتل ہی قاتل نظر آئے۔ وہ چھابڑی والا جو کیلے اور موسمبیاں بیچ رہا تھا، نہ جانے وہ کس وقت اپنا ترکاری کاٹنے والا چاقو ایک ہندو کی کمر میں پیوست کر دے۔ وہ خوفناک لال داڑھی والا پٹھان تو ضرور ایک ''کافر بچے'' کی تلاش میں ہوگا۔ پشت سے پتھریلی سڑک پر کھٹ کھٹ قدم قریب آتے ہوئے سنائی دیے۔ نرمل نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس برقعہ میں کوئی ''غنڈہ'' ہی چھپا ہوا

ہوا اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا حنیف کی چال کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

حنیف سرسامی کیفیت میں بے ہوش پڑا تھا۔ نرمل کو اس کے پاس شام تک ٹھہرنا پڑا۔ جب حنیف کی حالت کسی قدر بہتر ہوگئی اور اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا، اسی وقت ایک سپاہی بھونپوں میں پکارتا ہوا وہاں سے گزرا کہ شام کے پانچ بجے سے کئی علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کا کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ کوئی گھر سے نہ نکلے۔ کیونکہ گشتی فوجیوں کو سرراہ چلنے والوں پر گولی چلانے کے احکامات دے دیے گئے ہیں۔ نرمل نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس منٹ تھے۔ اتنی دیر میں اس کا شیواجی پارک پہنچنا ناممکن تھا۔ چارو ناچار اس نے رات حنیف کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

حنیف کا کمرہ کنارے پر تھا۔ ایک کھڑکی میں سے بڑی سڑک نظر آتی تھی۔ دوسری ایک گلی میں کھلتی تھی۔ سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ ایک پوربی ''دودھ والا بھیا'' جس کی لمبی چوٹی دور دور سے پکار کر کہتی ہے کہ ''میں ہندو ہوں۔'' کندھے پر بہنگی، جس میں دودھ کی گڑویاں رکھی ہوئی ہیں، سراسیمہ نظروں سے ادھر ادھر آگے پیچھے دیکھتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اور اس چرنی روڈ والے واقعہ کی طرح نرمل کا پھر بے اختیار جی چاہا کہ چلا کر ''دودھ والے بھیا'' کو خطرے سے آگاہ کردے۔ مگر اس بار پھر الفاظ اس کی زبان پر جم گئے اور چشم زدن میں تین تنگڑے تہمد بند جوانوں نے اس دبلے پتلے کالے پوربی کو گھیر لیا۔

''کہاں جاتا ہے بے کافر کے بچے؟''

دودھ والے بھیا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شاید اسے ان تینوں کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ وہ واپس مڑا۔ اُدھر بھی غنیم کا ایک گروہ کھڑا ہوا اس کی طرف قاتلانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ہرن کی طرح جو ہر طرف شکاریوں سے گھر گیا ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مایوس آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دفعتاً وہ اس گلی کی طرف بھاگا اور اس کے تعاقب میں پانچ شکاری کتے ــــــ!

نرمل بھاگ کر گلی والی کھڑکی کی طرف گیا۔ مگر ابھی وہ ادھر پہنچ نہ پایا تھا کہ دودھ والے بھیا کے خود اپنی بہنگی میں الجھ کر گرنے کی آواز آئی۔ پیتل کی گڑویاں ایک جھنکار کے ساتھ سڑک پر اوندھ گئیں اور ان کا دودھ ایک سفید نہر بن کر بہہ نکلا۔ جب نرمل نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اس سفید دودھ میں پوربی کا سرخ خون مل چکا تھا۔

''بھاگ کر جاتا تھا سالا''

اور پھر نرمل نے برابر کے کمرے سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنی:

''اری او گل بانو! دیکھ تو سہی، ایک کافر ہماری گلی میں مارا گیا ہے......'' جیسے کوئی کہہ رہا ہو:

''اوری او گل بانو! مبارک ہو۔ ہماری گلی والوں نے آج کتنی بہادری کا کام کیا ہے!'' اور پھر تین چار جوان، ادھیڑ، بوڑھی عورتوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں۔''اری اس کی چٹیا تو دیکھ!''

''اچھا ہوا یہ سب پوربیے دودھ میں برابر کا پانی ملاتے ہیں۔اب سزا ملی ہے۔''

''گرگام میں جو مسلمان مارے گئے ہیں ہمارے آدمی بھی ان میں سے ایک ایک کا بدلہ لیں گے۔''

اور پھر ان ہی میں سے کوئی عورت اندر گئی اور گھر بھر کا کوڑا، ترکاری کے چھلکے، انڈوں کے خول، گوشت کے چھیچھڑے اور ہڈیاں گلی میں لوٹ دیا۔ عین وہاں جہاں مکھیوں نے پوربی بھیا کے دودھ اور خون پر بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی آتما!!! ان کی نزاکت!!! ان کی ماتا!!!

سینڈ ھرسٹ روڈ والی عورتوں اور بھنڈی بازار والی عورتوں کے خونی قہقہے مل کر نرمل کے لاشعور پر ایک مہیب گونج بن کر چھائے ہوئے تھے۔ وہی گونج اسے اب تک اجنتا کے ان غاروں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ دھندلی پھیکی رنگ کی تصویروں میں اسے ہر دیوی ہر اپسرا، ہر راج نرتکی، ہر عورت کے چہرے پر ایک شیطانی خوشی اور اس کی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک نظر آئی۔ اور نرمل کا دل عمیق نفرت سے بھر گیا۔

''میں ہر عورت سے نفرت کرتا ہوں۔'' وہ سوچ رہا تھا:''ہر عورت سے یہاں تک کہ بھارتی سے بھی— بھارتی— جو اس سے محبت کرتی تھی اور جس سے مدت سے وہ بھی محبت کرتا تھا، بھارتی جو نرمل کو اور اس کی حساس طبیعت کو اپنی دولت کی پناہ میں رکھنا چاہتی تھی جو بمبئی اور اس کے کشت و خوں کے ماحول سے نرمل کو تقریباً زبردستی بھگا کر اجنتا لے آئی تھی۔ محبت۔ نفرت، نفرت۔ محبت۔ ہم بھائی بھائی ہیں۔ ہم عاشق و معشوق ہیں۔ ہم دوست ہیں۔ ہم دوست اور ساتھی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں منسلک ہیں۔ مگر ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی کمر میں چھرا گھونپتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں......

''دیکھیے یہ لاشیں دیکھیے۔ سر الگ اور دھڑ الگ۔''

گائیڈ اپنی رُوں رُوں کیے جا رہا تھا۔ بولتے بولتے اس کو پسینہ آ گیا تھا مگر اس کی آواز نہ تھکتی تھی — اور بھارتی — نازک، نفاست پسند، حساس نرم دل بھارتی — غار کی دیوار پر تصویر ہی میں لاشیں دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اُڑا جا رہا تھا۔

''اس ظالم راجہ نے سب کو قتل کر دیا ہے۔ سر کٹوا کر لاشیں اس گڈھے میں پھنکوادی ہیں۔ چیلوں، گدھوں کے کھانے کے لیے......''

اور نرمل کے دماغ میں یہ غیر متعلق خیال رینگتا ہوا چلا آیا کہ دراصل راجہ ظالم نہیں تھا بلکہ شاید اسے گدھوں، چیلوں کا بڑا خیال تھا۔ ان کو خوراک بہم پہنچانے کے لیے اس نے ان سب لوگوں کو مروا کر ان کی لاشیں یہاں ڈلوادی تھیں۔ اس کے ظلم میں کم سے کم مردار خور جانوروں کا تو بھلا تھا......

لاشیں......!

ستائیس ٹھنڈی، مسخ شدہ کالی اور نیلی لاشیں، جو ٹھنڈے پتھر کے فرش پر اس طرح بکھری ہوئی پڑی تھیں جیسے فصل کٹنے کے وقت کسی کسان نے گیہوں کی بالیاں کاٹ کر کھیت میں چھوڑ دی ہوں...... جیسے مذبح خانے میں ستائیس بکروں کی کھال اتار کر ایک قطار میں لگا رکھا ہو...... جیسے...... جیسے ستائیس انسانی لاشیں بکھری ہوئی ہوں!

نرمل اخبار کے لیے رپورٹ لینے اسپتال گیا تھا اور وہاں اسے پتہ چلا کہ کس کمرے میں فساد کے مقتولین کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور کورونر کے فیصلے کے لیے رکھی گئی ہیں۔ اس نے عمر بھر میں صرف ایک بار ایک لاش میڈیکل کالج کے سرجری وارڈ میں رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ تب بھی تین وقت اس نے کھانا نہ کھایا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی مردہ آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں۔ مگر یہاں ایک لاش نہیں ستائیس لاشیں رکھی تھیں۔ بوڑھے جوان، بچّے، سوکھے ہوئے جسم، کسی کی کمر میں گھاؤ، کسی کی آنتیں پیٹ سے باہر نکلی ہوئی، کسی کی گردن سے سر جدا۔ دھڑ کے قریب رکھا ہوا، کسی کا بھیجا پھٹے ہوئے سر میں سے باہر ابلتا ہوا۔ ان میں سے کون ہندو تھا؟ اور کون مسلمان؟ موت کی برادری میں سب ایک تھے۔ قاتل کی چھری نے سب کو برابر برابر لٹا دیا تھا۔ یہ ٹھنڈا پتھریلا فرش۔ یہ تھا ان کا پاکستان اور ان کا ہندستان۔ یہ بیکار موت۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ یہ سناٹا۔ یہ بے چارگی — یہ تھی ان کی آزادی۔ یہ تھا ان کا اسلام اور یہ تھا ان کا ویدک دھرم — جے جے مہادیو — اللہ اکبر!

نرمل عملی سیاست سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ علاوہ اخبار کے کام کے جو وہ پیٹ کی خاطر کرتا تھا۔ وہ عمل کے میدان کا دھنی نہیں تھا۔ اس کی دنیا خیالات اور محسوسات کی دنیا تھی۔ پھر بھی فسادات شروع ہونے کے تیسرے دن ہی وہ اپنے محلے کے شانتی دل میں شامل ہو گیا تھا اور شاید اس لیے کہ اس کا تعلق ایک اہم روزانہ اخبار سے تھا اور شانتی دل ہو یا سیوا سماج ہو، یا خدام وطن، ہر پبلک جماعت کو پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو کمیٹی کا ممبر بھی چن لیا گیا تھا۔ نرمل کا دوست اور ہمسایہ احمد جو ایک دوسرے اخبار میں سب اڈیٹر تھا، وہ بھی کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا تھا۔ اس لیے کہ تمام شیواجی پارک کے علاقے میں وہی صرف اکیلا مسلمان تھا جو شانتی دل میں شامل ہوا تھا اور ایسی کمیٹیاں سرکاری منظوری نہیں حاصل کر سکتیں جب تک ان میں سب فرقوں کے نمائندے موجود نہ ہوں۔

چند روز تک نرمل شانتی دل کی تنظیم کے کام میں مستغرق رہا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ فساد کے اثر سے اس پر جو ایک مہلک جمود اور گھٹے گھٹے غم اور بے بسی کی حالت طاری ہو گئی تھی، وہ اب جاتی رہے گی۔ شانتی دل میں شامل ہو کر اس کی وہی وجد آفریں مسرت حاصل ہوئی جو ایک سپاہی کو طبل جنگ سن کر ہوتی ہے۔ یہ جنگ تاریکی اور روشنی کے درمیان تھی۔ غارت گری اور امن کے درمیان۔ وہ اس جنگ میں ایک سپاہی تھا۔ وہ شیطانی تعصبات اور درندگی کے خلاف جہاد میں شریک تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس جنگ میں کوئی کارہائے نمایاں نہ کر سکے مگر کم سے کم اس کو یہ تسلی تو تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے کہ اس کی زندگی بالکل بے کار، بے معنی اور بے مقصد تو نہیں ہو گئی ہے۔

بھارتی نے کئی بار نرمل سے کہا:

''چلو بمبئی سے باہر کہیں چلے چلیں۔ جب فساد ختم ہو جائے گا تب آ جائیں گے۔''

آگرہ، دہلی، کشمیر، اجنتا، ایلورہ، میسور، سیلون نہ جانے کہاں کہاں جانے کا لالچ دلایا۔ مگر نرمل کو ایسے وقت بمبئی چھوڑ کر باہر جانا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بزدلی معلوم ہوئی۔ بھارتی نے لاکھ سمجھایا کہ اس جیسے حساس آرٹسٹ کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنا، اس کی خداداد ذہانت کی تحقیر تھی۔ مگر وہ نہ مانا اور سوائے دفتر کے اوقات کے سارے دن اور رات کا بیشتر حصہ شانتی دل کے کام میں صرف کرتا رہا۔

شانتی دل کا کام؟ نرمل سمجھا تھا کہ اس کا کام واقعی شانتی کا پرچار ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ شانتی دل کے ممبر گھر گھر جائیں گے اور لوگوں کو امن اور شانتی سے رہنے کی تلقین کریں گے۔ آپس

میں فرقہ داوارنہ منافرت کو دور کر کے یگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ شہر میں خود ان کے علاقے میں ہر دم ہر قسم کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ماہم کے مسلمان شیواجی پارک کے ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ شیواجی پارک کے ہندو ماہم کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ہندو دودھ والے، دودھ میں زہر ملا کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ مسلمان ترکاری والے بینگنوں اور موسمبیوں میں زہر کے انجکشن دے کر ہندوؤں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ایرانی ہوٹلوں کی چائے مت پیو، اس میں زہر ہے۔ ہندو حلوائی کی مٹھائی مت کھاؤ، اس میں زہر ہے۔ جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ اور تعصب اور نفرت کا ایک طوفان جس میں تمام شہر ڈوبا جا رہا تھا۔ نرمل اور اس کے دوست احمد کو امید تھی کہ شانتی دل کا پہلا کام ہوگا اس خونی سیلاب کو روکنا، مگر جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

شانتی دل کا پہلا کام۔ چندہ جمع کرنا...... احمد کے ساتھ نرمل ہر کسی کے ہاں گیا۔ گنتی کے چند مسلمان تھے۔ انھوں نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یہ شانتی دل کے پردے میں ہندو کیا کر رہے ہیں؟ ہم خوب جانتے ہیں...... ہم نے اپنی حفاظت کے لیے پٹھان رکھ لیے ہیں......''

بعض ہندوؤں نے کہا:

''آپ کے نہتے والنٹیر ہماری حفاظت کیا خاک کر سکتے ہیں؟ ہم سکھ دربان رکھ رہے ہیں۔''
اور پھر رازدارانہ لہجے میں ''سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں، کیا سمجھے۔''

خیر — چندہ جمع کیا گیا۔ بیس پہرے دار پچاس پچاس روپے ماہوار پر ملازم رکھے گئے۔ کمیٹی میں مسئلہ درپیش ہوا کہ ان کو کہاں کہاں ڈیوٹی پر لگایا جائے؟

''ایک ایک آدمی ہر سڑک کے ناکے پر لگایا جائے۔''

''نہیں — یہ حماقت ہوگی۔ حملہ صرف تین طرف سے ہو سکتا ہے۔ یا ماہم کی طرف سے، یا ورلی کی طرف سے، یا سمندر کی طرف سے۔ صرف ان ناکوں پر پہرہ لگانا چاہیے۔''

''حملہ —؟ کس کا حملہ؟''

مسلمان اگر حملہ کریں گے تو اور کدھر سے حملہ کریں گے؟''

''پر ان پہرے داروں کا کام کیا ہوگا؟''

''ان سے کہہ دیا جائے کہ جیسے ہی کسی مسلمان غنڈے کو دیکھیں تو سیٹی بجا دیں تاکہ چاروں

طرف سے لوگ جمع ہو جائیں۔''

''صرف مسلمان غنڈے؟ اور اگر ہندو غنڈے ہوں تو؟''

نرمل نے یہ سوال کیا تو، مگر وہ احمد سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

کمیٹی کے جلسے کے بعد اس نے احمد سے کہا:

''یہ تمھاری ہی ہمت ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام کر سکتے ہو۔ مجھے تو یہ سب مہا سچائی معلوم ہوتے ہیں۔''

احمد نے کہا:

''ایسے بیوقوفوں اور جاہلوں کی کمی دونوں طرف ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ماہم کے مسلمانوں میں کیا کیا افواہیں مشہور کی جارہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیواجی پارک میں شانتی دل کے نام سے ہندوؤں کی ایک فوج تیار کی جارہی ہے جو بہت جلد ماہم کے مسلمانوں پر شب خون مارے گی۔''

چندہ، والنٹیر، محافظ، وردیاں، سیٹیاں، جلسے، رزولیوشن، پولس کمشنر کے نام عرضیاں۔ مگر شانتی دل کا پرچار؟ اتحاد کا پروپیگنڈہ؟ ان کا نام نہیں تو پھر شانتی دل کا مقصد؟ اس دوڑ دھوپ سے فائدہ؟ مسلمان غنڈے — ہندو غنڈے — گھروں میں پتھر جمع کر کے رکھو۔'' میں نے تو دس لاٹھیاں چھپا رکھی ہیں۔ میرے ہمسائے کے پاس پستول ہے۔''

شانتی! شانتی!! شانتی!!!

''یہ شانتی کا مہا ساگر ہے، نرمل'' بھارتی کہہ رہی تھی۔ اگر ہم آٹھ دس دن تک روز یہاں آ کر کئی گھنٹے گزارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ تمھارے بے چین دل کو ضرور شانتی ملے گی۔''

اور گائیڈ کہہ رہا تھا:

''آپ نے سب غار دیکھ لیے ہیں۔ اب ایک باقی رہ گیا ہے۔ مگر اس میں آپ کو دوسرے غاروں کی طرح سنگتراشی اور مصوری کے نادر اور حسین نمونے نہیں ملیں گے۔ چھت، ستون، فرش ہر چیز نامکمل ہے۔ اس غار کا کام ادھورا رہ گیا......''

''ادھورا کام! وہ — نرمل بھی تو بمبئی میں اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ بلکہ ادھورے سے بھی کم — ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے ہار مان لی تھی۔

شانتی دل کمیٹی کا آخری جلسہ۔

نرمل نے شروع ہی سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بجائے معمولی ان پڑھ اور اجڈ دربانوں اور

چوکیدارں کے آزادفوج کے سابق سپاہیوں کو معقول مشاہرے پر حفاظت کے لیے رکھا جائے کیوں کہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک اور بالا تھے۔ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا اور وہ اپنی پرانی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے مدد کے مستحق تھے۔شانتی دل کے سکریٹری نے اس جلسے میں بیان کیا کہ پرانے تمام پہرے دار علیحدہ کر دیے گئے ہیں اور ان کی بجائے چودہ آزاد ہندفوج کے سابق سپاہی رکھ لیے گئے ہیں۔ یہ سن کر زمل کا حوصلہ بڑھ گیا۔اسے ایسا معلوم ہوا کہ اب شانتی دل کا کام صحیح طریقے پر ہوگا۔مگر ایک لمحے ہی میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

ایک بوڑھے مرہٹہ وکیل نے سوال کیا:

''کیا یہ سچ ہے کہ آزاد ہندفوج کے ان سپاہیوں میں مسلمان بھی ہیں؟''

سکریٹری نے کہا:

''ہاں،مگر صرف ایک۔''

ایک موٹے گجراتی سیٹھ نے کہا

''میرے حلقے میں اس بات پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔''

ایک دبلے سوکھے مارواڑی نے کہا:

''یہ تو گجب کی بات ہے۔''

بوڑھے وکیل نے اونچی آواز میں کہا۔

''میں سکریٹری صاحب سے اس معاملہ میں جواب طلب کرتا ہوں کہ کیوں ایک مسلمان کو رکھا گیا؟''

گجراتی سیٹھ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''اگر ایسا ہوگا تو ہم لوگ ایک پیسہ چندہ نہیں دیں گے۔''

ایک پستہ قد ڈاکٹر نے کہا؛

''میرے حلقے کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان......''

دُبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

''یہ ہماری استریوں کی اجت کا سوال ہے۔''

بوڑھے وکیل نے کہا:

''میں جواب طلب کرتا ہوں......''

پریسیڈنٹ نے کہا:

''خاموش، خاموش''

سکریٹری نے کہا:

''میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آزاد ہند فوج میں ہندو مسلمان کی تفریق نہیں کی جاتی۔ لیکن اگر کمیٹی کی رائے یہی ہے تو ہم کسی بہانے سے اس مسلمان سپاہی کو علیحدہ کر سکتے ہیں۔''

سب نے بیک وقت شور مچایا:

''ہاں ہاں۔ فوراً، ایک دم۔ اس کو رکھا ہی کیوں؟'' صرف احمد خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں احمد کو اطمینان سے مسکراتے دیکھ کر زمل کے صبر کا پیمانہ دفعتاً لبریز ہو گیا۔ اس کے دماغ کے اندر کی کوئی کلی دفعتاً تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

''نہیں، نہیں!!'' وہ غیر معمولی جوش سے چلّایا۔ سکریٹری جو جلسے کی روئداد میں یہ الفاظ لکھنے میں مصروف تھا، کہ ''یہ تجویز بلا مخالف پاس کی گئی کہ آزاد ہند فوج کے جن سابق سپاہیوں کو حفاظت کے لیے رکھا جائے، ان میں کوئی مسلمان نہ ہو......'' اپنی کرسی سے تقریباً اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھ سے قلم گر پڑا اور سفید کاغذ پر جہاں ان کی تجویز کے الفاظ لکھے گئے تھے، وہاں روشنائی کا ایک بڑا دھبہ پڑ گیا......

''نہیں! نہیں!! نہیں!!!'' جیسے اس ایک لفظ کے دس بار دہرانے سے باقی دس ممبروں کی رائے منسوخ ہو جائے گی، میں ایسی تجویز کی کبھی کسی حالت میں بھی موافقت نہیں کر سکتا۔''

زمل کے الفاظ کی والہانہ شدت نے چند لمحوں کے لیے سب کو خاموش کر دیا مگر اس خاموشی میں اسے اپنی آواز کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہوئی۔ ''ایسی تجویز ہمارے لیے باعث شرم ہو گی۔ ہم شانتی اور اتحاد کے نام لیوا ہیں۔ مگر ہم خود بدترین فرقہ وارانہ تعصب کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ تجویز پاس ہوئی تو اس معاملے کو میں پریس اور پبلک کے سامنے رکھنا اپنا فرض سمجھوں گا۔''

اور احمد مسکرائے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو:

''شاباش بچے۔ مگر یہ سب بے کار ہے۔''

دبلے مارواڑی نے مخالف کی حیثیت سے کہنا شروع کیا:

''مسٹر زمل کو نہیں معلوم کہ ہم ہندو کتنے خطرے میں ہیں............''

گجراتی سیٹھ نے کہا:

''ہم تو صاف بولیں گے۔ اگر مسلمان رہے گا تو ہم چندہ نہیں دیں گے۔''

پستہ قد سیٹھ نے کہا:

''ہم استعفیٰ دے کر ہندومہا سبھا کے شورکھشن دل میں مل جائیں گے۔''

مگر چالاک بوڑھے وکیل نے دوسروں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتے ہوئے نرمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مسٹر نرمل! ایک بات بتائیے یہ ہندو علاقہ ہے۔ اگر یہاں پہرہ دیتے ہوئے اس بیچارے مسلمان سپاہی کو کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو کون ذمے دار ہو گا؟ آپ؟'' اور یہ کہہ کر اس نے گجراتی سیٹھ اور پستہ قد ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ گویا کہہ رہا ہو کہ ''دیکھا میرا قانونی پینترہ۔ ایسے ایسے لونڈے میں نے بہت دیکھے ہیں......''

احمد نے مسکرا کر نرمل کی طرف دیکھا اور نظروں میں کہا:

''میں نے کہا نہیں تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے......''

تجویز پاس ہو گئی۔ نرمل بپھرا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ دعوے دلائل، منطق، سیاست۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس تعصب اور جہالت کی دیوار پر سر پٹخنا لا حاصل ہے۔ اس کے چاروں طرف آوازوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ تجویزیں پاس ہوتی رہیں۔ بحث مباحثے ہوتے رہے۔ حسب معمول مختلف ممبروں اور عہدے داروں میں سخت کلامی بھی ہوتی رہی۔ مگر نرمل نے نہ کچھ کہا نہ سنا۔

اس کا دماغ خوفناک خیالات اور مناظر کا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، نوا کھالی، بہار، قتل، خون، خون کی ندیاں، خون کے دریا، خون کا سمندر، نفرت اور تشدد، تعصب اور نفرت۔ عورتوں کی بے حرمتی، بچوں کی لاشیں، لاشوں کے پہاڑ، ایک خونین آسمان کی طرف لپکتے ہوئے ہزاروں شعلے......اور ایک کلدار ہتھوڑے کی طرح یہ خیال اس کے دماغ پر چوٹ لگاتا رہا کہ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ شیوا جی پارک شانتی دل کے ممبر آزاد ہند فوج کے ایک مسلمان سپاہی کو اپنی حفاظت کے لیے رکھنے کو تیار نہیں ہیں......

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ آزاد ہند فوج کے شاندار تاریخی کارنامے بے کار تھے۔ تمام جنگ آزادی بے کار تھی۔ تمام دیش بھگتوں اور شہیدانِ وطن کی قربانیاں بے کار تھیں۔ تمام قومی نعرے، تمام تحریکیں، تمام قومی لیڈر، ہر شخص بے کار تھا۔ ہر چیز بے کار تھی۔ شیوا جی پارک شانتی دل بے کار

تھا۔اس سلسلے میں نرمل کا کام بے کار تھا۔اس کا بمبئی میں رہنا بے کار تھا۔اس کی زندگی ہی بے کار تھی......اس لیے کہ ہندو اور مسلمان کے ٹھپے آزادی اور ہندستان سے زیادہ اہم ثابت ہوئے تھے۔

اسے شانتی دل کمیٹی کے وہ سب ممبر اس وقت تعصب اور نفرت اور خطرناک جہالت کے دیوتا معلوم ہوئے جو اپنی آتشیں آنکھوں سے اس کو گھور رہے تھے جو اسے بھسم کر لینے کے لیے اس کی طرف بڑھے آرہے تھے۔ وہی دس نہیں، بلکہ ہر طرف سے لاکھوں راکھششوں کے دل کے دل اس کی طرف بڑھے آرہے تھے۔ان میں چوٹی والے بھی تھے اور داڑھی والے بھی۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی، بنگالی، بہاری، مرہٹہ، گجراتی، پنجابی، پوربی، پٹھان اور سب اس کے خون کے پیاسے۔

''بھاگ''

نرمل کے دھڑکتے ہوئے دل نے اسے للکارا۔

''بھاگ''

اور نرمل نہ صرف جلسے کے ختم ہونے سے پہلے ہی شانتی دل کے دفتر سے بھاگا بلکہ ایک دن بھارتی کے ساتھ بمبئی سے بھی بھاگ آیا۔

''کہاں چلیں؟'' بھارتی نے پوچھا۔

''جہاں یہ قتل و خون نہ ہو۔ جہاں اخبار نہ ہو، ریڈیو نہ ہو، جہاں ہندو نہ ہوں، مسلمان نہ ہوں، جہاں چاقو، چھریاں، برچھے، بھالے، تیزاب، غنڈے، موالی نہ ہوں۔ دور — دنیا اور زندگی سے دور —!''

اور بھارتی نے سوچ کر کہا:

''اجنتا؟''

احمد نرمل کو چھوڑنے اسٹیشن پر آیا۔گاڑی چلنے لگی تو اس نے کہا:

''اچھا ہے، چند روز کے لیے تبدیل آب و ہوا کر آؤ۔مگر اگلے اتوار کو شانتی دل کا جلسہ ہے، جس میں چند تجویزیں پیش کرنے والا ہوں۔اس میں تمھاری موجودگی ضروری ہے۔''

اور جب نرمل نے کہا:

''میں اب شانتی دل کے جلسے میں کبھی نہ جاؤں گا۔''

تو احمد نے چلتی ریل کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا تھا:

''تم اس کام کو ادھورا چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے، نرمل۔''

''ادھورا کام!''

ہنہ۔ یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصور۔ یہ بھی تو اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں؟ کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو سو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟

''تمھارا کیا خیال ہے بھارتی......؟''

پر بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی، غلام گردش میں گھوم کر پھر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آ کر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہو گا کیونکہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی ہے وہ کالی پڑ چکی تھی۔ شاید آفتاب غروب ہو چکا تھا...... ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لیے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لیے آ رہا تھا، وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے کونے میں چلا گیا ہو اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے جو آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی جھول میں سے ایک چھینی ایک ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے منڈے ہوئے سروں کے درجنوں بھکشو مشعلیں لیے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں اور ہتھوڑے

نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہو گئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تاکہ جب دیوار اُکھڑ جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں۔ اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

''معاف کیجیے گا، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں۔ مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہی ہے اور یہ ادھورا ہی رہے گا۔''

''دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے۔ انسان بھی ادھورا ہے۔ مگر ان کی تکمیل ہونی چاہیے۔''

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا:

''آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟''

''نو سو برس سے۔''

''نو سو برس سے؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر..........''

''میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔''

''آپ کا نام؟'' نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

''میرا نام؟ ہم سب بے نام ہیں۔''

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصور کا نام کھدا ہوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

''پھر آپ کس لیے اتنا کام کرتے ہیں؟''

''کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا۔ انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے۔''

تو یہ کام کب ختم ہوگا؟''

''کون جانتا ہے۔''

''اس غار کو..........''

''پورا ہونے میں دو سو برس لگیں گے۔ اس کے بعد دوسرا غار اور اس کے بعد تیسرا......''

''تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟''

''ہوگی — جب انسان کی تکمیل ہوگی۔''

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آئی اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا:

''مہربانی کر کے مجھے سمجھایئے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لیے؟ یہ پہاڑ کی گود سے ترشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری یہ کیوں اور کس لیے؟''

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آتا گیا۔

''بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے۔ آپ لوگوں نے سنگتراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لیے بنائے ہیں۔ یہ غار دنیا سے، اصلیت سے سچائی سے فرار سکھانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔''

سنگ تراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پُرسکون مسکراہٹ تھی جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا:

''نہیں۔''

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اس کے صبر و سکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے چلاّ کر کہا:

''تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟''

''سنو!'' اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف پتھر پر لوہا پڑنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ صرف اس کی چھینی کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پتّر چھل کر فرش پر گرتے رہے۔

''تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام......؟'' مگر دفعتاً نرمل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی، اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ یہی تھا اجنتا کا پیغام۔ جسے وہ بھکشو نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے مسکرایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آب حیات۔ اکسیر۔ اس قیمتی نسخے کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔ اسے اجنتا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر کی دیوار پر پڑتی تھی، نرمل کو معلوم ہوتا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

عمل! عمل!! عمل!!! کام! کام!! کام!!! محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح چھیلا جاتا ہے۔ عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گلکاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ عمل سے انسان انسان بنتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے۔ عمل خود عمل کا انعام ہے......

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں یہ پتھر ضرور چھل کر، ترش کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کی منزل کمالِ فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں انسان کی فطرت کے پتھر چھل کر، ترش کر، حسن اور خوبصورتی، فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، تمام انسان مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ اس کی منزل تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ نرمل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑی۔ زخم سے لال لال

لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھریلے فرش پر گر رہی تھیں۔

اور دفعتاً نرمل کو وہ تمام تصویریں یاد آ گئیں جو اس نے ان تمام غاروں میں دیکھی تھیں۔ ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ، کتنے شاداب تھے ان کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنی جیتی جاگتی ہیں۔ جبھی تو ان میں اتنی زندگی ہے......

شاید وہ سو گیا۔ شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا تو غار طلوع آفتاب کی دھیمی دھیمی ترچھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ نہ وہ سنگ تراش تھے، نہ مصور، نہ مشعلیں۔

تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا؟......شاید......کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا:

''ہاں، خواب ہی ہوگا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہو۔''

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گزرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا۔ یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آ کر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا اور اسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لیے پہنچنا ضروری تھا۔ بمبئی سے، فساد سے، زندگی سے کوئی قرار نہیں تھا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا:

''آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟''

اور نرمل نے جواب دیا:

''جی نہیں، میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں۔''

☆☆☆

دِیا جلے ساری رات

جہاں تک نظر جاتی تھی ساحل کے کنارے کنارے ناریل کے پیڑوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ سورج دور سمندر میں ڈوب رہا تھا اور آکاش پر رنگا رنگ کے بادل تیر رہے تھے۔ بادل جن میں آگ کے شعلوں جیسی چمک تھی اور موت کی سیاہی، سونے کی پیلاہٹ اور خون کی سرخی!

ٹراؤنکور کا ساحل اپنے قدرتی حسن کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ میلوں تک سمندر کا پانی زمین کو کاٹتا، کبھی پتلی نہروں کے لہرئیے بناتا، کبھی چوڑی چکلی جھیلوں کی شکل میں پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اس گھڑی مجھ پر بھی اس حسین منظر کا جادو دھیرے دھیرے اثر کرتا جا رہا تھا۔ سمندر شیشے کی طرح ساکن تھا مگر پچھمی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور سمندر کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ایسے کھیلنے لگیں جیسے کسی بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ دور...... بہت دور...... کوئی مچھیرا بانسری بجا رہا تھا۔ اتنی دور کہ بانسری کی پتلی دھیمی تان پھیلے ہوئے سناٹے کو گہرا بنا رہی تھی۔

میرا ناؤ والا بھی اس سحر آفریں ماحول سے متاثر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی ہماری لمبی پتلی کشتی ناریل کے جھنڈوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی کھلے سمندر میں آئی، اس نے چپوؤں پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ سمندر کی طرح وہ بھی خاموش تھا۔ کشتی نہ آگے جا رہی تھی نہ پیچھے۔ لہروں کی گود میں دھیرے دھیرے ڈول رہی تھی۔ فضا اتنی حسین، اتنی شانت، اتنی خواب آور تھی کہ ذرا سی حرکت یا دھیمی سی آواز بھی اس وقت کے طلسم کو توڑنے کے لیے کافی تھی۔ کشتی ڈول رہی تھی۔ کشتی والا چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہوا بھی سانس روکے ہوئے ہے۔ سمندر گہری سوچ میں ہے۔ اور دنیا بھی گھومتے گھومتے رک گئی ہے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کوئی لون کے قصبے کو ہم بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ اب تو ساحل کے کنارے والے ناریل کے جھنڈ بھی نظر نہ آتے تھے اور دور سے آتی ہوئی ٹرین کی سیٹی کی آواز ایسی سنائی دیتی تھی جیسے کسی دوسری دنیا سے آ رہی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس چھوٹی سی کشتی میں بہتے بہتے

ہم کسی دوسرے ہی سنسار میں جانکلے ہوں یا بیسویں صدی کی دنیا، اس کے تمدن اور ترقی کو بہت دور چھوڑ آئے ہوں اور کسی پچھلے یُگ میں پہنچ گئے ہوں۔ جب انسان کمزور تھا اور قدرت کے ہر مظہر کے سامنے ماتھے ٹیکنے پر مجبور تھا، یہاں سمندر گہرا تھا اور آکاش اونچا تھا۔ بہت اونچا۔ اور سمندر اور آکاش کے درمیان ایک ننھی سی، حقیر سی کشتی ڈول رہی تھی اور چھوٹا سا، کالا سام ادھ ننگا کشتی والا ایسا لگتا تھا جیسے کسی پرانے زمانے سے بھٹک کر ادھر آنکلا ہو۔ جب انسان نے ناؤ بنانا اور چپو چلانا سیکھا ہی تھا۔

سورج کی آتشیں گیند سمندر کی سطح پر ایک تل کے لیے ٹھٹکی اور پھر دھیرے دھیرے پانی میں ڈوب گئی۔ پھر اس کی آخری کرنیں بھی مغربی آسمان پر گلابی غازہ ملتے ہوئے رخصت ہو گئیں اور تھوڑی دیر بعد ہی موت کی پرچھائیں کی طرح گہرا اندھیرا آسمان اور زمین دونوں پر چھا گیا۔ اتنا گہرا اندھیرا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں کشتی والے سے کہنے ہی والا تھا کہ کوئی لون واپس چلو کہ کچھ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ منظر تھا ہی اتنا عجیب۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دور سمندر میں ایک چراغ بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

''وہ کیا ہے؟'' آخر کار میں نے کشتی والے سے پوچھا۔

پیچھے مڑ کر اس انوکھے چراغ کو دیکھے بغیر ہی بولا: ''ابھی آپ خود ہی دیکھ لیں گے صاحب۔'' نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ یہ کہتے وقت اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

وہ کشتی والا تھا سچ مچ عجیب ہی آدمی۔ شکل سے نہ جوان لگتا تھا نہ بڈھا۔ ٹراونکور میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی تو تقریباً ہر ایک ہی بول سکتا ہے۔ مگر وہ اچھی خاصی ہندستانی بھی بول لیتا تھا۔ اصل میں میں نے اسی لیے اس کی کشتی کرائے پر لی تھی۔ ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں مسافروں سے بھری ہوئی دوسری بڑی بڑی کشتیوں میں سیر کرنا نہ چاہتا تھا۔ میں سکون اور خاموشی چاہتا تھا۔ چیخ پکار اور ہنگامہ نہیں۔ کوئی باتونی کشتی والا مل جاتا تو بے کار بک بک سے سارا مزا کرکرا کر دیتا۔ ''صاحب! یہ دیکھو۔ صاحب! وہ دیکھو۔ یہ لائٹ ہاؤس دیکھو، وہ ٹاپو دیکھو۔ صاحب! کتنے دن ٹھہرو گے؟ صاحب! یہاں سے کہاں جاؤ گے؟ صاحب! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ صاحب! بیوی بچوں کو ساتھ نہیں لائے؟......'' مگر میرا کشتی والا میری طرح خاموش پسند تھا۔ گھنٹہ بھر میں اس نے مشکل سے دو چار باتیں کی ہوں گی۔ چپ چاپ بیٹھا چپو چلاتا رہا اور اس تمام عرصے میں اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اتنا بڈھا تو نہ تھا پھر اس کے چہرے پر یہ جھریاں کیسے پڑیں؟ اس کی دھنسی ہوئی

آنکھوں میں یہ دکھ کی پرچھائیں کیوں تھیں؟ وہ اتنا خاموش کیوں تھا— جیسے زندگی سے بالکل تھکا ہوا اور بیزار ہو۔ جیسے دنیا کے سارے دکھ سکھ اس پر گزر چکے ہوں اور اب وہ وہاں پہنچ گیا ہو جہاں نہ دکھ ہے، نہ سکھ ہے۔ صرف ایک گہری اتھاہ مایوسی ہے اور اکتاہٹ ہے۔ ہاں تو میں نے اس سے پوچھا: ''وہ کیا ہے؟'' اور اس نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا: ''ابھی آپ خود ہی دیکھ لیں گے صاحب......'' جیسے اسے پہلے ہی سے معلوم ہو کہ میں کس انوکھے نظارے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اور پھر اس نے ہماری کشتی کو دھیرے دھیرے اسی طرف کھینا شروع کر دیا جدھر اندھیرے سمندر میں وہ روشنی بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک اور کشتی چلی جا رہی ہے۔ جسے ایک اکیلی عورت کھے رہی ہے اور اس کشتی میں ایک لالٹین رکھی ہے جس کی روشنی دور سے میں نے دیکھی تھی۔ اتنی رات کو اندھیرے سمندر میں وہ کہاں جا رہی تھی اور کیوں؟ کیا وہ سچ مچ کی کشتی تھی یا صرف میرے تخیل کا ہیولےٰ جو اس طلسمی ماحول میں اُبھر آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے مانجھی نے اپنی کشتی کو عورت کی کشتی سے کافی فاصلے پر رکھا تاکہ ہم اندھیرے میں چھپے رہیں اور وہ ہمیں نہ دیکھ سکے۔ مگر لالٹین کی روشنی کے دائرے میں وہ اچھی طرح نظر آ رہی تھی۔ ایک میلی سی ساڑھی میں لپٹی ہوئی دبلی پتلی عورت تھی مگر اس وقت چہرہ ساڑھی کے آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی کشتی بیچ سمندر میں ایک جگہ رک گئی، جہاں ایک ڈوبے ہوئے درخت کا ٹھنٹھ پانی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایسے کتنے ہی ٹھنٹھ آسمان کی طرف انگلی اٹھائے کھڑے تھے۔ مگر اس درخت پر ایک لالٹین بندھی ہوئی تھی، جس میں اب اس عورت نے تیل ڈالا اور پھر دیا سلائی جلا کر اسے روشن کیا۔ جیسے ہی لالٹین جلی اس کی روشنی میں میں نے اس عورت کا چہرہ دیکھا جس پر سے آنچل اب ڈھلک گیا تھا۔ وہ چہرہ مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ پیلا، بیمار چہرہ۔ پچکے ہوئے گال، دھنسی ہوئی آنکھیں، بال پریشان اور دھول سے اٹے ہوئے، ہاتھ جس سے وہ لالٹین کی بتی کو اونچا کر رہی تھی، کمزوری سے کانپ رہا تھا۔ مگر اسی لالٹین کی طرح وہ چہرہ بھی ایک اندرونی روشنی سے منور تھا۔ نیلے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب چمک۔ انتظار کی چمک، امید کی چمک، اعتقاد کی چمک۔ ایسی چمک جو بھجن کرتے وقت کسی جوگن کی آنکھوں میں ہو سکتی ہے، کسی شہید کی آنکھوں میں یا کسی محبت کرنے والی آنکھوں میں جو اپنے عاشق سے بہت جلد ملنے کا انتظار کر رہی ہو!

ضرور وہ بھی اپنے محبوب کی منتظر تھی۔ کم سے کم مجھے اس کا یقین ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس

نے اپنی کشتی گھمائی اور جس خاموشی سے آئی تھی اسی طرح دھیرے دھیرے چپّو چلاتی ہوئی ایک ٹاپو کی طرف چلی گئی جہاں ستاروں کی روشنی میں ماہی گیروں کے جھونپڑے دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔اب وہ گا رہی تھی۔ ملیالی زبان کا کوئی لوک گیت۔ان جانا مگر پھر بھی جانا بوجھا جس کے الفاظ کو میں نہ سمجھ سکتا تھا۔مگر ایسا لگتا تھا جیسے یہ گیت میں نے پہلے بھی کسی اور زبان میں سنا ہو۔

''وہ کیا گا رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اور مانجھی نے جواب دیا: ''یہ ہم لوگوں کا پرانا گیت ہے صاحب۔عورتیں اپنے پریمیوں کے انتظار میں گاتی ہیں۔ میں ساری رات دیا جلائے تیری باٹ دیکھتی رہی ہوں، تو کب آئے گا ساجن؟''

اور مجھے اپنے ہاں کا لوک گیت دیا جلے ساری رات، یاد آ گیا جو ہمارے ہاں عورتیں بھی ایسے موقعہ پر ہی گاتی ہیں۔ ''کیا دنیا کی عورتوں کے من میں سے ایک ہی آواز اٹھتی ہے؟'' میں نے سوچا اور پھر مانجھی سے کہا: ''تو اسی لیے وہ یہاں لالٹین جلانے آئی تھی تاکہ اس کا پتی یا پریمی رات کو لوٹے تو اندھیرے سمندر میں راستہ نہ کھو بیٹھے۔''

مانجھی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے پھر سوال کیا: ''کیا اس کا پریمی آج کی رات آنے والا ہے؟''

اندھیرے میں مانجھی کی آواز ایسی آئی جیسے وہ کسی بڑے دکھ کے احساس سے بوجھل ہو۔

''نہیں، وہ نہیں آئے گا۔نہ آج رات نہ کل رات۔وہ مر چکا ہے۔کئی برس ہوئے مر چکا ہے۔''

میں کچھ نہ سمجھ سکا اور تعجب سے پوچھا: ''کیا مطلب؟ کیا اس عورت کو نہیں معلوم کہ اس کا پریمی مر چکا ہے اور اب کبھی نہ لوٹے گا؟''

''وہ جانتی ہے— شاید۔مگر وہ مانتی نہیں۔، وہ اب تک انتظار میں ہے......اس نے امید نہیں چھوڑی......''

اور کئی برس سے وہ ہر رات یہاں آتی ہے اور یہ لالٹین جلاتی ہے تاکہ اس کے پریمی کی کشتی اندھیرے میں راستہ پا سکے۔'' میں نے کہا۔مانجھی سے نہیں اپنے آپ سے۔اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے امر پریم کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ایسا پریم جو قصے کہانیوں میں پڑھنے میں آتا ہے۔زندگی میں کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔میری افسانہ نگاری کی حس دفعتاً بیدار ہو گئی تھی اور ایک سوال کے بعد دوسرا سوال کر کے میں نے مانجھی کی زبانی پوری کہانی سن لی۔

یہ کہانی پریم کہانی بھی تھی اور ہندستان کی جنگِ آزادی کی ایک روح پرور داستان بھی۔ سن ۱۹۴۲ء میں جب سارے ملک میں انقلابی طوفان آیا تو ٹراونکور کے عوام، طالب علم، مزدور، کسان یہاں تک کہ مانجھی اور ماہ گیر بھی۔ اپنے جمہوری حقوق کے لیے راجہ شاہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ کوئی لون کے کئی ہزار مانجھیوں نے ہڑتال کی اور اعلان کردیا کہ ہم کام پر نہیں جائیں گے۔ چاہے اس سمندر کا رنگ ہمارے خون سے لال ہی کیوں نہ ہوجائے۔

اَن پڑھ مانجھی کی زبانی یہ جوشیلے الفاظ سن کر میں نے پوچھا: ''مانجھیوں کی طرف سے یہ اعلان کس نے کیا تھا؟''

''اس نے صاحب، اس نے۔''

''اس نے؟ کس نے؟''

''کرشنا نے، صاحب! ہم مانجھیوں کا لیڈر وہی تو تھا۔ تھا تو ذات کا مانجھی اور ہماری طرح کشتی ہی چلاتا تھا مگر اسکول میں پڑھا ہوا تھا اور کئی سال ٹریونڈرم شہر میں رہا تھا جہاں اس نے بڑے بڑے لیڈروں کی تقریریں سنی تھیں۔ وہ خود بھی لیڈروں کی طرح بھاشن دے لیتا تھا صاحب۔ بڑا خوبصورت اور تگڑا جوان تھا۔ کوئی لون سے اس ٹاپو تک تین میل تیر کر اپنی رادھا سے ملنے آیا کرتا تھا......''

''کرشنا اور رادھا! رادھا اور کرشنا! یہ تو بالکل کہانی ہی بن گئی۔'' میں نے تعجب سے کہا۔

''اصل میں اس کا نام رادھا نہیں ہے صاحب۔ مگر کرشنا اسے رادھا رادھا کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ سو اور بھی سب اسے رادھا ہی کہنے لگے۔ رادھا اور کرشنا۔ سب مانجھی کہتے تھے ایسا سندر جوڑا دور دور ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ جب ان دونوں کی منگنی ہوئی تو سب ہی بہت خوش ہوئے سوائے......''

اور اتنا کہہ کر وہ رک گیا اور کچھ دیر پھیلی ہوئی خاموشی میں صرف اس کے چپّو چلنے کی آواز آتی رہی۔

''سوائے؟'' میں نے لقمہ دیا۔

''سوائے ان کے جو خود رادھا کو بیاہنا چاہتے تھے۔'' اور یہ کہہ کر ایک بار پھر وہ خاموش ہوگیا۔

''یہ رادھا......'' میں نے گفتگو کا سلسلہ پھر چلانے کے لیے کہا: ''یہ رادھا آٹھ برس پہلے کافی

خوبصورت رہی ہوگی؟''

ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ بولا: ''خوبصورت؟ بہت خوبصورت صاحب۔ آس پاس کے گاؤں میں کیا، کوئی لون میں بھی کوئی لڑکی اتنی سندر نہیں تھی۔ ناریل کے پیڑ کی طرح لمبی اور دبلی۔ مچھلی جیسا سڈول اور چمکدار جسم تھا اس کا۔ اور اس کی آنکھیں۔؟ اس کی آنکھیں۔ اس سمندر کی ساری گہرائی اور ساری خوبصورتی تھی ان میں......''

میں نے سوچا کہانی سے ہٹ کر ہم شاعرانہ مبالغوں میں پھنستے جا رہے ہیں۔ مجھے رادھا کی خوبصورتی کے بیان میں اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کرشنا کے انجام میں۔ اس لیے میں نے ''اور پھر کیا ہوا؟'' کہہ کر گفتگو کا رُخ پھر واقعات کی طرف پھیرنا چاہا۔

''پھر کیا ہونا تھا صاحب، کرشنا کی اس جوشیلی تقریر کے بعد تو پولیس اس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔ اس کے لیے بڑے بڑے جال بچھائے انھوں نے۔ مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ چھپ کر کام کرتا رہا۔ پولیس والے دن بھر اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے مگر انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہر رات کو اسی اندھیرے سمندر میں تیرتا ہوا وہ رادھا سے ملنے اس کے ٹاپو تک جاتا اور سویرا ہونے سے پہلے تیرتا ہوا واپس آجاتا اور سب پولیس کا ٹھٹھا اڑاتے اور کہتے ہمارا کرشنا کبھی ان پولیس والوں کے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔''

''تو سارے مانجھی کرشنا کے طرفدار تھے؟''

''ہاں صاحب! سبھی اس کے ساتھی تھے، سوائے ان کے......اور ایک بار پھر اس کی زبان رک گئی۔

''سوائے کن کے؟''

''جو رادھا کی وجہ سے اس سے جلتے تھے صاحب۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''چاند ڈھلتا گیا صاحب اور جب اندھیری راتیں آئیں تو ہر رات کو اپنے کرشنا کو راستہ دکھانے کے لیے سمندر کے بیچ میں رادھا لالٹین جلانے لگی۔ ہر شام کو وہ اسی طرح سے جیسے وہ آج آئی تھی، کشتی میں اس جگہ آتی اور لالٹین جلا کر واپس ہو جاتی۔''

میں نے جب پیچھے مڑ کر اندھیرے سمندر میں اس ننھی روشنی کو ٹمٹماتے ہوئے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بار پھر بہادر کرشنا اپنے مضبوط بازوؤں سے پانی کو چیرتا ہوا اپنی رادھا سے

ملنے جارہا ہے۔

''اور پھر کیا ہوا؟''

''ایک رات رادھا نے لالٹین جلائی مگر وہ بجھ گئی اور جب کرشنا رات کو تیرتا ہوا آیا تو اس کو راستہ دکھانے کے لیے کوئی روشنی نہ تھی۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' کیا کوئی طوفان آیا تھا؟''

''ہاں یہی سمجھو کہ ایک طوفان آیا— مگر یہ طوفان سمندر میں نہیں، ایک بے ایمان آدمی کے من میں اٹھا تھا۔ اس نے اپنی قوم کو دغا دی اور لالٹین بجھا کر اپنے دوست کی موت کا باعث ہوا۔''

''مگر کیوں؟ کوئی انسان ایسی کمینی اور بے کار حرکت کیسے کر سکتا ہے؟''

''محبت کی خاطر— کم سے کم وہ یہی سمجھتا تھا صاحب۔ پر اس کی محبت اندھی تھی۔ محبت کیا ایک بیماری تھی۔ پریم، نہیں ایک پاگل پن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رادھا کرشنا کے سوا کسی دوسرے کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ سو اس نے کرشنا کو— اپنے دوست کو— قتل کر دیا......''

''تو کرشنا ڈوبا نہیں قتل کیا گیا تھا؟''

''اس رات کو وہ لالٹین بجھانا، کرشنا کو قتل کرنے کے برابر ہی تھا صاحب۔ پر قاتل کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کرشنا کی موت سے اس کا کوئی بھلا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا بھیانک جرم بھوت بن کر اس کے من میں ہمیشہ منڈلاتا رہے گا۔ اس کا دن کا چین اور رات کی نیند اڑا دے گا۔''

اب ہماری کشتی کوئی لون کی بندرہ گاہ کے پاس پہنچ گئی اور میں کہانی اور اس کے سب کرداروں کا انجام جاننا چاہتا تھا۔

''سو اس رات کو کرشنا ڈوب کر مر گیا۔ پھر کیا ہوا؟''

''کرشنا کے بغیر ماجھیوں کا ایکا نہ رہا۔ پولیس کے ڈر سے انھوں نے ہڑتال ختم کر دی۔''

''اور رادھا؟ جب کرشنا کی موت کی خبر سنی تو اس نے کیا کیا؟''

''آج تک اسے کرشنا کی موت کا یقین ہی نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ کرشنا کی لاش آج تک سمندر نے نہیں نکلی۔ سو آج تک ہر شام کو رادھا ویسے ہی کشتی میں آتی ہے، لالٹین جلاتی ہے اور واپس جا کر رات بھر اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھی کرشنا کا انتظار کرتی رہتی ہے۔''

''اور اس غدّار کا کیا ہوا؟ وہ پاجی جس نے کرشنا کو موت کے گھاٹ اتارا اور اپنے لوگوں اور ان کی جنگِ آزادی کے ساتھ غداری کی، اس کا کیا حشر ہوا؟ وہ اب کیا کرتا ہے؟''

مانجھی نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ پیٹھ موڑے، کندھے اور سر جھکائے وہ چپ چاپ بیٹھا چپّو چلاتا رہا۔ مگر اس کی خاموشی میں اس کے مجرم ضمیر کی دھڑکن تھی۔ اس وقت ساری کائنات پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ موت کی طرح گہرا سنّاٹا۔ مگر ریل کی سیٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں اسی رات کو کوئی لون کو خیر باد کہنے والا تھا۔

کشتی سے اترنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر سمندر کی طرف نگاہ کی، آسمان پر اب ہزاروں ستارے جگمگا رہے تھے۔ مگر ایک ستارہ اندھیرے سمندر کے بیچ میں چمک رہا تھا۔ یہ رادھا کی لالٹین تھی جو اس کے کرشنا کا انتظار کرتی رہے گی۔ آج کی رات......اور کل کی رات......اور پھر پرسوں کی رات......رادھا کی محبت کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ اس لیے کہ یہ امید کا ستارہ ہے۔

☆☆☆

بھوپال کی کیپٹن سلمیٰ

فلک نما پیلس ہوٹل بھوپال کا بہترین ہوٹل ہے۔ ساتھ میں کھانے کا بھی بہترین انتظام ہے! مغلئی کھانا تو ملتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ چینی اور انگریزی کھانے کا بھی انتظام ہے۔ وہاں میں اپنے میزبانوں کے ساتھ لنچ کھانے گیا تو کھڑکی میں سے مشہور بھوپال تال کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ کھڑکی کے باہر تال تھا۔ اٹھارہ کلومیٹر لمبا چوڑا، چھوٹا سا سمندر نظر آتا تھا سوائے اس کے کہ ساحل پر ریت نہیں تھی۔

مگر آسمان پر برساتی بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے تال میں زیادہ پانی کی امید کی جاسکتی تھی۔ میں نے اسی صبح کاربائڈ فیکٹری کے منحوس نظارے کیے تھے۔ وہ پتھر کی مورتی بھی دیکھی تھی جو جھونپڑیوں کے بیچ ایک کھڑی ہوئی ماں کا نقشہ پیش کررہی تھی۔ جس کی گود میں ایک مرا ہوا بچہ تھا۔ ایک اور ذرا بڑا بچہ اس کی ساڑی کے آنچل سے لپٹا ہوا یا لٹکا ہوا ہے۔

پتھر میں احساسات کی جھلک بڑی مشکل سے آتی ہے۔ مگر ان مورتی کاروں کی ماں کے احساسات کو پتھر میں ڈھال دیا ہے۔ دونوں کا دھیان اس مردہ بچے کی طرف ہے۔ زندہ بچے کو بھروسا ہے کہ ساڑی کے نیچے سے اس کا مردہ بھائی اٹھ بیٹھے گا۔ زندہ ہوجائے گا۔ ماں بھی شاید اسی امید میں ہے کہ اس کی گود کا بچہ انگڑائی لے کر سیدھا ہوجائے گا۔

پتھر کی مورتی خوبصورت اور نازک نہیں ہے۔ مندر کی مورتیوں کی طرح تراشی ہوئی اور بے جان ہے جیسے تمام دنیا کی ماؤں اور ان کی ممتا کو نچوڑ کر یہ مورتی بنائی گئی ہے۔ چھاتیاں بڑی بڑی اور دودھ سے بھری ہوئی ہیں۔ مگر یہ دودھ کس کام کا؟ اس میں کاربائیڈ کا زہر بھرا ہوا ہے۔ جو زہر ماں کی آنکھوں میں ہے۔ بچے کی نس نس میں ہے۔ وہ یہ زہریلا دودھ پی کر ہی تو بے جان ہوگیا تھا۔

کیپٹن سلمیٰ کو پہلی نظر میں میں نے پہچان لیا تھا۔ جس نے اسے ایک نظر دیکھا تھا اس کو پتھر

کی مورتی دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دونوں کو ایک ہی پتھر سے تراشا گیا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں سارے جہاں کا درد سمٹا ہوا تھا۔ دونوں کی چھاتیوں میں ساری دنیا کی ماؤں کا دودھ اتر آیا تھا۔ وہ بچہ تھا جو سب مردہ بچوں کی علامت تھا۔

یہ پتھر کا مجسمہ ایسا نازک اور سبک نہیں تھا جیسے مندروں میں رادھا کے، سیتا کے، لکشمی کے اور سرسوتی کے مجسمے ہوتے ہیں۔ بیشک اپنے بچے کی موت پر فریاد کر رہی تھی۔ مگر فریاد کے ساتھ، غصے کے ساتھ ایک چیلنج بھی تھا۔ ایک للکار تھی۔ ایک نعرہ اس فیکٹری کے امریکن مالکوں کے خلاف جس کے کروڑوں روپے منافع کمانے میں اس کے معصوم بچے اور ہزاروں کی جانیں گئی تھیں۔ اور یہ موت بنا تکلیف خاموش نہیں تھی۔ کھانس کھانس کے جان دی تھی سب نے۔ سوائے اس کے ننھے بچے نے جسے صرف ایک ہچکی آئی تھی اور وہ ختم ہو گیا تھا۔ زہر کا اثر اتنا شدید تھا اس پر کہ ایک منٹ میں کام تمام ہو گیا۔

میں نے اس دن اپنے کیمرے سے تصویریں کھینچی تھیں۔ پوری روشن مورتی کی، کئی زاویوں سے۔ اس کے سر کی جو اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گود کے مرے ہوئے بچے کی، پیچھے چلتے ہوئے ماں کی ساڑی کا نچلا پلو پکڑے ہوئے بچے کی۔ غرض یہ ریکارڈ تھا میرے کیمرے میں۔

اس وقت جب میں فلک نما پیلس ہوٹل میں داخل ہوا اور ایک عورت نے میرا استقبال کیا۔

''آئی ایم کیپٹن سلمیٰ سر!'' اس عورت نے اپنا تعارف کرایا تھا۔

''کیپٹن سلمیٰ؟'' میں نے تعجب سے کہا تھا۔ پہلی بار میں نے ایک عورت کو اپنا تعارف کراتے ہوئے ''کیپٹن'' کہتے ہوئے سنا تھا۔

یہ نہیں کہ میں اُسے ایک آرمی کیپٹن سمجھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہوٹلوں میں بھی کیپٹن ہوتے ہیں۔ ہوٹل یا ریستوراں کے اسٹاف کے انچارج، مگر وہ سب مرد ہوتے ہیں۔ ایک عورت کو اپنے آپ کو ''کیپٹن'' کہتے ہوئے میں نے پہلی بار سنا تھا۔

میں نے ڈائننگ روم میں جا کر میز پر اپنا کیمرہ رکھ دیا۔ ''کیپٹن'' سلمیٰ نے وہ کیمرہ ہلکے سے اٹھا کر ایک دوسری میز پر رکھ دیا۔

میں نے کہا ''میں اس کیمرے کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اس میں کچھ اہم تصویریں ہیں۔''

اس نے موقع غنیمت جان کر سوال کیا ''کیا بھارت بھون کی تصویریں ہیں؟''

''نہیں اس سے کہیں زیادہ اہم اور خطرناک تصویریں ہیں''

''اہم اور خطرناک تصویریں؟'' اس نے میرے ہی الفاظ کو دہرایا۔

''جی ہاں، اہم اور خطرناک؟ اس میں ایک عورت کی تصویر ہے۔''

''کیا کوئی بھوپالی حسینہ مل گئی تھی؟'' اس نے (جو خود ایک بھوپالی حسینہ تھی) پوچھا۔

''ہاں، اسے بھوپالی حسینہ بھی کہا جا سکتا ہے۔''

''اس لیے کہ وہ ایک پتھر کی مورتی ہے جو کار بائیڈ فیکٹری کے سامنے کھڑی ہے اور کھڑی رہے گی۔ جب تک اس کے مطالبات پورے نہیں ہوں گے۔

''اچھا تو آپ اس حسینہ کی بات کر رہے ہیں۔'' اس نے کسی قدر لاپروائی سے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

مجھے ناولسٹ اور کہانی کار کی حیثیت سے وہ دلچسپ لگی۔ اگرچہ حسین نہ لگی۔ اگر وہ برا نہ مانے تو میں کہوں گا کہ جتنی جاندار عورتیں میں نے دیکھی ہیں ان میں سے وہی اس مورتی سے میل کھاتی تھی۔

''آپ کیا کھائیں گے؟''

''کچھ نہیں؟'' میں نے جواب دیا ''اس مجسمہ کو دیکھنے اور ان جھونپڑیوں کو دیکھنے کے بعد تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔''

''تو آپ چکن سوپ لے لیجیے گا۔''

''اچھا خیال ہے۔ مگر اس میں بو نہیں ہونی چاہیے۔

''بو کیسی؟ چکن کی خوشبو تو ہوگی ہی۔''

''وہ چلے گی۔ میرا مطلب اس بو سے تھا جو میرے کیمرے میں سے آ رہی ہے۔ جب سے میں نے تصویریں کھینچی ہیں۔''

وہ بو نہیں ہوگی۔ اس نے یقین دلایا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

پانچ منٹ بعد ہاتھوں میں چکن سوپ کا باؤل لیے آ رہی تھی۔ ''سوپ سونگھ لیجیے۔'' اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ میں نے پہلا چمچ لینے سے پہلے اس کو سونگھا۔ بو نہیں تھی۔ چکن کی بو بھی نہیں تھی۔

وہ مایوس ہو کر چلی گئی۔

میں نے چکن سوپ پی لیا۔ پھر بل پر دستخط کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دروازے پر ایک چٹ لکھی ملی۔ پنسل سے لکھا تھا۔ ''اگر آپ گیس ٹریجڈی کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو وہ تفصیلات (Details) دے سکتی ہوں جواب تک کسی جرنلسٹ کو نہیں ملی ہیں۔ میری ڈیوٹی چار بجے سے آٹھ بجے تک off رہتی ہے۔ کیپٹن سلمیٰ۔''

میں نے سوچا چلوان کی رام کہانی بھی سن لیں۔ دلچسپ ہی رہے گی۔

ٹھیک چار بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ دھیمی دبی سی۔ میں نے سوچا 'کیپٹن سلمیٰ اب گھبرا رہی ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے جولڑکی کھڑی تھی وہ 'کیپٹن سلمیٰ' ،نہیں تھی۔ مگراس کی شکل جانی پہچانی سی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس عورت کو آج ہی کہیں دیکھا ہے۔ مگر آج تو دو عورتیں میں نے دیکھی تھیں ایک تو وہ مورتی تھی اور ایک 'کیپٹن سلمیٰ' اگر یہ 'کیپٹن سلمیٰ' نہیں ہے تو یہ مورتی والی عورت ہی ہوگی۔

اس کا بدن ایک اول جلول پوشاک میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ ویسی ہی ڈھیلی ڈھالی ساڑی تھی۔ جو وہ مورتی پہنے ہوئے ہے۔ گود میں ویسے ہی ایک مردہ بچہ؟ اے خدا! میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ تم تو ریشمی شلوار، قمیص پہنے ہوئے کیپٹن سلمیٰ تھیں۔ تم بالکل......''

''مورتی والی ساڑی پہنے ہوئے ہوں۔ بچہ بھی گود میں ہے......''

''یہی وہ بچہ ہے جو اس وقت تمھاری گود میں تھا؟''

''کیا آپ مجھے قبر چور سمجھتے ہیں، جو ایک مردہ بچہ اکھاڑ کر لا رہی ہے۔ آپ کو Impress کرنے کے لیے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ تو ایک گڑیا ہے جو بھارت بھون کی ناٹک منڈلی سے میں نے ضرور چرائی ہے۔''

''اندر آجاؤ، میں نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔''

''ورنہ لوگ سمجھیں گے میں تمھیں اندر آنے کے لیے پٹا رہا ہوں۔''

اندر کمرے میں آکر وہ آرام سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ گڑیا (یا مردہ بچہ) اس نے برابر میں رکھ لیا۔

''پوچھیے کیا پوچھنا ہے؟''

''تم اس رات بھی یہی بچہ گود میں لے کر بھاگ رہی تھیں؟''

''نہیں! بھاگ نہیں رہی تھی۔ میں اس رات کو ڈاکٹر دکا جی کے میٹرنیٹی ہوم میں تھی۔ میرا بچہ اسی رات پیدا ہوا تھا۔ جب میرا شوہر میرے پاس تھا۔''

''تم شادی شدہ ہو؟''

''تھی۔ جب تک یہ نحوست بھوپال پر نازل نہیں ہوئی تھی۔''

''کیا کرتی تھیں تم اُس وقت؟''

''کچھ نہیں کرتی تھی۔ بیکار رہتی تھی۔ اپنے شوہر کے لیے کھانا پکاتی تھی۔''

''اور تمھارا شوہر کیا کرتا تھا۔''

''وہ انجینئر تھا۔ کاربائیڈ فیکٹری میں جہاں وہ امریکہ میں بھرتی ہوا تھا۔ وہ لوگ بہت خوش ہوئے تھے یہ جان کر کہ وہ بھوپال میں اپنی فیکٹری قائم کرنے جارہے ہیں اور بھوپال کا ہی ایک لڑکا وہاں کیمیکل انجینئرنگ پڑھ رہا ہے اور اس وقت ان کی امریکہ کی فیکٹری میں پریکٹیکل ٹریننگ حاصل کرنے آیا ہے۔ میرا شوہر بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ ہزاروں میں ایک۔ آخر وقت تک امریکن لڑکیاں اس کو خط لکھا کرتی تھیں اور شادی کی خواہش مند تھیں۔ ایک تو ہماری شادی کے بعد بھی اس کے ساتھ مسلمان ہو کر دوسری بیوی بن کر رہنے کو تیار تھی۔''

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''

''جی ہاں! خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے۔''

''بد قسمتی سے کیوں؟''

''کیوں کہ اگر میں ہندو ہوتی تو شوہر کی موت کے بعد 'ستی' ہو جاتی۔''

''بڑی بھول کرتیں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ کی زندگی اچھے کاموں کے لیے ہے۔ آپ ہوٹل میں کام کرتی ہیں۔ بھوپال کی ٹریجڈی سے متاثر مسافروں کو چکن سوپ پلاتی ہیں۔ جن سے ان کی جان بچ جاتی ہے۔ اگر انھیں فلک نما اسپیشل مرغ مسلّم شاہی پلاؤ والا کھانا کھانا پڑتا تو ان کے ہارٹ ہی فیل ہو جاتے۔''

''معاف کیجیے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کا ہارٹ فیل ہونے والا ہے۔''

''ورنہ آپ سوپ مجھے نہ دیتیں۔''

''جی ہاں! میرا مطلب ہے جی نہیں، اور پھر وہ ہنس پڑی۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کو میں نے ہنستے دیکھا تھا۔ پہلی بار اور آخری بار۔''

''تو اپنے شوہر کے بارے میں بتایئے۔ کیا گزری؟''

''اس کا نام تھا 'عالم خان' امریکہ سے جب آیا تو وہ فیکٹری میں انجینئر ہو گیا۔ دو نمبر کا انجینئر تھا وہ۔ رات دن فیکٹری کے کام میں لگا رہتا تھا۔ ایک چھٹی کے دن ہماری ملاقات بھارت بھون کے اوپن ایر تھیٹر میں ہو گئی۔ ناٹک تھا (A Midsummer Night's Dream) ہم قریب قریب کی پتھر کی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک سیٹ خالی تھی۔ اس نے مجھے اکیلی پا کر پوچھا۔ آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے قریب والی سیٹ پر آ جاؤں۔ میں نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پھر میں نے ایک انٹرول میں اس سے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں؟''

''جواب ملا جھک مارتا ہوں۔''

''میں نے پوچھا'' وہ کیا ہوتا ہے؟''

''کاربائیڈ فیکٹری میں انجینئر ہونا اور Poison Gases بنانا۔ یہ جھک مارنا نہیں تو کیا ہے اگر ایک دن کہیں سے یہ گیس نکل گئی تو سارے شہر کو خالی کر دے گی۔''

''اتنا خطرناک کام کیوں کرتے ہیں آپ؟''

''روٹی کمانے کے لیے۔''

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''حمیدیہ کالج میں پڑھتی ہوں۔ یہ بھی ایک قسم کا جھک مارنا ہی ہے۔''

''جھک مارنا کیوں ہے؟''

''بابر نے کون سے سنہ میں پانی پت کی جنگ جیتی؟'' اشوک نے اپنی کب لاٹھ بنائی؟'' کب اس کو قائم کیا۔ اور اس پر کیا لکھا۔ انگریزوں کا دور کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا؟ اور ایسی ہی بکواس جو ہسٹری میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ سب جھک مارنا نہیں تو کیا ہے؟ ایم اے میں پہنچ گئی ہوں اور چکن سوپ بنانا بھی نہیں آتا۔ مجھے تو کھچڑی بنانی بھی نہیں آتی۔

کھچڑی پر یاد آیا دادی اماں کی کہانی یاد ہے؟ ایک تھا چڑا ایک تھی چڑیا۔ چڑیا لایا چاول کا دانہ، چڑیا لائی دال کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی اور خوب مزے سے کھائی۔ بائی دی وے میرا مطلب ہے کہ آپ کا خیال شادی کے بارے میں کیا ہے؟ کیا یہ بھی بکواس ہے؟ یا چڑے چڑیا کی کہانی؟

شادی تو چڑے چڑیا کی کہانی ہے۔ مگر میں چونچ مارنے والی چڑیا ہوں۔ یہ یاد رکھنے والی

بات ہے۔

اتنے میں ناٹک پھر شروع ہو گیا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ جب یہ شیکسپیئر کا رومانس چل رہا تھا تو نجانے کیسے عالم کے ہاتھ جو نرم نہیں انجینئر کے کھردرے ہاتھ تھے میرے ہاتھوں میں آ گئے۔ ان ہاتھوں والے کو کوئی 'چڑا' نہیں کہہ سکتا تھا مگر مجھے ان سے کھیلنا پسند آیا۔

''کیوں، کھیل پسند آیا؟'' ناٹک ختم ہوتے ہی عالم نے پوچھا۔

''کون سا کھیل؟'' میں گھبراہٹ میں بھول گئی تھی کہ ناٹک کا ذکر تھا کہ ہاتھوں کے کھیل کا، جو واقعی دلچسپ تھا۔

''بہت مزہ آیا۔'' میں نے یہ جملہ کہا جو دونوں کھیلوں پر برابر ٹھیک لگتا تھا۔

''سوا گلے ہفتے ہماری شادی ہوگئی۔ میرے والد صاحب جو نواب صاحب کے مصاحب اور شکاری تھے۔ وہ تو ریاست کے مرج (Merge) ہونے کے چند مہینے بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اماں ابھی زندہ تھیں مگر رات دن روزہ نماز میں مشغول رہتی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر کہ ان کا ہونے والا داماد امریکہ کا پڑھا ہوا انجینئر ہے اور امریکن فیکٹری میں ہی بائیس سو روپے ماہوار کماتا ہے، خوش ہوئیں۔

شادی کے تیسرے دن ہی میں نے عالم سے پوچھا: ''ہمیں اپنی فیکٹری نہیں دکھائیں گے؟''

''فیکٹری بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟''

''کیوں نہیں؟ میں تو ہمیشہ سے فیکٹری دیکھنا چاہتی تھی۔ فیکٹری میں بڑی بڑی مشینیں ہوں گی۔ بہت سے انجینئر اور ان سے بھی زیادہ مزدور ہوں گے۔ کیا تمھارے یہاں عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ میں ان سب کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میں اپنی ضد سے فیکٹری دیکھنے گئی۔ مزدوروں میں مرد بہت تھے مگر عورتیں بہت کم کام کرتی نظر آئیں۔ صرف دو اور وہ بھی کلرکی کے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے گھوم گھام کر فیکٹری دیکھی۔ گیس بھرے گولوں میں مجھے دلچسپی لگی۔ ایک گولے میں سے بڑی سخت بدبو آ رہی تھی۔ میں نے ساڑی کے پلّو سے ناک بند کر لی اور پھر فیکٹری اور ان گولوں کی بدبو کو بھول گئی۔ لیکن یہ میری اور میرے شہر کی بدقسمتی تھی۔

اگلے مہینے میں حاملہ بن گئی۔

''حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہمارا خوش قسمتی کا دن تھا۔ جب تم ہماری فیکٹری دیکھنے آئی تھیں۔''

''تمھاری فیکٹری زندہ باد!'' میرے منہ سے نکلا۔ معلوم نہیں کہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اس فیکٹری کو زندہ باد کہا تھا۔''

دسمبر کے آخری ہفتے میں لیڈی ڈاکٹر نے سلمیٰ کو تاریخ دی تھی اور اس سے ہفتہ بھر پہلے ہی اس کو داخل کرلیا گیا کیوں کہ اسے دو تین شکایتوں کی وجہ سے کچھ الجھن پیدا ہوگئی تھی۔ عالم بھی اپنی بیوی کی طرف سے پریشان تھا۔ جیسے جیسے دن قریب آرہے تھے وہ زیادہ پریشان ہورہا تھا۔ ادھر فیکٹری میں بھی پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ ایک گیس کے بڑے گولے میں چھید ہوگیا تھا اور اس میں سے گیس رِس رہی تھی۔ اس کو بند کرنے میں ایک مزدور کی جان گئی جسے ایک عام حادثہ قرار دیا گیا۔ اگلی رات کو ابھی عالم اسپتال نہیں آیا تھا، فیکٹری میں ہی تھا کہ بھگدڑ مچی۔ مزدوروں اور دوسرے کام کرنے والوں کی بھاگ دوڑ کو اس نے روکنا چاہا۔ سب مل کر چلائے۔

''عالم صاحب! گیس کا فوارہ بن کر اب تو نکل رہا ہے۔ آپ بھی بھاگیے۔'' مگر عالم اس وقت انجینئر انچارج تھا۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کا کپتان تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔''

جب سب مزدور بھاگ گئے اور اپنی اپنی جھونپڑیوں میں گھس گئے تب ہوا جھونپڑیوں کی طرف چل رہی تھیں۔ جب عالم نے کسی نہ کسی طرح اوپر بڑھ کر رِستی ہوئی گیس کا رِسنا بند کیا۔ اس کے گلے میں بھی خراش ہورہی تھی اور نیند کی جھپکی بھی اس کو آرہی تھی۔ پھر بھی اس کو اپنے آپ پر قابو رکھنا ہی تھا۔ کم سے کم اسپتال جانے میں کار میں اس وقت دس منٹ لگیں گے۔ کار بھی بڑی بھاری امریکن کار تھی جو امریکہ سے عالم اپنے ساتھ لایا تھا۔ اب اس وقت وہ بھی سردی میں جمی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے اسٹارٹ ہو پائی۔ تب جاکر اپنے اوپر قابو پاکر کار کو دھیرے دھیرے چلاتے ہوئے عالم نے گیئر کو بدلا اور رفتار کو سنسان سڑک پر تیز کیا۔

اسپتال پہنچنے پر عالم بیوی کے کمرے کی طرف گیا۔ کمرے کو خالی دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر دوسرے پل ہی ایک نرس نے بتایا کہ آپریشن روم میں ہے کیونکہ ڈاکٹر نے بڑے آپریشن کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ کا بہت انتظار کیا۔ ابھی ابھی مجھے فیکٹری میں فون کرنے کو کہا تھا مگر آپ شاید وہاں سے نکل چکے تھے۔

یہ سن کر عالم آپریشن روم کی طرف چلا۔ راستے میں ایک دوسری نرس آتی ہوئی ملی جو ہاتھ

میں تولیے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پکڑے ہوئی تھی۔

''آپ کو دیکھنے ہی جا رہی تھی۔'' نرس نے کہا۔

مگر عالم نے چیخ کر کہا: ''کیسی ہے میری بیوی؟''

''ہمت رکھیے۔ وہ بیہوش ہے۔ مگر ابھی چند منٹ میں ہوش میں آجائے گی۔''

''تو یہ کیا ہے؟''

''آپ کا بچہ ہے۔'' یہ کہہ کر نرس نے تولیہ تھمایا تو عالم کو چکر آ گیا۔ وہ نیا پیدا ہوا بچہ ضرور تھا مگر اس کا نہیں تھا۔ یہ تو کسی شیطان کا بچہ لگتا تھا۔ نہ آنکھ، نہ کان، نہ چہرہ نہ ناک۔ صرف ایک گوشت کا لوتھڑا ہی تھا۔ ''تو یہ ہے ہمارا بچہ؟'' اسی وقت اسے نو مہینے پہلے کی سلمیٰ کی ضد فیکٹری دیکھنے کی یاد آ گئی۔ یہ زہر وہاں سے آیا تھا۔ عالم انجینئر تھا۔ وہ گیس کے نتائج سے واقف تھا۔ مگر اس کی بیوی پر یہ اثر ہوگا اس زہریلی گیس کا، یہ خیال اس کو آنا تھا کہ اسے ایک اور چکر آ گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو اسی میٹرنیٹی اسپتال میں برابر کے پلنگ پر اپنے شوہر کو سویا ہوا پایا۔

''یہ کیا ہوا عالم؟'' میں نے نیم بیہوشی میں کہا۔

اس وقت تک عالم بیہوش تھا۔ ایک بار اس کو کھانسی آئی تو آنکھ کھولی۔

''عالم یہ کیا غضب ہوا؟ یہ کس بات کی سزا دی ہے ہمیں خدا نے؟''

''ضد کرنے کی سزا ہے یہ۔ اس دن جب تم نے ضد کی تھی میری فیکٹری دیکھنے کی۔ مجھے تمھاری ضد کو پورا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ معمولی فیکٹری نہ تھی وہاں زہریلی گیس بن رہی تھی۔ وہاں تمھیں کسی حالت میں نہیں لے جانا چاہیے تھا۔''

''کیا یہ بچہ اسی سے ایسا پیدا ہوا ہے؟''

''ہاں اور کیا؟''

''اس کے کچھ دن بعد عالم بیچارے کا انتقال ہو گیا۔ وہ پہلا شہید تھا اس فیکٹری کا۔ گیس اس نے بہت سونگھی تھی۔ اس کے پھیپھڑوں میں اور جگر میں گیس ہی گیس بھری تھی۔ اس وقت سارے شہر کے ڈاکٹر عام لوگوں کی دیکھ بھال کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ کوشش بھی کی کہ اسے بڑے اسپتال میں لے جائیں مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب مجھے وہاں لے جانا بیکار ہے۔ اب میں نہیں بچوں گا۔ میری یہی سزا ہے۔ مجھے اچھی نوکری چاہیے تھی نا؟ امریکیوں نے اچھی تنخواہ دی مجھے۔ ان کی دور بینی نظر اس کارخانے پر امریکہ سے لگی ہوئی تھی۔ آج اس کو معلوم ہو گیا جو وہ

چاہتے تھے۔

زہریلی گیس جو وہ گولوں میں بھر کر تمام دنیا میں پھیلا چکے ہیں تو اس کی بات کوئی نہیں مانے گا۔ اس سازش میں شریک ہونے سے میں بھی گنہگار ہوں۔ میں بھی مجرم ہوں .... میں بھی مجرم ....

''بس اس کی آخری آواز یہی تھی۔''

''وہ مر گیا اور اس کے ساتھ میں بھی مر گئی۔''

''اب میں ایک انجینئر کی بیوہ نہیں تھی۔''

''پھر میں بھی اسی غریبوں کی جھونپڑی میں جا کر رہی۔''

''وہاں وہ مورتی کار آئے جو ایک مورتی بنانا چاہتے تھے۔ جب ایک ماڈل کی ضرورت پڑی تو میں نے اپنی خدمت پیش کر دی۔''

''اس نے کہا: '' آپ کا کوئی بچہ تو نہیں ہے گود میں لینے کے لیے؟''

''میں نے کہا ایک بچہ تھا لیکن وہ اس گیس کا شکار ہو گیا۔''

''انھوں نے ایک موم کی گڑیا میری گود میں دے دی۔ میں نے کہا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ دیجیے۔ اس کے کانوں میں روئی گھسا دیجیے۔ پھر میں اسے اپنا ہی بچہ سمجھوں گی۔''

''مورتی کاروں نے مان لیا۔ چار دن تک میں وہاں کھڑی رہی اور اپنے بچے کے بارے میں سوچتی رہی۔ بچے کے باپ کے بارے میں۔ ہائے میرا انجینئر کب آئے گا؟''

جب ماڈلنگ کا کام ختم ہو گیا اور میری مورت، میرا جسم، اور میرے احساسات بھی اس مورتی میں ڈھل گئے۔ تب میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب میرے لیے کتنے دن باقی ہیں؟

''آپ اگر اپنا علاج ٹھیک سے کرائیں گی تو اپنی پوری عمر جی سکتی ہیں۔''

''میں پوری عمر جینا نہیں چاہتی۔ اسپتال میں ایڑیاں رگڑ کر۔''

''تب تو مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال۔ مگر آپ جوان ہیں۔ شکل و صورت بھی اچھی ہیں۔ آپ کیوں جینا نہیں چاہتیں؟''

اس لیے کہ میں بھی مجرم ہوں۔ ایک برس کے لیے میں کوئی نوکری کر لوں گی۔

''میں اسپتال سے چلی آئی اپنی ایم اے کی ڈگری لے کر۔ میں نے اس ہوٹل میں کیپٹن کی

نوکری کرلی۔ اس عرصے میں جب کبھی کوئی ہمدرد ملتا ہے اسے میں یہ کہانی سنادیتی ہوں۔ یہی میری زندگی تھی ایک سال تک۔ آج ایک سال پورا ہوگیا ہے۔ اب میں اجازت چاہتی ہوں۔"

وہ چلی گئی اور میں اس کے بارے بیٹھا سوچتا رہا۔ کیسے اسے زندگی میں پھر سے دلچسپی دلاؤں؟

اسی رات کو میں 'بھارت بھون' میں ایک ناٹک دیکھنے گیا۔ ناٹک کیا تھا "بھوپال گیس ٹریجڈی" کی سچی کہانی تھی جو تال کے کنارے اسٹیج کی جارہی تھی۔ "بانجھ گھاٹی" نام تھا ناٹک کا۔ صرف ۳۳ مرد وعورت اداکاروں نے مل کر بھوپال کے ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹریجڈی کا نقشہ کھینچ دیا تھا۔

شروع میں انھوں نے دکھایا کہ دس بارہ عورتیں ایک سہیلی کو جلوس کی شکل میں "زچہ بچہ روم" سے لارہی ہیں۔ سب خوش ہیں اور ناچتی گاتی آرہی ہیں۔ کیونکہ عورت کی گود میں ایک ہنستا کھیلتا بچہ ہے۔

اور ٹریجڈی کے آخر میں ایک اور جلوس آتا ہے۔ وہی دس پندرہ عورتیں ہیں۔ مگر آج ان کے گانے میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ بستی میں آکر وہ حاملہ عورت اپنی گود کا بچہ ایک بوڑھے آدمی کو دیتی ہے۔ وہ دھیان سے دیکھتا ہے۔ یہ بچہ نہیں ہے۔ ایک بغیر کان، ناک، آنکھ، بے صورت، بے شکل، گوشت کا لوتھڑا ہے۔ وہ داڑھی والا بوڑھا آدمی بچے کو ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھاتا ہے اور اپنے مضبوط کھردرے ہاتھوں سے بے جان لوتھڑے میں سے اس کی جان نکال لیتا ہے۔

اگلے ہی پل ناٹک کی روشنیوں کے جادو سے وہ دس پندرہ عورتیں ہزاروں عورتیں بن جاتی ہیں اور انھیں میں مجھے سلمیٰ کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کی گود میں بھی ایک بے جان لوتھڑا ہے۔

مگر سلمیٰ کی آنکھیں چمک رہی ہیں جیسے ایک نوجوان لڑکی کی آنکھیں اپنے محبوب کو دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں۔

"اور پھر ایک آواز آئی: "عالم میری جان، میں آرہی ہوں۔" یا صرف میرے کانوں نے آواز سنی اور کسی نے سنی ہو یا نہ سنی ہو۔

پھر اچانک روشنیاں بجھ گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ صرف تال کی سرسراتی لہروں کی نازک مار جو کنارے پر پڑ رہی تھی۔

پھر جب ستاروں کی روشنی میں بھارت بھون کے ایکٹروں نے ایک عورت گری ہوئی دیکھی

تو میں بھی ان کے ساتھ وہاں دیکھنے پہنچا تو دیکھا کہ سلمیٰ وہاں بے جان پڑی ہے جہاں ابھی کچھ لمحہ پہلے کھڑی تھی۔

اس نے مشکل سے آنکھیں کھولیں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا: ''خدا حافظ! عباس صاحب۔ میری کہانی لکھنا نہ بھولیے گا۔ یہ میری کہانی نہیں ہے۔ یہ بھوپال کی ٹریجڈی ہے۔ یہ عالم کی کہانی ہے اور اس کی فیکٹری کی جہاں وہ کام کرتا تھا۔ یہ وہی فیکٹری ہے جس نے اس کی جان لی ہے۔''

یہ کہا اور اس کو ہلکی سی کھانسی آئی۔ اس کی آنکھیں پتھرائیں اور وہ خاموش ہوگئی۔ ہمیشہ کے لیے خاموش۔

مگر میرے کانوں میں اس کے وہ الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے: ''میرا نام ہے، کیپٹن سلمیٰ! آپ چکن سوپ ہی پیجیے۔''

☆☆☆

آسمانی تلوار

آؤ بیٹا آؤ! باہر بارش میں کیوں کھڑے ہو؟ اندر آ جاؤ نہیں تو سردی لگ کر بخار ہو جائے گا۔ جب تک پانی پڑ رہا ہے تم غریب بڑھیا کی جھونپڑی میں آرام کرو۔ پھر چلے جانا۔ بھگوان کی لیلا نیاری ہے بیٹا! جس بارش سے دھرتی میں زندگی پڑتی ہے بیج کونپل بنتا ہے اور کونپل پودا بنتی ہے۔ وہی بارش سیلاب بن کر ہزاروں کی جان لے لیتی ہے۔ جب گنگا مائی بپھر جاتی ہے تو پورے پورے گاؤں بہا کر لے جاتی ہے۔ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے اور کیا؟ جیسا بوؤ گے ویسا ہی کاٹو گے۔ ایسا تو ممکن نہیں کہ بیج تو ڈالو جوار کے اور فصل کاٹو دھان کی۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے بھگوان شو کی آنکھ سب دیکھتی رہتی ہے اور جب پاپ اور ظلم حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو وہ آنکھ ایک ہی نظر میں سب کو بھسم کر ڈالتی ہے۔

یوں تو بھگوان کے لاکھوں ہتھیار ہیں، ایک سے ایک انوکھے! اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب کسی پر پڑتی ہے تو پتا بھی نہیں چلتا اور اپنا کام کر جاتی ہے لیکن سب سے زبردست ہتھیار بھگوان نے اندر دیوتا کو سونپ رکھا ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ سارے دیوی دیوتاؤں کے وہ راجہ جو ٹھہرے۔ دیولوک میں ان کا ہی تو حکم چلتا ہے۔ سچائی کی فوج کو لے کر راکھشسوں سے بھی انھیں ہی تو لڑنا ہوتا ہے تو ایسے خطرناک دشمنوں کا سامنا کرنے کے لیے ہتھیار بھی خطرناک ہونا چاہیے۔

یہ بجلی جو تم بادلوں میں چمکتے ہوئے دیکھتے ہو بیٹا! یہی اندر دیوتا کی دو دھاری تلوار ہے۔ اس کی چمک اور کڑک بڑے بڑوں کا دل دہلا دیتی ہے۔ پلک جھپکتے میں اپنا کام کر کے پھر آسمان پر اندر دیوتا کے پاس پہنچ جاتی ہے جبھی تو بادلوں کی گرج سنتے ہی پاپی کانپنے لگتے ہیں۔ اندر دیوتا کی یہ تلوار لوہے فولاد کی بنی ہوئی نہیں بیٹا! لوہے کی تلوار کو تو زنگ بھی لگ جاتا ہے۔ دھار بھی کھنڈی ہو جاتی ہے۔ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ لیکن یہ نرالا ہتھیار تو ایک انوکھی ہی دھات کا بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں

کہ ایک بڑے پہنچے ہوئے رشی نے بھگوان کی اتنی بھگتی اور تپسیا کی کہ ان کے جسم کا سارا گوشت جھڑ گیا۔ بس سوکھی ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔ ان متبرک ہڈیوں سے جو ہیرے کی طرح سخت اور تیز اور چمکیلی تھیں بھگوان نے ایک تلوار بنائی اور وہ اندر دیوتا کو سونپ دی کہ جہاں کہیں پاپ اور ظلم کو بڑھتا ہوا دیکھیں اس آسمانی تلوار سے اس کو ختم کر دیں۔

یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا بیٹا کہ بجلی کالے سانپ پر گرتی ہے۔ بھلا کیوں؟ اس لیے کہ زہریلے ناگ پچھلے جنم میں پاپی اور ظالم تھے جنھوں نے دوسروں کو ڈس کر دکھ پہنچایا اور دنیا میں زہر پھیلایا۔ اسی کی تو یہ سزا ہے کہ اس بار بھگوان نے انھیں سانپ کے روپ میں پیدا کیا لیکن بجلی صرف سانپوں پر ہی نہیں، بے ایمان، گندے اور زہر بھرے انسانوں پر بھی گرتی ہے۔ بھگوان شو کی آنکھ اجلے کپڑوں، اونچی پگڑیوں اور امیری ٹھاٹ باٹ سے دھوکہ نہیں کھاتی۔ وہ دل کے اندر کی ساری میل اور کھوٹ کو دیکھ سکتی ہے اور جب اندر دیوتا کی تلوار کا وار پڑتا ہے تو وہ اونچے اونچے درختوں کی چھاتی چیرتی ہوئی پاپیوں کی گردن تک جا پہنچتی ہے۔

تم لوگ پڑھے لکھے ہو بیٹا! ایک پاگل بڑھیا کی بات کیوں مانو گے۔ لیکن میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جو کچھ کہہ رہی ہوں، سب سچ ہے۔ یہ تو اب یاد نہیں کہ کتنے برس کی بات ہے۔ شاید بیس پچیس، تیس برس ہوئے ہوں گے۔ اب بھی بہتیرے لوگ اس گاؤں میں ہوں گے جنھیں یہ بات یاد ہوگی اور اگر اپنی آنکھوں دیکھا ثبوت چاہتے ہو تو تالاب کے پرے کھیتوں کے بیچ میں جو نیم کے پیڑ کا ٹھنٹھ کھڑا ہے، جا کر اسے دیکھ لو۔ کسی زمانے میں یہ اتنا بڑا اور گھنا پیڑ تھا کہ بیس آدمی بھی نیچے کھڑے ہو جائیں تو ان پر ایک بوند بارش کی نہ گرے۔ لیکن اس دن سے آج تک اس کی ٹہنیوں میں کبھی ہریالی نہیں آئی۔ یوں ہی جلا بھنا کھڑا ہے اور آسمان کی طرف انگلی اٹھائے اس دن کی یاد دلا رہا ہے۔

وہ بارش مجھے آج تک یاد ہے۔ اس برس سے بھی کہیں زیادہ پانی برسا تھا۔ یہ کچی سڑک جو آگرہ والی پکی سڑک سے ہمارے گاؤں تک آتی ہے، پوری پانی میں ڈوب گئی تھی اور آنے جانے والے کھیتوں کھیتوں پگڈنڈیوں پر سے آتے جاتے تھے۔ ہم اچھوتوں کی جو یہ بستی گاؤں کے باہر ہے، یہاں کتنے ہی جھونپڑوں کی کچی اینٹوں کی دیوار گر پڑی تھی۔ ایک ننھا سا بیس بائیس دن کا بچہ بھی مر گیا تھا...... مجھ بڑھیا کو معاف کرنا بیٹا! میری آنکھیں دکھتی ہیں تو پانی نکلتا ہی رہتا ہے۔ ہاں تو اس برسات میں ایک دن کی بات ہے کہ رات بھر کی موسلا دھار بارش کے بعد صبح سویرے پانی

ذرا رُکا تو بہت سے گاؤں والے جو کئی دن سے اپنے گھروں میں بند بیکار بیٹھے تھے کام کاج کو نکل پڑے۔ کوئی کھیتوں میں نلائی کرنے نکل گیا، کسی کو پاس کے قصبے میں کوئی کام یاد آ گیا۔ سوموار کا دن تھا۔ شاید اس دن سامنے والے گاؤں راجہ پور میں بازار لگتا تھا۔ کئی ایک وہاں چلے گئے۔ مگر آسمان پر بادل تب بھی چھائے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی ٹھکانا نہیں بیٹا! کون جانے کب پھر جھڑی لگ جائے اور ہوا بھی یہی۔ دو چار گھنٹے تو کھلا رہا پھر وہ گھٹا ٹوپ چھایا کہ دن میں رات جیسا اندھیرا ہو گیا۔ ساتھ میں گھڑی گھڑی بجلی ایسی چمکنے لگی جیسے اندھیرے میں کوئی تلوار چلا رہا ہو۔ پھر ایک دم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بالکل ایسی جیسے آج ہو رہی ہے۔

گاؤں کے کتنے ہی آدمی باہر نکلے ہوئے تھے جو کہیں پاس ہی تھے۔ وہ تو بھیگتے بھاگتے گاؤں کی طرف بھاگے۔ جو دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے وہ وہیں رک گئے۔ لیکن چار آدمی ایسے تھے جو نکلے تو تھے الگ الگ مگر ایک ایک کر کے اسی نیم کے نیچے پہنچ گئے۔ یا یوں کہو کہ ان کی قسمت انھیں وہاں کھینچ کر لے آئی۔

ان چاروں میں سے تم نے کسی کو تو کیا دیکھا ہو بیٹا! تم تو شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی شاید ان میں سے ایک کا نام سنا ہو گا۔ یہ جو آج کل ہمارے زمیندار ہیں نا۔ ان کا بڑا بھائی ٹھاکر ہرنام سنگھ۔ بڑا تگڑا اور رنگیلا نوجوان تھا۔ یہ چوڑی چھاتی بڑی بڑی بارعب مونچھیں۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کے ٹھاکروں کی کتنی ہی بیٹیاں اس کے نام پر کنواری بیٹھی تھیں۔ گاؤں میں کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا تو لڑکیاں اسے کواڑوں کے پیچھے چھپ کر جھانکتیں۔ زبان کا بھی بڑا میٹھا تھا۔ بولتا تھا ایسا کہ سننے والے پر بس جادو ہی ہو جائے ......

آج نہ جانے میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے بیٹا! بہے ہی جا رہی ہیں ......

ہاں تو وہ تھا زمیندار کا بیٹا، مگر پرجا سے ہمیشہ میٹھا بول ہی بولتا تھا۔ انعام واکرام بھی بہت دیتا تھا۔ گاؤں بھر میں سب اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کہتے کہ زمیندار ہو تو ہرنام سنگھ جیسا ہو۔ شکار کا بہت شوق تھا اسے۔ اُس دن بھی گھوڑے پر سوار ہو کر مرغابیوں کے شکار کو نکلا تھا۔ لیکن جھیل تک پہنچا نہیں تھا کہ بادلوں کی کڑک سے گھوڑا ایسا بدکا کہ بھاگتا بھاگتا دلدل میں جا گرا۔ ٹھاکر مرتے مرتے بچا مگر گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بے زبان جانور کو درد سے چلاتے دیکھا تو ٹھاکر سے نہ رہا گیا اور اسے گولی مار دی۔ میں نے کہا نا کہ وہ تھا بڑا رحم دل۔ ادھر سے پیدل ہی اپنی کوٹھی کو واپس جا رہا تھا کہ ایک دم زور کی بارش آ گئی اور بھاگ کر نیم کے پیڑ کے نیچے پناہ لینا پڑی جہاں

اس کے تین جاننے والے پہلے ہی سے وہاں کھڑے تھے۔

ان میں سے ایک تو پنڈت دھرم داس تھا۔ دبلا پتلا سوکھا سا برہمن۔ گلے میں جنیو، ماتھے پر یہ بڑا چندن کا ٹیکا۔ سارے گاؤں میں وہی سب سے زیادہ پڑھا لکھا عقلمند شخص تھا۔ کہتے تھے اسے سارے وید شاستر زبانی یاد تھے۔ ہر وقت اسے دھرم اور سماج کی رکشا ہی کی فکر رہتی تھی۔ یہ اسی کا دم تھا کہ ہمارے گاؤں میں ادھرمی اور ناستک خیالات کبھی نہ پھیل سکے۔ ایک بار کہیں سے ایک سدھارک آ گیا اور لگا کہنے کہ ہندوؤں کو ذات پات چھوڑ کر اچھوتوں کو اپنا بھائی سمجھنا چاہیے۔ لیکن دھرم داس نے ناستک اور ادھرمی کہہ کر اسے فوراً گاؤں سے نکلوا دیا۔ دھرم داس خود تو غیر شادی شدہ تھا، لیکن اسے گاؤں کی عزت و آبرو کا بہت خیال رہتا تھا۔ گاؤں کے کسی لڑکے یا لڑکی کو کبھی ایسی ویسی بات کرتے دیکھ لیتا تو آگ بگولا ہو جاتا اور پنچایت سے ایسی کڑی سزا دلواتا کہ پھر کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ پاپ کے راستے پر قدم رکھ سکے۔ ہاں ایک لڑکی تھی، مولو رام سنار کی ابھاگن بیٹی چندا۔ وہ نہ جانے کیسے پاپ کے گڑھے میں گر پڑی۔ اس کلنکنی نے بن بیاہی ہو کر بچہ جنا تھا۔ ماں باپ نے اسے کتنا ہی پیٹا اور پنچوں نے کتنا ہی سمجھایا، دھمکایا۔ لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ بچے کا باپ کون ہے۔ یہی کہتی رہی کہ میں نے پاپ کیا ہے، جو سزا دینا ہے مجھے دے دو۔ اس لیے پنڈت دھرم داس کے کہنے پر چندا کو اس کے پاپ کی نشانی سمیت گاؤں سے باہر نکال دیا گیا۔ پھر گاؤں والوں نے سنا کہ اسے گاؤں کے باہر اچھوتوں کی بستی میں پناہ مل گئی ہے اور یہ سن کر پنڈت جی نے کہا کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کیونکہ بھگوان کی نظر میں پاپی اور اچھوت برابر ہی ہیں۔

دوسرا وہاں پیڑ کے نیچے ساہوکار مولچند تھا جو رہتا تو تھا راجپور میں لیکن جس سے لین دین ہمارے گاؤں والوں کا بھی بہت چلتا رہتا تھا۔ جب بھی ضرورت پڑے اس کے پاس چلے جاؤ، روپے کا انتظام کر ہی دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بیاج کڑا لیتا تھا۔ اور پہلے برس کا بیاج تو رقم میں سے پہلے ہی نکال لیتا تھا۔ لیکن سب کہتے یہ تو ساہوکاری کا اصول ہے۔ اس کا کیا رونا۔ مولچند بات تو بڑی حلیمی سے کرتا ہے اور آڑے وقت میں کام بھی آتا ہے......

یہ دین دھرم کے کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ کتھا ہو، پوجا ہو، پاٹھ ہو، کیرتن ہو، ہون ہو، ہر بات میں سب سے بڑی رقم چندہ کی اس سے ملتی تھی۔ دان دھرم کا اسے بہت خیال رہتا تھا۔ مولو رام سنار کی بیٹی چندا کو جب گاؤں والوں نے نکال دیا تو مولچند مہاجن نے پنڈت جی کو بہت شاباشی دی اور کہا "پنڈت جی! تم نے تو پھر بھی نرمی برتی۔ ہمارے گاؤں کی کوئی چھوکری ایسا

کرتی تو ٹانگیں توڑ دیتے ہم۔اس کی ٹانگیں۔'' ایک اور بات مول چند کی یہ تھی کہ وہ کپڑے ہمیشہ بڑے اجلے پہنتا تھا جیسے ابھی دھوبی کے گھر سے دھل کر آئے ہوں۔ مہین ململ کا بیل لگا ہوا کرتا۔ آستینوں پر چنٹ پڑی ہوئیں اور سفید چنٹی دھوتی۔ عطر بھی بہت لگاتا تھا۔ دور ہی سے پتا چل جاتا کہ مہاجن آرہا ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے کہ اس کا پسینہ بڑا بدبودار ہے اسی لیے اتنا سارا عطر لگاتا ہے۔ ایک دن کسی نے اس سے کہا ''مہاجن!، یہ تمھارے کپڑے ہر وقت اتنے اجلے کس طرح رہتے ہیں؟ دن میں دو تین بار بدلتے ہو گے؟'' اس پر وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ دھوبی کی دھلائی کی بات نہیں ہے بھیاّ۔ یہ من کی صفائی ہے اور تم جانو من اجلا سو تن اجلا۔ تن اجلا سو من اُجلا۔''

تیسرا وہاں رحمت خاں پٹواری تھا بیٹا! اب تو پٹواریوں نمبر داروں کی وہ پرانی بات رہی نہیں لیکن ان دنوں تو یوں سمجھو کہ رحمت خاں ہمارے گاؤں کا بادشاہ جارج پنجم، بڑا لاٹ، چھوٹا لاٹ اور کلکٹر صاحب، سب کچھ ہی تھا۔ زمینوں کا ناپنا، داخل خارج، سب کام اسی کے ہاتھ سے ہوتے تھے۔ گاؤں والے ٹھہرے ان پڑھ۔ جیسے ساہوکار کے کہنے پر اس کے کاغذ پر انگوٹھا لگا دیتے تھے، ویسے ہی پٹواری کے کہنے سے سٹامپوں اور سرکاری کاغذوں پر انگوٹھا لگا دیتے تھے۔ زمینوں کے بارے میں جو کام بھی ہوتا وہ رحمت خاں خوشی سے کر دیتا اور کام ہو جانے پر وہ بھی اسے خوش کر دیتے تھے۔ اب اسے چاہے رشوت سمجھ لو یا کچھ اور سمجھ لو۔ لیکن ویسے بڑا شاندار آدمی تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی۔ روزے نماز کا بڑا پابند تھا۔ گاؤں کی مسجد میں پانچوں وقت حاضری دیتا تھا۔ ایک بار حج بھی کر آیا تھا اور اس سال پھر حج کو جانے کی بات کر رہا تھا اور اسی لیے اسے خوش کرنے کے لیے اب کسانوں کو ذرا زیادہ رقم دینی پڑتی تھی۔ دو بیویاں تھیں اور دونوں سے وہ بڑا کڑا پردہ کرواتا تھا۔ خاص کر چھوٹی سے جو مشکل سے بیس بائیس برس کی ہو گی اور عمر میں اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ ذات کا پٹھان تھا۔ اس لیے دماغ ذرا گرم تھا۔ ویسے بھی تگڑا تو تھا ہی۔ ایک دن تاؤ میں آکر نور بخش جولاہے کے تھپڑ مار دیا تھا کیونکہ اس نے اچھی طرح خوش نہیں کیا تھا۔ وہ تین دن کھاٹ پر پڑا رہا۔ ایسے ہی ایک دن چھدو چمار پر غصہ آ گیا تو اسے زمین پر دے مارا۔ لیکن ایسا غصہ وہ نیچ ذات والوں کے ساتھ ہی برتتا تھا۔ زمیندار صاحب سے، پنڈت جی سے، ساہوکار سے وہ بڑے ادب سے بات کرتا تھا اور گاؤں میں تحصیلدار، نائب تحصیلدار، تھانے دار یا کوئی دوسرا افسر دورے پر آنکلتا تو ان کے خیر مقدم میں وہ اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ سب کہتے ''اپنا پٹواری ہے بڑا دل والا۔ اور اس کی پہنچ بھی دیکھو۔ کتنے بڑے بڑے افسروں تک ہے......''

ہاں تو یہ چاروں پیڑ تلے کھڑے بھگوان سے پرارتھنا کر رہے تھے کہ بارش رک جائے۔ اس دن گرج چمک بھی بہت زوروں پر تھی۔ ایک بار بجلی زور سے چمکی تو وہ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے پگڈنڈی پر رلدو چمار اور وہ سنار کی لونڈیا جسے انھوں نے گاؤں نکالا دے رکھا تھا، دونوں پانی میں شرابور اس پیڑ کی طرف چلے آرہے ہیں۔

ہاں بیٹا! یہ بتانا تو میں بھول ہی گئی تھی کہ بوڑھا رلدو چمار تھا تو ذات کا اچھوت، لیکن چونکہ گاؤں والے اسی سے جوتے بنواتے تھے اس لیے گاؤں کے سارے بچے اسے رلدو کاکا، رلدو کاکا کہتے تھے جس دن چندا کو گاؤں سے نکالا گیا، وہ اچھوتوں کی بستی میں سے اپنے بچے کو لیے روتی ہوئی جارہی تھی۔ رلدو نے دیکھا تو کہا: ''بیٹی! اس حالت میں تو کہاں جائے گی۔ جب تک تیرے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہو، تو میرے ہاں ٹھہر جا۔'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ سو چندا رلدو چمار کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہنے لگی۔ اس کے باپ نے جب یہ سنا تو اس نے بھی کہا: ''چلو اچھا ہی ہوا۔ رلدو ہے تو چمار، لیکن اپنی جان پہچان والا ہے اور ویسے آدمی بھی اچھا ہے۔ ادھر ادھر مارے مارے پھرنے سے تو یہی اچھا کہ چندا اسی کے ہاں رہے۔'' لیکن بہت سے اونچی ذات والے ایسے بھی تھے جو کہنے لگے کہ اچھوت کے ہاں رہنے سے تو اچھا تھا کہ چندا جھیل میں ڈوب کر جان دے دیتی اور اگر بگڑے دل نوجوانوں کا بس چلتا تو رلدو کا جھونپڑا جلا کر راکھ کر ڈالتے۔ وہ تو بڑے بوڑھوں نے انھیں روک لیا اور پھر بارش بھی اتنے زور سے ہو رہی تھی کہ کسی کا باہر نکلنا بھی محال تھا۔ جب آسمان پھاڑ کر اتنا پانی برس رہا ہو تو آگ کہاں لگ سکتی ہے؟

میں نے کہا نا بیٹا، یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ بارش نے رلدو چمار کے جھونپڑے کو جلنے سے تو بچا لیا لیکن اسی بارش نے اس کی کچی اینٹوں کی دیواروں کو ڈھا دیا۔ اس وقت رلدو تو اپنی دوکان میں بیٹھا جوتے بنا رہا تھا اور چندا کے بچے کو سردی لگ کر بخار آرہا تھا۔ اس لیے وہ پڑوس کی چمارن کے ہاں کوئی دوا مانگنے گئی ہوئی تھی۔ جھونپڑے میں بس اس کا بچہ ہی تنہا تھا۔ اتنے میں اڑا اڑا دھم۔ پچھواڑے کی دیوار ڈھ کر چھپر نیچے آرہا۔ رلدو اور چندا دونوں بھاگے آئے۔ مگر اس وقت تک بچہ مر چکا تھا۔ نامراد ننھی سی جان۔ اس نے ایک چیخ بھی تو نہ ماری۔ بس چپکے سے جان دے دی۔ بیٹا میں سوچتی ہوں چندا کا بچہ اس دن مرا نہ ہوتا تو آج تمھاری عمر کا ہوتا......

اپنے مردہ بچے کو دیکھ کر چندا کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلا۔ ایسی ہوگئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے بچے کے مرنے پر رو کر دل کی بھڑاس نہیں نکالی۔ اس لیے

اس کا دماغ پھر گیا اور وہ پاگل ہوگئی۔

نہ جانے آج میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے بیٹا! پانی تھمے اور تم سے ہو سکے تو بازار میں وید جی کی جو دکان ہے وہاں سے دوا لا دینا...... میں بھی کہاں سے کہاں بہک جاتی ہوں۔ ہاں تو رلدو چمار اور کلنکنی چندا کو اس پیڑ کی طرف آتے دیکھ کر ان چاروں کا ماتھا ٹھنکا۔

پنڈت دھرم داس نے چلا کر کہا— ''رلدو کہاں منہ اٹھائے چلا آرہا ہے۔ وہیں ٹھہر۔''

رلدو ٹھٹھکا۔ پھر دور سے ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا: ''پنڈت جی، دیا کرو۔ طوفان بڑا بھیانک ہے۔ ہم دونوں ایک طرف کھڑے ہو جائیں گے۔''

یہ کہہ کر رلدو آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ دھرم داس نے پھر للکارا: ''بس بس۔ ایک ذرا سا پیڑ ہی تو ہے۔ یہاں کون سا محل کھڑا ہے جو ایک کونے میں تم بھی کھڑے ہو جاؤ گے۔''

اور پھر اس نے ٹھاکر ہرنام سنگھ سے کہا: ''ٹھاکر صاحب! انھیں یہاں نہ آنے دینا چاہیے؟ نہیں تو ہم سب مارے جائیں گے۔''

اس پر پٹواری رحمت علی خاں بولا: ''کیوں پنڈت جی! کیا خطرہ ہے؟''

پنڈت بولا: ''تم نہیں جانتے خان صاحب! دھرم شاستروں میں لکھا ہے کہ بجلی، پاپی اور اپوتر لوگوں پر گرتی ہے۔ ان میں ایک اچھوت ہے دوسری کلنکنی۔ اگر یہ یہاں آگئے تو سمجھ لو ساتھ میں ہماری بھی موت آگئی۔'' پٹواری بولا: ''جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو...... پنڈت جی! ایسا ہے تو انھیں پاس بھی نہ پھٹکنے دینا چاہیے۔''

''ہاں اور کیا۔'' مہاجن جلدی سے بولا ''جان تھوڑے ہی دینا ہے ان کے لیے۔''

چندا جو ٹکٹکی باندھے پاگلوں کی طرح ٹھاکر ہرنام سنگھ کو گھورے جا رہی تھی اب مارے سردی کے کانپنے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رلدو نے ایک بار پھر منت کی: ''سرکار! لونڈیا کو کپکپی چھوٹ رہی ہے۔ نمونیہ ہو کر مر جائے گی۔ اس کا بچہ تو پہلے ہی جھونپڑے کی دیوار کے نیچے دب کر مر چکا ہے۔''

چندا اب بھی ٹھاکر کو گھورے جا رہی تھی۔ مگر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اپنی بندوق کھول کر اس کی نال میں جھانکنے لگا۔ جیسے اس بات چیت سے اسے کوئی سروکار نہ ہو۔ اور بیٹا تھا بھی ٹھیک۔ وہ ٹھہرا زمیندار۔ اسے ان نیچ لوگوں کے مرنے جینے سے کیا؟

چندا کے بچے کے مرنے کی سن کر دھرم داس نے کہا: ''چلو اچھا ہوا پاپ کی نشانی ختم ہوئی۔''

رلدو بولا: ''ہاں پنڈت جی! جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ میں تو اسی لیے چندا کو اس کے باپ کے پاس لے جا رہا تھا کہ جس وجہ سے اس بیچاری کو گھر سے نکالا تھا وہ بچہ ہی نہیں رہا تو اب تو پرائشچت کرا کے اسے گھر میں رکھ لیں۔''

لیکن مہاجن نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنی میٹھی زبان سے کام نکالنا چاہا۔ کہنے لگا: ''وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا رلدو۔ مگر اب تم جاؤ۔ کوئی اور پیڑ تلاش کرو۔ اس پیڑ کے نیچے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔''

رلدو نے کہا: ''ساہوکار جی! تم تو جانو ہو، یہاں دور دور کوئی دوسرا پیڑ نہیں ہے۔'' اور مہاجن نے اسے بات سمجھانے کے لیے کہا: ''رلدو! ذرا سوچ سمجھ کر بات کر۔ دھرم شاستر کے لکھے کا تو خیال کر۔ تم دونوں پر بجلی گرنے کا ڈر ہے۔ اپنے ساتھ کیوں ہمارا بھی خون کرواتے ہو؟ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے مگر دیکھو تو ٹھاکر صاحب ہیں یہاں کے، پنڈت جی ہیں، پٹواری جی ہیں......''

اتنے میں وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ابھاگن چندا سردی سے کانپتی، کیچڑ میں پھیلتی ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس کے پیچھے رلدو۔ ''چندا بیٹی کیا کر رہی ہے؟ چندا بیٹی کیا کر رہی ہے۔'' کہتا ہوا آ رہا ہے اور اسی وقت ان کے سامنے کے بادلوں میں بجلی زور سے چمکی اور اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ زمین کانپ اٹھی۔

پنڈت زور سے چلّایا! ''ٹھاکر صاحب! بندوق سنبھالیے، نہیں تو غضب ہو جائے گا۔ ہم سب مر جائیں گے۔''

ٹھاکر نے بندوق اٹھا کر کندھے سے لگائی لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اپنی طرف بندوق کا منہ دیکھ کر چندا تو جیسے بالکل ہی پاگل ہو گئی۔ چلّائی: ''تم تو مجھے پہلے ہی مار چکے ہو ٹھاکر۔ اب بندوق چلانا چاہتے ہو تو یہ شوق بھی پورا کر لو۔ میں بھی اپنے بچے کے پاس پہنچ جاؤں۔'' اور پھر مری ہوئی آواز میں اس نے کہا: ''تمھارے بچے کے پاس۔''

اس کی یہ عجیب بات سن کر سب کو پکّا یقین ہو گیا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ دور بادلوں میں ایک بار پھر گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی جیسے بجلی گرنے کی تیاری ہو۔ چندا کو ایک قدم اور بڑھتے دیکھ کر مہاجن چلّایا: ''سرکار! کیا دیکھتے ہیں؟ چلایئے گولی۔ نہیں تو یہ پگلی اپنے ساتھ ہمیں بھی لے مرے گی۔''

لیکن بیٹا! ٹھاکر کی بندوق نہیں چلی اس سے پہلے بھگوان کی تلوار چل گئی۔ ابھی وہ بندوق کا

گھوڑا دبانے ہی والا تھا کہ ایسی بھیانک چمک ہوئی جیسے سورج دیوتا دھرتی پر آ گئے ہوں۔ رلدو اور چندا نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دھماکہ ہوا۔ اتنے زور کا دھماکا بیٹا، جیسے سیکڑوں توپیں ایک دم چلی ہوں۔ دھرتی کانپ اٹھی اور رلدو اور چندا زمین پر آ رہے اور انھیں یقین ہو گیا کہ بجلی ان پر گری ہے......

مگر بیٹا! جسے بھگوان رکھے اسے کون چکھے۔ جب انھوں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ وہ نیم کا پیڑ چوٹی سے لے کر جڑ تک بجلی سے جلا ہوا ہے اور اس کے نیچے چار لاشیں جھلسی پڑی ہیں۔ ٹھاکر کی بندوق اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی لیکن اس کی نال پر بجلی گری تھی اور وہ گل کر اس طرح تڑ مڑ گئی تھی جیسے موم کی بنی ہو۔

ہاں بیٹا! میں کہتی ہوں اندر دیوتا کی آسمانی تلوار کا ہم انسانوں کی تلواریں، بندوقیں بھلا کیا مقابلہ کر سکتی ہیں؟ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے اور کیا؟ جیسا بوؤ گے، ویسا کاٹو گے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ بیج تو ڈالو جوار کے اور فصل کاٹو دھان کی۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے بھگوان شو کی آنکھ وہ سب دیکھتی رہتی ہے۔ وہ اُجلے کپڑوں، اونچی پگڑیوں یا امیری ٹھاٹ باٹ سے دھوکہ نہیں کھا سکتی۔ دل کے اندر کی ساری میل اور سارے کھوٹ کو دیکھ سکتی ہے اور اس لیے جب اندر دیوتا کی تلوار کا وار پڑتا ہے تو وہ اونچے اونچے درختوں کی چھاتی چیرتی ہوئی پاپیوں کی گردن تک جا پہنچتی ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، تم اسے ایک پگلی بڑھیا کی بڑ سمجھ رہے ہو نا بیٹا! تم سوچتے ہو کہ جب وہ سب وہیں کے وہیں مر گئے تو پھر مجھے یہ سب حال کیسے معلوم ہوا؟ لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ نہیں ہے بیٹا......لو، بارش بھی کم ہو گئی۔ اب باہر جاؤ تو بازار میں وید جی کی دوکان پر ہوتے جانا۔ ان سے کہنا آج میری آنکھ سے پھر پانی بہہ رہا ہے۔ کوئی دوا دے دیں۔ کہنا تمھیں پگلی چندا نے بھیجا ہے۔

لیکن تم تو پہلے ہی چلے گئے میری اوٹ پٹانگ باتوں سے کترا کر۔ آخر تم نے بھی میری کہانی نہیں سنی۔ کوئی میری کہانی نہیں سنتا۔ میں پگلی جو ہوں...... بارش تھمنے تک تو ٹھہر جاتے بیٹا۔''

☆☆☆

سردی گرمی

سردی کس کو کہتے ہیں؟ (فزکس کے نوجوان پروفیسر رمیش چندر نے سوچا) گرمی کس کو کہتے ہیں؟

ٹمپریچر ایک ہی ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ بیس ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ پھر یہ کیا وجہ ہے کہ کسی کو سردی لگتی ہے کسی کو گرمی لگتی ہے۔ کوئی پوری آستینوں کا اُونی سوئٹر پہنے دکھائی دیتا ہے تو کوئی شرٹ اور نیکر میں مگن ہے۔ وہ روز سویرے سمندر کے کنارے ٹہلنے جاتا تھا۔ وہاں نومبر، دسمبر، جنوری میں دیکھتا کہ کچھ لوگ کنٹوپ پہنے چلے آ رہے ہیں۔ کچھ لوگ اُونی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ بنیان اور نیکر میں دوڑ لگا رہے ہیں۔ سوال صرف عمر کا نہیں تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ سردی لگتی ہے۔ سوال ساتھ میں اقتصادیات کا بھی تھا۔ دہلی میں سردی کے موسم میں اکثر اُس نے دیکھا تھا کہ ایک امیر آدمی اونی بنیان، قمیص، اونی پل اوور، اونی کوٹ پر اونی مفلر اور اونی بھاری اوورکوٹ پہنے ہوئے ہے، جبکہ اُس کے ساتھ ہی ایک قلی صرف ایک سوتی کھیس اوڑھے ہوئے چل رہا ہے۔

سوال زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ مرد اپنے بدن پر اتنا اونی ساز و سامان لادے ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے عورتیں خصوصاً موجودہ زمانے کی فیشن ایبل عورتیں سلک کی ساڑیوں پر ایک ہلکی بناوٹ کا لال یا سبز گریبان کھلا پل اوور پہنے ہوئے ہیں۔ تو سردی اور گرمی میں فیشن کا بھی دخل تھا۔ یوروپین عورتیں سلک کی جُرابیں اور اونچی ایڑی کے بوٹ پہنتی ہیں اور اُن کے مرد اونی موزے اور یہاں تک کہ فر لگے ہوئے بوٹ پہنتے ہیں۔

وہ بمبئی میں رہتا تھا اس لیے اس کے لیے حیرت کی بات تھی کہ پانچ لاکھ مرد عورتیں اور بچے آسمان کے نیچے فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ سارے سال جنوری سے لے کر دسمبر تک جب کہ امیر آدمی کمبل اور لحاف اوڑھے اپنے اپنے بیڈروم میں سوتے تھے۔ یہ غریب بیچارے زیادہ سے زیادہ

سر سے پیر تک سوتی چادر لپیٹ لیتے تھے اور بس— ہو گیا سردی کا علاج—!

مزاج کی سردی گرمی بھی ہوتی ہے، مثلاً اُس کے نوجوان طلبہ سردی میں قمیص کے گریبان کھولے پھرتے تھے۔ اس کا دوست آنند راج دسمبر کے مہینے میں بھی ننگے بدن پر پنجابی لاچہ باندھے اپنے گھر میں گھومتا تھا۔ اُس پر بھی پنکھا چلاتا تھا، جبکہ رمیش کو سوئٹر پہنے ہوئے بھی سردی لگتی تھی۔

سردی کیا ہے؟ (اُس نے سوچا) گرمی کیا ہے؟ کیا تھرمامیٹر سے سردی گرمی کو ناپا جاسکتا ہے؟— کس چیز کا ٹمپریچر لیں گے؟ ہوا کا؟ یا جسم کا؟ امیر کا یا غریب کا؟ مرد کا یا عورت کا؟ ٹمپریچر تو وہی ہوگا۔ مگر کسی کو بہت سردی لگ رہی ہوگی کسی کو کم۔

فزکس کے حساب سے تو دہلی میں کڑاکے کی سردی ہونی چاہیے۔ (اُس نے ہوائی جہاز سے اُترتے ہوئے کوٹ کا کالر اوپر کرتے ہوئے سوچا)۔ دسمبر کی رات تھی اور دس بجنے والے تھے۔ اُس کے آگے ایک صاحب بغیر آستینوں کا پُل اوور پہنے چل رہے تھے۔ قمیص کا گریبان کھلا ہوا تھا۔ پیچھے ایک ہِپّی سوتی جینز پہنے ہوئے اپنا بستر کندھے پر لادے آرہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان حسینہ تھی جو سوتی جینز پر ایک چھوٹی سی سوتی جیکٹ ہی پہنے ہوئے تھی۔ لگتا ہے یہ لوگ شراب کی یا حشیش کی گرمی سے اپنی حفاظت کیے ہوئے ہیں (اس نے سوچا)۔ مگر جب ائیر پورٹ سے باہر نکلنے لگا تو دیکھا کہ قلی جو اس کا سوٹ کیس اُٹھا کر لایا تھا، وہ ایک سوتی کھیس کو شال کی طرح لپیٹے ہوئے تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی ایک ہلکی سی اونی چادر لپیٹے ہوئے تھا۔ ٹانگوں میں لٹھے کا پاجامہ ہی تھا۔

”کیوں بھئی، دہلی میں سردی کا کیا حال ہے؟ اس نے ٹیکسی چلتے ہی پوچھا۔“

”سردی تو اس سال کڑاکے کی پڑ رہی ہے۔“ اُس نے جواب دیا اور ہاتھ دکھانے کے لیے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرلیا۔ سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کے اُوپر کیے ہوئے کالر کے اندر اُس کے اونی بنیان تک ایک برفیلا خنجر اُتار گیا۔ وہ بہت زور سے چھینکا اور ٹیکسی ڈرائیور سے کھڑکی بند رکھنے کو کہا۔

ڈرائیور نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا: ”کیا کریں بابو جی! چوراہے پر ہاتھ دکھانا ہی پڑتا ہے۔“

رمیش چندر کو بہت جلدی زکام ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنے بریف کیس میں ایک چھوٹی

بوتل برانڈی کی رکھتا تھا۔ اس وقت وہی نکال کر اُس نے تقریباً ایک پیگ حلق میں ڈال لیا۔ گرمی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ گرمی کیا ہے؟ گرمی برانڈی کا ایک پیگ ہے جو اس وقت اُس کے خون کو گرما رہا تھا۔

رمیش چندر ایک سائنس کانفرنس میں شرکت کرنے دہلی آیا تھا جس میں اسے ''سردی گرمی'' پر ایک پیپر پڑھنا تھا۔ فزکس کی رو سے سردی اور گرمی کا فرق اسے معلوم تھا اور وہی اس کے پیپر کا موضوع تھا۔ اصل سچائی سائنس ہے۔ کوئی اوور کوٹ پہنے یا سوتی کھیس لپیٹے، وہ فزکس کے قانون کو نہیں بدل سکتے۔ ٹمپریچر وہی رہتا ہے۔ چاہے برانڈی آپ کے اندر گرمی کا احساس پیدا کر رہی ہو یا بند کھڑکی باہر کی ٹھنڈ ہوا کو روکے ہوئے ہو! ٹیکسی ہوٹل کے برآمدے میں رُک گئی۔

ہوٹل کے پورٹر نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ وہ اونی یونی فام پہنے ہوئے تھا۔ ہوٹل کے بیل بوائے نے اُس کا سوٹ کیس اُتارا۔ وہ سفید سوتی مکھن زین کی یونی فارم پہنے ہوئے تھا۔ اندر شاید اونی سوئٹر پہنا ہوگا۔

ہوٹل کی برساتی میں خاصی سردی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ بند شیشے کے دروازے سے اندر پہنچ گئے تھے۔ اندر ہیٹر روشن تھے۔ ایرکنڈیشنر سے گرم ہوا نکل رہی تھی۔

ریسپشن کلرک قمیص اور پتلون میں ملبوس تھے۔

چمکیلی مسکراہٹ والی ریسپشنسٹ ہلکی سی ریشمی ساری پہنے ہوئے تھی اور رمیش باوجود اپنے اونی سوٹ اور سوئٹر کے، باوجود اپنے اونی بنیان کے، باوجود اپنے اندر ایک پیگ برانڈی کی گرماہٹ کے، سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس کو چھینک پر چھینک آرہی تھی۔

''سوری۔'' اس نے لیڈی ریسپشنسٹ کی طرف کھسیانی مسکراہٹ سے دیکھ کر کہا، جب اُسے تیسری چھینک آئی۔

''بڑی سردی ہے نا؟'' ریسپشنسٹ نے ایرہوسٹیس والی مسکراہٹ چمکاتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ ایسی سردی میں زکام ہونا معمولی بات ہے۔ رمیش نے رجسٹر میں دستخط کرتے ہوئے سوچا ''لگتا ہے مجھے بخار چڑھنے والا ہے۔''

کمرے میں پہنچتے پہنچتے اسے واقعی بخار چڑھ آیا۔

یہ عجیب بات ہے (اس نے سوچا) کہ جیسے جیسے سردی بڑھتی جاتی ہے بخار بڑھتا جاتا ہے۔ اسے اس وقت کپکپاہٹ چڑھ رہی تھی مگر تھرمامیٹر میں اس کا ٹمپریچر ۱۰۲ ڈگری تھا۔ اس نے دو

گولیاں اسپرین کی اور ایک گولی کونین کھائی اور تین کمبلوں کے اندر گھس گیا۔

یہ سردی اور بخار کی شروعات کب ہوئی تھی؟

یہ سردی تو اسے بمبئی ہی میں لگنا شروع ہوگئی تھی جہاں دہلی کے مقابلہ میں گرمی تھی۔

جب اسے اپنی بیوی کی سرد مہری کا خیال آتا تھا تو اسے پھر کپکپی چڑھ آتی تھی۔

''سوشیلا، جان من!''

''کیا ہے'' سوشیلا کی آواز میں برف کی سلیں دبی ہوئی تھیں۔''

''مجھے آج دہلی جانا ہے۔''

''جاؤ میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی۔''

''مگر تمھارے اندر سے معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں میرا جانا پسند نہیں۔''

''تمھیں میری پسند یا ناپسند کی کیا پروا ہے۔''

''پروا کیوں نہیں؟''

''بس نہیں ہے۔''

''تو تم چاہتی ہو میں اس اہم کانفرنس میں شریک نہ ہوں؟ 'گرمی سردی' پر پیپر نہ پڑھوں؟ اتنی مشکل سے تو یہ پیپر تیار کیا ہے!''

''ضرور شریک ہو۔ میں کون ہوتی ہوں تمھیں منع کرنے والی۔''

''بس دو دن کی تو بات ہے، جان من!''

''دو دن نہیں تم تین چار دن دہلی میں رہو مگر مجھے یہ ''جان من'' کی ریاکاری نہیں پسند۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ بس مجھے معلوم ہوگیا کہ میں تمھاری ''جان من'' نہیں ہوں۔''

''کیسے معلوم ہوا؟''

''بس معلوم ہوگیا۔ ایک بات اور ہے۔ تم 'سردی گرمی' پر پیپر پڑھ سکتے ہو۔ مگر تمھیں کیا معلوم کہ سردی کیا ہوتی ہے گرمی کیا ہوتی ہے؟''

''تم تو لڑنے پر تلی ہوئی ہو۔ نہ جانے کیوں؟''

''تم فزکس کے بڑے پروفیسر ٹھہرے۔ ٹمپریچر کی سردی گرمی کے مسئلوں کو حل کرو۔ تمھیں جذبات کی سردی گرمی سے کیا مطلب؟''

اس کے پیچھے کچھ معاملہ تھا ضرور۔ مگر وہ کیا تھا؟ یہ وہ اب تک نہ سوچ سکا تھا۔

اسپرین اور کونین کے اثر سے اور کمبلوں کی گرمی سے اُس کو نیند کے ساتھ پسینہ بھی آ رہا تھا۔ صبح تک اس کا بخار اُتر گیا۔ ٹب میں گرم پانی بھر کر نہایا۔ نکلا تو سردی سے کانپ رہا تھا۔ تولیے سے بدن رگڑ کر پونچھا تو بدن میں گرمی آ گئی۔ دیوار پر لگے ہوئے تھرمامیٹر میں ٹمپریچر وہی تھا۔ مگر ٹب میں گرمی تھی۔ کیونکہ پانی گرم تھا۔ باہر نکل کر سردی لگی۔ بدن کو ٹھنڈے تولیے سے رگڑنے پر گرمی کہاں سے آ گئی۔ مگر فزکس کا اصول تھا کہ فرکشن سے گرمی پیدا ہوتی ہے تو گرمی تولیے میں نہیں ہے اس کی رگڑ میں ہے!

کپڑے بدل کر اس نے ناشتہ منگایا۔ گرم گرم کافی پی۔ توس اور انڈا کھایا جسم میں گرمی آئی تو وہ ٹیکسی لے کر وگیان بھون پہنچا جہاں اسے کانفرنس میں پیپر پڑھنا تھا۔

ٹیکسی سے نکلتے ہی اسے اپنی بیوی کی کل کی سرد مہری یاد آئی اور ساتھ ہی ایک زوردار چھینک بھی آئی۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے کیا جوڑ تھا؟ یہ مسئلہ اُس کی فزکس کی پکڑ کے باہر تھا۔

اُس کا پیپر پروگرام کے مطابق ساتواں تھا۔

پہلے چھ سائنٹسٹ اپنے پیپر پڑھتے رہے اور وہ بیٹھا سوچتا رہا کہ کل سوشیلا پر کون سا بھوت سوار تھا اور وہ اس کے دہلی آنے پر اتنی چراغ پا کیوں تھی؟

دہلی!

دہلی آنے پر......؟

سردی گرمی......؟

اس کو دس سال پہلے کی سردیاں یاد آ گئیں جب چھبیس جنوری کے موقع پر غضب کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ وہ اُس وقت ایم۔ ایس۔ سی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ لوگ چھبیس جنوری کے جشن میں شرکت کرنے بمبئی سے گئے ہوئے تھے۔ سب لڑکے اور لڑکیاں تالکٹورہ گارڈن میں تمبو میں رہتے تھے۔ ری پبلک پریڈ جو رمیش نے اس دن دیکھی تھی اسے ہمیشہ یاد رہے گی۔ بھیڑ بھاڑ — آرمی، نیوی اور ایرفورس کے جوانوں کی پریڈ اور طلبہ اور طالبات کا مارچ پاسٹ، لڑکے سفید قمیص اور پتلون پہنے ہوئے مارچ کر رہے تھے۔ لڑکیاں سفید شلوار، سفید قمیص اور ہرے جمپر پہنے ہوئے تھیں۔ رمیش اس دن اوورکوٹ پہنے پریڈ دیکھنے گیا تھا۔ اس دن بھی سوچ رہا تھا کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو سردی کیوں نہیں لگتی؟ شاید قومی جوش وخروش اور قدم سے قدم ملا کر چلنے سے ان کے بدن میں گرمی آ گئی

تھی۔

اس ساری پریڈ میں ایک بیضوی چہرہ اُس نے دیکھا تھا جس کی چھاپ اس کے دل و دماغ پر ایسی پڑی تھی کہ اب بھی اس کی یاد آتی تھی تو سنسنی سی سارے بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ شاید اسی کو Love at first sight (پہلی نظر میں محبت) کہتے ہیں۔

اس رات کوتال کٹورہ گارڈن میں کیمپ فائر تھی۔ مختلف جگہ طلبہ اپنے اپنے ''فوک ڈانس'' پیش کر رہے تھے۔ پنجابیوں نے بھانگڑا ڈانس کیا جس میں سوشیلا سب سے آگے تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جس نے پریڈ میں رمیش کو اتنا متاثر کیا تھا۔ بوٹا سا قد تھا، مگر صورت اتنی اچھی تھی کہ سارے ڈانس میں وہ ہی وہ اُبھر آتی تھی۔ ڈانس کے بعد میں وہ بھی رمیش ہی کی لائن میں آ کر بیٹھ گئی۔

''آپ کو سردی نہیں لگتی؟'' رمیش نے اس سے پوچھا۔

''نہیں تو۔ چندی گڑھ میں تو یہاں سے بھی زیادہ سردی پڑتی ہے اور ہم تو شملے بھی اسکٹنگ کرنے جاتے ہیں۔'' اُس نے جواب میں کہا۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''بمبئی سے۔'' رمیش چندر نے کہا۔

''جب ہی آپ اتنے کوٹ اور مفلر لپیٹے ہیں۔ لیجیے یہ شال بھی اوڑھ لیجیے۔'' اور سوشیلا نے اپنی پشمینے کی شال اُس کے کندھوں پر ڈال دی۔ پشمینہ نرم تھا گرم تھا اور اس میں سے سوشیلا کے بدن کی خوشبو آ رہی تھی۔

رمیش کو سوشیلا سے باتیں کرنا بہت اچھا لگا۔

تھوڑی دیر میں وہ ایک دوسرے سے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ دوستی کی گرمی بھی کیا چیز ہوتی ہے؟ رمیش نے سوچا۔ ان کی باتیں چلتی رہیں۔

ناچ گانے ختم ہو گئے۔ سب لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے تمبو میں چلے گئے مگر رمیش اور سوشیلا کی باتیں چلتی رہیں۔

کیمپ فائر کی آگ دھیمی پڑ گئی پھر بجھ گئی۔

رمیش نے ٹھنڈک سے بچانے کے لیے شال اپنے کندھوں سے اتار کر سوشیلا کو اُڑھا دی۔

پھر سوشیلا نے رمیش کو بھی اپنی شال میں لے لیا۔ رمیش کی ہستی ایک عجیب خواشگوار گرمی سے معمور ہو گئی۔

رمیش کو وگیان بھون میں یاد آیا کہ وہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ پرسوں چھبیس جنوری ہے اور

وہ اس کو بھول گیا تھا جب ہی تو سوشیلا اتنی چڑی ہوئی تھی۔ اُس کو سوشیلا کو ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا تا کہ اس دس برس پہلے کی چھبیس جنوری کی یاد کو مل کر منایا جا سکے۔

اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا پیپر پڑھا اور اس پر مباحثہ جو ہوا اس کے جواب غیر حاضر دماغی سے دیے۔

پھر وہ ٹیکسی لے کر ہوٹل بھاگا۔

وہاں کمرے میں پہنچتے ہی ممبئی ٹیلی فون ملایا۔

''ہیلو۔ سوشیلا!''

''کہو کیسے ہو؟'' بڑی ہی ٹھنڈی آواز میں اُس نے پوچھا۔

''کل صبح یہاں آ کر بخار ہو گیا تھا۔''

''ہائے رام!'' اس کی آواز میں دفعتاً فکر کی گرمی پیدا ہو گئی تھی۔

''اسپرین کھائی۔ اب اتر گیا ہے مگر پھر چڑھ جائے گا۔''

''پھر کیا کریں؟''

''تم آج شام کے پلین سے یہاں آ جاؤ میری جان۔''

''کیوں کیا ہے؟''

''پرسوں چھبیس جنوری ہے۔''

''یاد ہے تمھیں؟''

''ہاں۔ اپنی پُرانی پشمینے کی شال لیتی آنا یہاں سردی بہت ہے۔''

''اس شال سے کیا ہوگا؟''

''گرمی آ جائے گی۔''

☆☆☆

شکر اللہ کا

نہیں صاحب! کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ رشتہ داروں، دوستوں، دشمنوں، تعلقات والوں، افسروں، مالکوں، کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ نہ سرکار سے کوئی گلہ ہے نہ اللہ میاں سے کوئی شکوہ ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ سو میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں اور صبح شام خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کھانے کو پلاؤ، قورما نہیں تو چٹنی روٹی تو بھیج دیتا ہے۔ سر کے اوپر آسمان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں تو کیا ہوا۔ سونے کے لیے فٹ پاتھ کے پتھر تو ہیں۔ میری کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ کر رحم نہ کھایئے۔ صاحب خدا کا شکر ہے، دوسری ٹانگ تو صحیح ہے۔

سچ پوچھیے تو صبر ہی ہم غریبوں کی سب سے بڑی دولت ہے۔ صبر ہماری عورتوں کا زیور ہے اور ہمارے بچوں کا کھلونا۔ آپ محلوں، بنگلوں، میں رہنے والے صبر کے فائدے کیا جانیں۔ سوکھی روٹی کو صبر کی چٹنی سے لگا کر کھاؤ تو مرغ مسلم کا مزہ آتا ہے۔ پھر سڑک کے کنارے صبر کی مخملی گدی بچھا کر اوپر سے ریشمی چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔ ایسی نیند آتی ہے کہ کسی راجہ نواب کو نہ آتی ہوگی اور جب مشین میں آکر میری بائیں ٹانگ کٹ گئی اور مل کے مالکوں نے ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا اور میں ایک کباڑی کے یہاں سے دو روپے میں یہ ٹوٹی ہوئی بیساکھیاں خرید کر اچھلتا کودتا ہوا ایک ڈاکٹر کے یہاں پہنچا جو کہ نقلی ٹانگ بنانے میں مشہور تھا اور اس نے ربڑ کی ٹانگ لگانے کے لیے ہزار روپیہ اور لکڑی کی ٹانگ کے لیے پانچ سو مانگے اور میرے جیب میں صرف سات روپے نکلے تو آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا؟ نہ ربڑ کی ٹانگ لگوائی نہ لکڑی کی۔ صبر کی ٹانگ لگوائی۔ اس دن سے آج تک ان ہی ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں اور صبر کی ٹانگ سے گزارہ کر رہا ہوں۔ صبر ہو تو بیساکھیوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صاحب۔ اللہ نے ہاتھ دیے ہیں کولھے دیے ہیں۔ وہ سامنے دیکھیے نا۔ لُولے رولدو کی تو دونوں ٹانگیں بے کار ہیں۔ پھر بھی ہاتھوں اور کولھوں کے سہارے مزے سے گھسٹ گھسٹ کر چل لیتا ہے ــــ اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ٹانگوں

کے ساتھ بانہوں پر فالج نہ گرادیا۔

خدا کی مہربانی تھی کہ بچپن ہی میں ماں باپ سے صبر کا سبق ملا۔ ہم ذات کے جولا ہے ہیں صاحب— یوں تو ہم مسلمانوں میں ذات پات نہیں ہوتی۔ خدا کے بندے سب برابر ہیں۔ مگر امیری غریبی، اُونچ نیچ، شرافت، رذالت بھی تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لیے میرے باپ کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنا درجہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے اور وہ عمل بھی ہمیشہ اسی اصول پر کرتا تھا۔ بوڑھا ہونے پر بھی وہ شریفوں کے لونڈوں تک کو جھک کر سلام کرتا۔ ہر پٹھان کو ''خان صاحب'' ہر سید کو ''میر صاحب'' ہر بنیے کو ''لالہ جی'' ہر برہمن کو ''پنڈت جی'' اور ہر چھوٹے سے چھوٹے افسر کو، یہاں تک کہ پٹواری، نمبردار تک کو— ''سرکار'' کہتا تھا مگر وہ سب اُسے ''بندو جولاہا'' کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ان امیر شریفوں کے بچوں کو اُجلے کپڑے پہنے، کتابیں ہاتھ میں لیے اسکول جاتے ہوئے دیکھ کر ہم بھائیوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ ہمارے بھی ایسے کپڑے ہوں اور پڑھ لکھ کر ہم بھی افسر بنیں۔ مگر میرا باپ ہمیں سمجھاتا— ''بیٹا! اپنی اوقات کبھی نہ بھولنی چاہیے۔ خدا نے جو درجہ دیا ہے، اسی پر صبر شکر سے صبر کرنا چاہیے۔ نہیں تو کوا چلا ہنس کی چال— والی کہاوت ہو جائے گی— '' میرے باپ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں— اور جیسا موقعہ ہوتا فوراً کوئی نہ کوئی کہاوت سنا دیتا۔

ایک برس کی بات ہے جب ہم شہر کے آڑھتی بنیے کے لیے کمبل بُنا کرتے تھے۔ وہ ہمیں اُون اور کمبل ڈیڑھ روپیہ کتائی اور بُنائی دیتا اور پھر اسی کمبل کو دس روپے، گیارہ روپے میں بازار میں بیچتا۔ ہاں، تو ایک برس عید کے موقع پر بابا کو آڑھتی کے یہاں سے رقم نہ ملی۔ بات یہ تھی کہ اس سال ولایت اور جاپان سے مشین کے بُنے ہوئے جھاگ جیسے ملائم کمبل سستے داموں میں آگئے تھے اور ہمارے مظفر نگر کے کمبلوں کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔ سینکڑوں کمبل بن بکے پڑے ہوئے تھے اور خود ہمارے والے آڑھتی نے ولایتی کمبلوں کی ایجنسی لے لی تھی۔ ہاں، تو جب بابا کو پچاس ساٹھ کمبلوں کی بُنائی نہ ملی تو وہ بے چارہ ہمارے لیے کپڑے کہاں سے بنواتا؟ وہی پچھلے سال کی عید کے کپڑے ماں نے گھر میں صابُن سے دھو کر دے دیے۔ جب ہم نے اپنے پڑوس میں وکیل صاحب کے بچوں کو ریشمی اچکنوں اور نئی تُرکی ٹوپیاں پہنے دیکھا تو ہمیں بڑا رونا آیا۔ پر بابا نے کہا:

''ارے روتے کیوں ہو؟— وہ امیر اپنے مال میں مست ہیں تو ہم غریب اپنی کھال میں مست۔'' یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی— وہ دن اور آج کا دن جب کبھی میں امیر رئیس کو بڑھیا کپڑے پہنے اکڑفوں کرتے دیکھتا ہوں تو فوراً اپنی کھال میں مست ہو جاتا ہوں۔

ہاں صاحب! — تو جب میں بڑا ہوا تو کئی برس تو اپنے باپ کے ساتھ کمل بُننے کا کام کرتا رہا۔ مگر جب یہ دھندا مندا پڑ گیا، تو میرے باپ نے نمبر دار سے سفارش کروا کر مجھے تحصیلدار صاحب کے یہاں نوکر رکھ دیا۔ تحصیلدار صاحب شہر کے باہر تحصیل کے پاس ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ اللہ بخشے خان قدرت اللہ خاں ان کا نام تھا۔ بڑے رعب داب والے تھے۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور آواز ایسی کہ کسی کو زور سے ڈانٹ دیں تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جائے۔ شہر بھر ان سے کانپتا تھا۔ ان کے یہاں بس میں ایک ہی نوکر تھا۔ تحصیل کے دو چپراسی بھی کچہری کے وقت کے بعد اوپر کا کام کرتے تھے۔

مگر گھر کا سب کام کاج مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانے کو ایک بڑھیا دو وقت آجاتی تھی۔ مگر جھاڑو دینا، روز کمرے کی میز کرسیوں کو جھاڑنا پونچھنا، تحصیلدار صاحب کو ہر پندرہ بیس منٹ بعد حقہ بھر کر دینا، برتن دھونا، بستر بچھانا، بازار سے سودا سلف لانا — یہ سب میرا کام تھا۔ اور وہاں ان سب کاموں کے علاوہ ایک کام اور بھی تھا۔ وہ تھا تحصیلدار صاحب کی بیٹی بانو کی کتابیں اٹھا کر اسے اسکول چھوڑ کر آنا۔ لڑکیوں کا اسکول کوئی دور نہ تھا — بنگلے سے مشکل سے آدھ میل ہوگا — اور کھیتوں سے ہو کر جاؤ تو اس سے بھی کم۔ مگر تحصیلدار صاحب کی شان کے خلاف تھا کہ ان کی بیٹی خود کتابیں اٹھا کر لے جائے۔ اس لیے بانو کو اسکول پہنچانا، اور وہاں سے واپس لانا، میرا فرض تھا۔ اور سچ پوچھیے تو سارے کاموں سے یہی کام مجھے سب سے اچھا لگتا تھا۔

ان دنوں میں کوئی ۱۷، ۱۸ برس کا ہوں گا۔ صاحب! خدا کے فضل سے ناک نقشہ بھی برا نہیں تھا۔ صحت بھی ماشاءاللہ اچھی تھی۔

پھر تحصیلدار صاحب نے دو چار پرانی قمیصیں اور شلواریں دے دی تھیں جنھیں میری ماں نے گونتھ گانتھ کر ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ پہن کر اور سر کے بالوں میں کڑوا تیل ڈال، میں بھی اچھا خاصا جنٹل مین لگتا تھا۔ بانو اسکول تو بُرقع اوڑھ کر جاتی تھی مگر مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ تحصیل دار صاحب پردے کے معاملے میں ویسے بڑے کٹر تھے مگر ان کا کہنا تھا کہ نوکروں سے کیا پردہ؟ اور یہ ایسے ہی کہتے جیسے کوئی کہے کہ گھر کے کتے سے کیا پردہ؟ — یا گھوڑے سے کیا پردہ؟"

ہاں تو صاحب، بانو مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ کوئی ۱۵ یا ۱۶ برس کی ہوگی۔ ساتویں کا امتحان دینے والی تھی۔ اس کا حال کیا بتاؤں۔ آپ سے ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے۔ پر یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے بانو کو بنایا تھا۔

رنگت ایسی جیسے میدہ اور شہد! اور کالے ریشمی برقعہ میں سے منہ نکال کر جب وہ میری طرف دیکھ کر مُسکراتی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا تھا۔

گھونگر والے بال، بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں۔ میں تو آدمی تھا سرکار، وہ بھی جوانی کا عالم! فرشتے بھی اسے دیکھ لیتے تو ایک بار اپنی پارسائی کو بھول جاتے۔ پھر بھی وہ مالک کی بیٹی تھی۔ میں نوکر تھا— کبھی ایسا ویسا خیال آتا بھی تو سوچتا۔

''ابے او بندو جولا ہے کے بیٹے! کیوں پاگل ہوا ہے۔ اپنی اوقات مت بھول۔ اتنے جُوتے پڑیں گے کہ سر گنجا ہو جائے گا۔'' اور سوچتے ہی میرا نشہ ایسا غائب ہوتا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پر سرکار! جھوٹ کیوں بولوں۔ اگلے دن جب اس کی کتابیں اٹھائے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا بانو کے ساتھ اسکول جاتا اور ادھر ادھر کسی کو نہ پا کر وہ برقعہ سر سے اتار دیتی اور اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں پھیل جاتی تو شیطان مجھے بہکانے لگتا اور کہتا:

''ابے تو نوکر نہیں ہے۔ وہ مالک کی بیٹی نہیں۔ تو بھی جوان ہے، وہ بھی جوان ہے۔''

ایسے تو بانو تحصیلدار کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑی چہیتی اور اس کے لیے دنیا کا ہر عیش و آرام موجود تھا۔ پر یہ تحصیلدار صاحب کی دوسری بیوی خانم جو تھی، یہ تو بڑی ظالم تھی۔ سوتیلی بیٹی کو ایک گھڑی خوش دیکھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ پر تھی بڑی چالاک۔ جب تک تحصیلدار صاحب گھر میں رہتے، ان کو دکھانے کے لیے بانو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ پر جیسے ہی وہ کچہری جانے کے لیے نکلے اور اس نے چولا بدلا— بات بات پر غریب بانو پر ڈانٹ پڑتی۔ پٹتی بھی بے چاری۔ ایک دن سویرے خانم نے اپنے گود کے بچے کے گُو اور موت میں سنے ہوئے نحالچے پوتڑے دھونے کے لیے بانو کو کہا۔ وہ بیچاری اسکول کا کام کر رہی تھی۔ اس میں ذرا دیر ہو گئی۔ خانم گودام میں سے کھانا پکانے والی کو آٹا تول کر دے کر جب باہر نکلی تو دیکھا نحالچے ویسے ہی پڑے ہیں۔ بس آگ ہی تو لگ گئی۔ بانو کے ہاتھ سے اسکول کی کاپی چھین کر پُرزے پُرزے کر دی اور لڑکی کو چوٹی پکڑ گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی اور وہیں چھپر کھٹ کا پایہ اٹھا کر اس کے ہاتھوں کو نیچے دبا کر خود چھپر کھٹ پر چڑھ بیٹھی اور کہتی رہی تو جب تک معافی نہیں مانگے گی، ناک نہیں رگڑے گی، میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ پر بانو بھی ہٹ کی بڑی پکی تھی۔ دانت بھینچے رہی! نہ روئی نہ سِسکی، نہ معافی مانگی۔

جب خانم کا بچہ رویا تو وہ خود ہی اٹھی۔ میں برآمدے کی چک میں سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ جا کر خانم کو جان سے مار دوں۔ جب اس کمبخت کو کمرے کے باہر جاتے دیکھا

تو جان میں جان آئی۔ پر اب بانو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ خود پائے اٹھا سکے۔ یہ دیکھ کر میں خانم سے ڈرتا ڈرتا کمرے میں گیا اور جلدی سے پلنگ کا پایہ اٹھایا۔ اس وقت بانو کی آنکھوں کا حال کیا بیان کروں سرکار! ایسی لگتی تھی جیسے کوئی گھائل ہرنی، جسے کسی نے قصائی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچالیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب ان آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ پھر تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے کندھے پر سر رکھ سسکیاں بھر رہی ہے۔ آپ ہی بتایئے ایسے موقع پر کوئی کرے بھی تو کیا کرے؟ — میرا تو سانس اوپر کا اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا — ''چھوٹی بی بی! کیا کر رہی ہو؟ — خانم دیکھ لے گی تو میری کھال ادھیڑ دے گی'' — میں نے آہستہ سے کہا — اور پھر جیسے ہی دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی نے ساڑھے نو کا گھنٹہ بجایا، میں نے کہا — ''اسکول جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

اور اسکول کا نام سن کر بانو کی سسکیاں تھم گئیں اور میرے گیلے مونڈھے سے سر اٹھا کر اس نے کہا:

''چل ممدو! میری کتابیں اٹھا۔ آج تو میرے ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی طاقت نہیں رہی۔''

اس دن بانو اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو میں نے دیکھا کہ برقعے کے اندر ایک پوٹلی سی اس نے چھپا کر بغل میں داب رکھی ہے۔ اسکول کے راستے میں بانو نے ہمیشہ کی طرح نقاب الٹ دی۔ راستہ پگڈنڈی، پگڈنڈی کھیتوں میں سے جاتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولی:

''ممدو! یوں تو میں مر جاؤں گی۔''

میں نے کہا — ''ہاں، چھوٹی بی بی۔ یہ خانم بڑی ظالم ہے۔''

''پھر؟ — '' یہ کہہ کر اس نے میری طرف یوں نظر بھر کر دیکھا کہ میرا منہ گھبراہٹ سے لال ہو گیا۔

''تحصیلدار صاحب سے کیوں نہیں شکایت کرتیں؟ وہ تمھارے باپ ہیں آخر۔''

''ابا سے شکایت کی تو یہ ڈائن مجھے جان ہی سے مار ڈالے گی اور پھر ابا میری بات کیوں ماننے لگے؟ تم نے دیکھا نہیں ان کے سامنے چکنی چپڑی باتیں کرتی ہے۔''

''پھر؟ — '' اس بار میں نے یہ سوال کیا۔

وہ بولی — میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر — ''چل، ممدو، کہیں بھاگ چلیں۔ میرے پاس تھوڑا سا زیور، گہنا ہے۔ تیس چالیس روپے بھی میں نے بچا کر رکھ چھوڑے ہیں۔''

امیر چھوکریاں اپنے نوکروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔ ایسے قصے میں نے سنے ضرور تھے مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں قصہ کہانیوں میں ہوا کرتی ہیں۔ اب بانو کی زبان سے سن کر میرا یہ حال

ہوا سرکار کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا۔ جواب ہی نہ بن پڑا کوئی۔ ایسا لگا جیسے دل کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔

ایک دل کہتا تھا— ''ابے ممدو! تیری قسمت جاگ گئی ہے۔ ایسا موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ذرا لونڈیا کا جوبن تو دیکھ اور جولاہوں کی کالی کلوٹی لڑکیوں کا مقابلہ تو کر، جن سے تیری ماں قسمت پھوڑنے والی ہے اور پھر وہ خود کہہ رہی ہے کہ زیور گہنے بھی ہیں۔ ابے عیش کرے گا عیش!'' پر سرکار! دوسرے دل نے کہا— ''اپنی اوقات مت بھول! تو ممدو ہے ممدو۔ بندو جولاہے کا لونڈا۔ تحصیلدار صاحب کا نوکر۔ ایسی ویسی کوئی بات کرے گا تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پہ بال نہ رہے گا۔''

وہ تو خیر ہوئی سرکار کہ اتنے میں سامنے سے اسکول کا کوئی ماسٹر آتا ہوا نظر آ گیا اور بانو نے جھٹ سے نقاب گرا دی۔ پھر آہستہ سے مجھ سے بولی: ''چھٹی چار بجے ہوگی۔ پر تو تانگہ تین بجے ہی لے کر آ جائیو۔ ساڑھے تین بجے کلکتہ میل جاتی ہے۔ بس آج میں گھر واپس نہ جاؤں گی۔''

ماسٹر پاس سے گذر گیا تو میں نے چپکے سے کہا: ''بی بی! ایسی باتیں مت کرو۔ تحصیلدار صاحب کو پتہ لگے گا تو میری کھال کھینچ دیں گے۔''

وہ بولی: ''ارے، تو مرد ہو کر ڈرتا ہے؟'' اور پھر برقعے میں سے سسکی کی آواز آئی— ''ممدو! اگر تو تین بجے تانگہ لے کر نہیں آیا تو میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔''

بس یہ کہا اور وہ تو جھپ سے اسکول کے اندر چلی گئی اور میں وہیں دروازے کے سامنے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے مجھ پر بجلی گری ہوئی ہو۔ آپ ہی بتائیے سرکار! کرتا تو کیا کرتا؟ ایک طرف تو تحصیلدار کے ہنٹر کا ڈر۔ دوسری طرف بانو کی جان کا سوال۔ نہ جانے کتنی دیر تو میں وہیں اسکول کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا تو سیدھی پگڈنڈی سے بھٹک کر کتنی ہی دیر تک کھیتوں میں بھٹکتا رہا۔ جب میں واپس پہنچا تو بارہ بج رہے تھے اور خانم غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔ ابھی میں نے دروازے میں قدم رکھنا شروع ہی کیا تھا کہ گالیوں کوسنوں کی بوچھار شروع ہو گئی— ''کہاں تھا تو اب تک حرام زادے؟ گھر کا سارا کام یوں ہی پڑا ہے۔ اور تو یوں ہی واہی تباہی پھر رہا ہے۔ کیوں رے— جواب کیوں نہیں دیتا۔ آخر تو تھا کہاں؟''

اور جب میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تو آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی وہ میری طرف بڑھی۔

''ارے بولتا کیوں نہیں؟ گونگا ہو گیا ہے کیا؟'' یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا— پر

جیسے ہی اس نے میرا ہاتھ چھوا، اس کی چیخ نکل گئی— ارے تجھے تو تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ ملیریا، کہیں پلیگ تو نہیں ہے تجھے؟ گھر میں آج ہی ایک مرا ہوا چوہا نکلا ہے۔'' اور یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسا دیکھا جیسے میں ہی وہ مرا ہوا چوہا تھا اور فوراً جا کر کاربولک صابن سے ہاتھ دھونے لگی کہ کہیں میری بیماری کی چھوت نہ لگ گئی ہو۔ تو سرکار! خدا جو کچھ بھی کرتا ہے بندے کی بھلائی کے لیے ہی کرتا ہے۔ مجھے پلیگ تو نہیں ہوا۔ پر ملیریا بخار جو اس دن چڑھا تو اس نے ایک مہینے تک نہ چھوڑا۔ میں ادھ موا تو ہوگیا مگر تحصیلدار صاحب کے ہنٹروں سے میری چمڑی بچ گئی۔ خانم نے اسی وقت ہی مجھے چپراسی کے ساتھ گھر بھجوا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ بس، اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایسے نوکر نہیں چاہئیں جو روز بیمار ہوتے ہوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے سرسام کا دورہ پڑ گیا اور وہ سردی چڑھی کہ ماں نے گھر بھر کی رضائیاں اور گدڑے میرے اوپر ڈال دیے پھر بھی کپکپی نہ گئی۔ پر اس بخار کی حالت میں بھی سرکار، بانو کا خیال میرے دل سے نہ نکلا اور بے ہوشی میں بھی بار بار یہی چلاّتا رہا— ''چھوٹی بی بی! تم گھبرانا مت— میں پورے تین بجے تانگہ لے آؤں گا۔'' یہاں تک کہ میرے باپ نے تنگ آ کر مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا— ''ابے، کیا تانگہ تانگہ بڑبڑا رہا ہے۔ کہیں گرمی دماغ کو تو نہیں چڑھ گئی؟'' مہینہ بھر کے بعد جب چلنے پھرنے کے لائق ہوا تو سنا کہ تحصیلدار قدرت اللہ خاں کی بدلی سہارنپور میں ہوگئی ہے۔ ان کی جگہ کوئی اور تحصیلدار آیا ہے۔ پھر بھی یہ سننے میں آیا کہ خان صاحب کی ترقی ہوگئی ہے۔ اب وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر تو بڑا حاکم ہوتا ہے۔ سرکار سے تنخواہ بھی کافی ملتی ہے۔ جبھی تو خان صاحب نے سہارنپور جاتے ہی موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تمھیں کیسے پتا چلا کہ انھوں نے موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا؟— تو یہ بات ہے کہ سرکار، اچھا ہونے کے دو چار مہینے کے بعد میں لالہ گردھاری مل آڑھتی کی غلّہ کی دوکان پر اناج کی بوریاں ڈھونے پر نوکر ہوگیا۔ ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ سہارنپور سے کوئی زمیندار ٹھاکر نواب علی ملنے آئے تو کہنے لگے— ''لالہ! سنا تم نے، تمھارے یہاں جو تحصیلدار قدرت اللہ خان تھے نا......''

یہ نام سن کر میرے تو کان کھڑے ہوگئے اور بوریوں کے پیچھے سے دھیان دے کر سننے لگا— لالہ بولے: ''ہاں، ہاں۔ وہ تو اب تمھارے یہاں ڈپٹی کلکٹر ہوگئے ہیں۔ سنا ہے اب تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ موٹر بھی رکھ لی ہے۔''

ٹھاکر نواب علی بولے— ''ارے لالہ، یہ موٹر ہی کی برکت ہے۔ موٹر کی اور نئی تعلیم کی۔''

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لالہ بھی بولے— ''ٹھاکر صاحب! کیا کہہ رہے ہیں؟''

ٹھاکر صاحب نے کہا— ''لالہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خان صاحب قدرت اللہ خان کی لونڈیا ان کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی'' — میں نے اپنے دل کو لاکھ سمجھایا کہ اب تجھے خوش ہونا چاہیے کہ خان صاحب کے ہنٹر اس سالے ڈرائیور کی پیٹھ پر پڑیں گے۔ تو تو صاف بچ گیا۔ مگر جھوٹ کیوں بولوں سرکار، سچی بات یہ ہے کہ دن بھر مجھ سے ٹھیک سے کام نہ ہو سکا اور اس رات جب ماں نے روز کی طرح پھر بندی جولاہی سے میرے بیاہ کی بات چھیڑی، تو میں نے بھی کہہ دیا— ''اچھا ماں، جیسی تیری مرضی۔'' صبر عجیب چیز ہے سرکار! انسان اپنی قسمت پر صبر شکر کرنا چاہے تو پھر یہی فٹ پاتھ کے پتھر بھی مخمل کے گدّے بن جاتے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں بندی شیدی جولاہی بھی بانو جیسی حسین دکھائی دیتی ہے۔ سال بھی نہیں ہوا تھا، شیدی نے ایک بچہ جن دیا۔ اگلے برس ایک بچی۔ پھر تو سرکار، نمبر لگ گیا۔ چھ برس میں پورے پانچ بچے، تین لڑکیاں دو لونڈے۔ پر خدا کی مرضی میں کس کو چارہ ہے؟ اولاد بھی اسی کے دین ہے۔ جب چاہے واپس لے لے۔ ایک بچہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ ایک لونڈیا دو برس کی ہو کر نمونیا سے ہلاک ہو گئی۔ اب ایک لونڈا اور دو لونڈیاں رہ گئیں— پر اپنے سے اتنی اولاد کو پالنا بھی مشکل تھا۔ گھر کا سارا بوجھ اب مجھ پر ہی تھا۔ بابا کی کمر تو کھاٹ کو لگ گئی تھی اور ماں کو آنکھوں سے سجھائی دینا بہت کم ہو گیا تھا۔ بے چاری دن میں بھی ٹاک ٹوئیاں مارتی تھی۔ میرا بڑا بھائی ایک سال پہلے بمبئی جو گیا تھا، تو پھر لوٹا نہیں تھا۔ نہ کوئی خط ہی بھیجا نہ روپیہ۔

پہلے سنا تھا کسی کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ پھر سنا کسی فلم کمپنی میں چوکیدار ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت ایکٹریسوں کی موٹروں کے دواز ے کھولتا ہے— میرا بھی کئی بار جی چاہا کہ بھائی کے پاس چلا جاؤں۔ ذرا بمبئی کلکتہ کی سیر کروں— مگر گھر والوں کو کس پر چھوڑوں؟ اور پھر ریل کا کرایہ کہاں سے لاؤں؟ اسی سوچ وچار میں کئی برس گذر گئے اور ہم مظفر نگر میں محنت مزدوری پر صبر کرتے رہے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اپنا بھی کلکتہ جانے کا ایک موقعہ نکل آیا۔ ہوا یہ کہ اپنے محلے میں ایک ننھے نان بائی تھا۔ اس کا لونڈا رحمت ایک برس سے دلی میں کام کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ جو واپس آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل جینٹل مین بنا ہوا ہے۔ جاپانی سلک کی قمیض، گلے میں سونے کے بٹن، بال انگریزی فیشن کے بنے ہوئے۔ میرے بچپن کا یار تھا۔ میں نے کہا: ''کیوں بے رحمت!

کہاں سے گڑا خزانہ مل گیا— ؟'' بولا— ''ہم تو پانی سے سونا بناتے ہیں۔'' میں سمجھا سالے کو کیمیا بنانے کا نسخہ ہاتھ آ گیا ہے۔ پر اس نے بتایا کہ اس نے ریل میں سوڈا لیمن بیچنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اسی سے دوڈھائی سو روپیہ مہینہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا: ''تیس روپیہ مہینہ تو میں اپنے نوکر کو دیتا ہوں جو ہر اسٹیشن پر سوڈا لیمن کی آواز لگاتا ہے اور سارے کلکتہ اور بمبئی کی سیر کرتے ہیں وہ الگ۔'' یہ سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا:

''بھیّا رحمت! ایک بار کلکتہ مجھے بھی دکھا دے۔''

سو سرکار! سوڈا لیمن بیچتے بیچتے میں بھی کلکتہ پہنچ گیا۔ میں نے تو پہلے دلی بھی نہیں دیکھا تھا۔ کلکتہ دیکھ کر تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف سڑکیں یہ موٹریں، بس، ٹرامیں، میں نے پہلے کہاں دیکھیں تھیں؟ میں نے سوچا رحمت کے سوڈا لیمن پر لعنت بھیجو اور یہیں رہ پڑو۔ وہ دن اور آج کا دن۔ پندرہ برس ہو گئے۔ پہلے تو کئی مہینے تک رکشا چلاتا رہا۔ دن میں کبھی کبھی دو ڈھائی روپے بھی مل جاتے تھے۔ میں نے سوچا یہ کام تو بڑا اچھا ہے۔ مہینہ میں ساٹھ ستر روپے مل جاتے تھے۔

مزدوروں کے محلّے میں ایک کوٹھری لے لی تھی۔ دس روپیہ اس کا کرایہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی دس پندرہ بیوی کو بھی بھیج دیتا تھا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے سال کے بعد میں نے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ اس پر کیا گزری— جوان آدمی تھا سرکار، اور پھر کلکتہ میں روپیہ دو روپیہ میں سوناگاچی میں نئی مل جاتی ہے۔ تو پھر ہزار میل دور بھینگی بدصورت بیوی کو روپیہ دو روپیہ بھیجنا تو بڑا مشکل ہوتا ہے! اور پھر دارو پینے کی عادت بھی پڑ گئی تھی سرکار۔ آپ کہیں گے کہ یہ آدمی بڑا آوارہ بدمعاش ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ دن بھر گدھے کی طرح رکشا کھینچنے کے بعد شام کو غم غلط کرنے کے لیے تھوڑی سی دارو ضرور چاہیے اور پھر دارو کے بعد جانے کیسے پھر آپ ہی آپ قدم سوناگاچی کی طرف چل پڑتے ہیں۔

ہاں تو سال بھر رکشا چلائی، کوئی سو سوا سو روپے آڑے وقت کے لیے جمع بھی کر لیے— پر یہ پتہ نہ تھا کہ آڑا وقت اتنی جلدی آ پہنچے گا۔ برسات کے دنوں بھیگ کر بخار چڑھا۔ بخار سے نمونیہ ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا:

''رکشا کھینچتے کھینچتے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ یہ کام چھوڑ دو۔''

پورے ڈیڑھ مہینے کھاٹ پر پڑا رہا۔ جب بخار نے پیچھا چھوڑا تو بدن میں اتنی طاقت بھی

نہیں تھی کہ رکشا چلا سکوں۔ جمع جتھا جو کچھ تھا، وہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نمونیا سے مرا نہیں۔ سوچا زندہ تو ہوں۔ لعنت بھیجو رکشا پر۔ چلو اور کوئی کام کرو۔ کلکتہ میں جہاں خدا تمیں لاکھ کو روزی دیتا ہے کیا مجھے ہی نہ دے گا؟ اللہ پر بھروسہ کیے بیٹھا رہا۔

میری برابر والی کوٹھری میں اپنی ہی طرح کئی مزدور رہتے تھے۔ ایک تو ہر نام تھا۔ بلند شہر کا۔ باپ نے ساری جائیداد شراب پی پی کر اڑا دی تھی۔ بیٹے کو پڑھایا لکھایا نہیں۔ سو اب وہ کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک بنارس کا چمار تھا منگو۔ ایک پیلی بھیت کا مسلمان تھا رحمت خان۔ اور مزا یہ کہ تینوں میں گہری دوستی تھی اور تینوں ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ میں نے ایک بار اکیلے میں رحمت خان سے کہا بھی کہ تم ان کافروں کے ساتھ رہتے ہو۔ ایمان دھرم کا بھی کچھ خیال نہیں؟ وہ گالی دے کر بولا:

''ارے ایمان دھرم کی ایسی تیسی۔ ہمارا دھرم تو مزدوری ہے مزدوری۔''

ان تینوں نے مجھ سے کہا— ''چل تجھے اپنے کارخانے میں نوکری دلا دیتے ہیں۔ دو روپے روز ملیں گے۔'' میں نے سوچا چلو اچھا ہے۔ رکشا کھینچ کھینچ کر پھیپھڑے کھوکھلے کرنے سے تو کارخانے کی مزدوری ہی اچھی رہے گی۔ اگلے دن وہ مجھے اپنے ساتھ کارخانے لے گئے جہاں پٹ سَن کی بُنائی ہوتی تھی— اور مزدوروں کے ٹھکیدار کو جسے سب سردار، سردار کہتے تھے، میری طرف سے پانچ روپے رشوت بھی دے دیے۔ پر مجھے نوکری بھی نہ ملی۔ ویونگ ماسٹر بولا: ''آج کل مدّا ہے۔ اس لیے ہم تو پہلے سے بہت مزدوروں کو چھٹی دینے کی سوچ رہے ہیں۔ نیا آدمی کہاں سے رکھ سکتے ہیں؟'' اور میری جانب اشارہ کر کے بولا— ''پھر اسے ہمارے جیسے کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ کتنے ہی دن تو اسے کام سیکھنے میں لگ جائیں گے۔''

میں واپس آ گیا اور پھر رکشا والے مالک کے پاس جانے کی سوچنے لگا۔ پر خدا کا کرنا کیا ہوا، اسی دن کارخانے میں ہڑتال ہو گئی— ہوا یہ کہ مالکوں نے کہا: ''بازار میں مدّی ہونے کی وجہ سے ہمیں یا تو بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینی پڑے گی یا ان کی تنخواہ کم کرنی پڑے گی۔ اس لیے ہم نے دو روپیہ سے گھٹا کر ڈیڑھ روپیہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' مزدوروں نے جب یہ سنا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ ہڑتال کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے رحمت خاں اور منگو دونوں کو ہڑتال کی باتیں کرتے سنا تو بولا:

''تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟ آٹھ آنے کے لالچ میں ڈیڑھ روپے کی آمدنی میں لات مار

رہے ہو؟ ارے بھائی جو ملتا ہے اسی پر صبر کرو — خدا کی مرضی ہوگی تو مزدوری بڑھ جائے گی۔''
مگر ان دونوں پر تو ہڑتال کا بھوت سوار تھا۔ رحمت خان بولا — ''اگر اس وقت ہم نے چپ چاپ پگاڑ کٹوالی، تو یہ مالک کل ہمارے سینے پر سوار ہو جائیں گے سینے پر۔'' اور منگو ایک موٹی سی گالی دے کر بولا — 'اگر بازار میں مندی ہو رہی ہے تو یہ سالا مالک پانچ پانچ موٹروں میں سے دو ایک کیوں نہیں بیچ دیتا؟ سالے نے تین تین تو عورتیں رکھ چھوڑی ہیں جن میں سے ایک ولایتی میم بھی ہے۔''
''ہاں تو جب یونین والوں نے ہڑتال کا اعلان کیا تو ان دونوں نے تو کام پر جانا بند کر دیا۔ مگر ہرنام سویرے اٹھ کر چپ چاپ کام پر چلا گیا۔ بستی میں خبر فوراً پھیل گئی کہ ہرنام کام پر گیا ہے اور بھی پچاس ساٹھ مزدور ایسے تھے جو ہڑتال میں شامل نہیں تھے۔ مگر رحمت اور منگو کو ہرنام کے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ رحمت تو کہنے لگا: ''نہیں نہیں، ایسے ہی گھومنے گیا ہوگا۔'' — مگر شام کو جب ہرنام لوٹا تو اس کے کپڑوں پر لگے کالکھ کے دھبوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کام کر کے آ رہا ہے۔ منگو تو لگا ماں بہن کی گالیاں دینے۔ مگر رحمت نے دھیرے سے پوچھا: ''کیوں ہرنام! یہ سچ ہے؟ — '' یہ سن کر ہرنام چلّا کر بولا — ''ہاں ہاں گیا تھا کام پر۔ کر لے جو جی چاہے۔''
رحمت اب بھی دھیرے ہی سے بولا — ''اچھا یہ بات ہے؟'' پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ہرنام کا بستر، ٹین کا ٹرنک اور دوسرا سامان تھا۔ بڑی خاموشی سے اس نے وہ سب چیزیں برآمدے کے باہر میدان میں پھینک دیں اور ایک لفظ نہ بولا۔ چپ چاپ جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ ہرنام کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بانہیں چڑھا کر رحمت کی طرف لپکا۔ مگر بیچ میں منگو آ گیا۔ کالا کلوٹا منگو۔ تھا تو دبلا پتلا سا، مگر اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور بڑا پھرتیلا بھی تھا۔ ہرنام کو روک کر اسے ایک لنگڑی جو دی تو چاروں خانے چت زمین پر آ رہا۔ اتنے میں بستی بھر کے مزدور وہاں جمع ہو گئے۔ ہرنام سے سبھی جلے ہوئے تھے۔ اسے گرتا دیکھ کر سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اب جو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا ہوا اٹھا، تو دیکھا کہ چاروں طرف سے وہ گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ رحمت اور منگو پر ایک بار بھی وار کرتا ہے تو سارے کے سارے اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ اس لیے اس بیچارے نے اپنی چیزیں اکٹھی کر کے میری کوٹھری کے سامنے برآمدے میں رکھ دیں۔ میرے پاس آ کر بولا:
''کیوں ممدو! تیرے یہاں آ جاؤں؟ کوٹھری کا سارا کرایہ آج سے میں دے دیا کروں گا۔''

''سرکار، اندھے کو کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں ٹھہرا بیکار۔ مجھے تو پہلے ہی فکر تھی کہ ہر مہینے کرایہ کیسے دوں گا؟ سو میں نے کہا: ''تو بے کھٹکے یہاں آجا ہرنام۔ میں نہیں ڈرتا کسی سے۔'' وہ جو کہتے ہیں کہ کر بھلا تو ہوگا بھلا۔ سو وہی ہوا۔ میں نے ہرنام کو رہنے کے لیے جگہ دے دی اور اس نے اگلے ہی دن مجھے کارخانے میں نوکر رکھ دیا۔

ہڑتال کی وجہ سے مالک ہر کسی کو رکھنے کے لیے تیار تھے۔ چاہے اسے کام آتا ہو یا نہیں۔ بس دو ہاتھ دو ٹانگیں ہونی چاہئیں۔ سو میں بھی ڈیڑھ روپے پر نوکر رکھ لیا گیا۔ اوپر سے روپیہ روز ''اسٹرئک الاؤنس'' ملتا تھا اور ملنا بھی چاہیے تھا۔ ہم پچاس ساٹھ آدمی جان پر کھیل کر کارخانہ چلا رہے تھے۔ روز ہمیں گالیاں اور دھمکیاں سہنی پڑتی تھیں۔ بستی کے دوسرے مزدوروں نے ہمارا حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ دو ایک بار پتھر بھی ہم پر پھینکے گئے! پر میں نے کہا:

''جو بھی ہو، ہڑتال کر کے بھوکا مرنے سے بہتر ہوگا۔''

ہاں، تو میں کارخانے میں ہونے کو تو ہو گیا مگر مجھے کام آتا ہی نہ تھا۔ ایمان کی بات یہی ہے کہ ہرنام نے ''ویونگ ماسٹر'' سے جھوٹ کہہ دیا تھا کہ میں نے اسے کام سکھا دیا ہے۔ اب یہ ایک مشین سنبھال سکتا ہے۔ کارخانے والوں کو ان دنوں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ مشینوں کو کسی نہ کسی طرح چالو رکھیں، تا کہ اخباروں میں یہ اعلان کر سکیں کہ ہڑتال فیل ہوگئی اور کارخانے میں کام ویسے کا ویسا ہی ہو رہا ہے۔ ہرنام نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو تو یہی ظاہر کیجیو کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ویسے میری مشین اس کے پاس ہی تھی۔ میں برابر اس کو دیکھتا رہتا اور جو کچھ وہ کرتا وہی میں کرنے لگتا۔ اس نے بٹن دبایا، میں نے بھی دبایا۔ اس نے تیل کی کپی لے کر پُرزے میں تیل دیا، میں نے بھی یہی کیا۔ اس نے مشین تیز کی، میں نے بھی کی۔ تین دن تو میں نے ایسے ہی گزار دیے۔ پگار تو ہفتہ کے ہفتہ ملنے والی تھی مگر ''اسٹرائیک الاؤنس'' کا روپیہ روز مل جاتا تھا۔ میں نے سوچا، اپنی بلا سے۔ اسٹرائیک عمر بھر چلے۔

اتنے میں مجھے مشین کے کام کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا۔ کام تو سارا مشین کرتی تھی۔ ہمیں تو صرف بٹن دبا کر مشین چالو کرنا اور اس کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔ چوتھے دن ہرنام کی مشین کا پُرزہ بگڑ گیا اور اُسے کہیں دوسری مشین پر لگا دیا گیا: ''کیوں ممدو! سنبھال لے گا نا؟''

میں نے کہا: ''تو فکر نہ کر اس میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگے ہیں۔'' پھر بھی وہ جاتے جاتے

لوٹ کر آیا اور کہنے لگا:

''ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کیجیو۔''

''ہاں تو وہ دوسری مشین پر چلا گیا۔ اب اس کی مشین اور کتنی مشینوں کی طرح بیکار کھڑی تھی۔ مگر میری مشین کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کام کر رہی تھی۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ مشین چل رہی تھی اور میں خدا کی قدرت پر عش عش کر رہا تھا کہ واہ واہ! ان ولایت والوں کو کیا عقل دی ہے۔ انسانوں کا کام مشینوں سے لیتے ہیں۔ جب ہم کمبل بُنتے تھے تو میرا باپ اون کو دھو کر اور دُھن کر اس میں سے میل نکالتا تھا۔ پھر میری ماں چرخے پر اون کاتتی تھی۔ پھر ہم سب بھائی تانا تیار کرتے تھے۔ پھر کرگھے پر میرا باپ کمبل بُنتا تھا اور اس طرح سب کی کئی دن کی محنت کے بعد نو گز لمبا کمبل تیار ہوتا تھا۔ کپڑا بُنا جا رہا تھا، لپیٹا جا رہا تھا اور کتنی تیزی کے ساتھ۔ میرا باپ اور ماں اور سب بھائی اور پڑوسی، بلکہ مظفر نگر کے سارے جولاہے مل کر ایک مہینے میں اتنا کپڑا نہیں بُن سکتے تھے جتنا یہ مشین ایک گھنٹے میں بُن رہی تھی۔ واہ واہ سبحان تیری قدرت۔ اب اس کپڑے کی بوریاں بنیں گی۔ ان بوریوں میں دھان اور گیہوں اور دالیں اور نمک مرچ بھر کر دوسرے ملکوں کو بھیجا جائے گا۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ مشین چلی جا رہی تھی۔ میں نے بجلی کی فرکی دبا کر، گھما کر مشین کی رفتار اور تیز کر دی اور تیز رفتار میں مجھے مزہ آ رہا تھا۔ کپڑا اب اور تیزی سے بُنا جا رہا تھا اور اسی تیزی سے میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہ سَن کس کس دیش کی سیر کرے گا؟ کتنا اچھا ہوتا کہ اسی کپڑے میں لپٹ کر میں بھی...... کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ۔ مشین کے گیت میں مجھے ایک بے سری سی آواز سنائی دی۔ سامنے دیکھا تو تانے کا تار ایک جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ دھاگے کی نلی ادھر سے ادھر بیکار گھوم رہی تھی مگر بنائی نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے کرگھے پر جب کبھی اون کا دھاگا ٹوٹ جایا کرتا تھا تو میرا باپ دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک مروڑی دے دیتا تھا۔ بس وہ پھر جڑ جاتے اور تانے بانے کا سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔ ایک دم میرے دماغ میں بھی یہی آیا کہ ممدو، تو بھی یہی کر اور ذرا بھی نہیں سوچا کہ یہ بجلی سے چلنے والی مشین ہے بندو جولاہے کا کرگھا نہیں ہے۔

بنا مشین بند کیے میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹوٹے ہوئے سرے پکڑنے چاہے مگر میری بانہیں چھوٹی تھیں اور مشین لمبی تھی۔ ایڑیاں اٹھا کر مجھے کافی آگے کو جھکنا پڑا۔

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ مشین چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی دھاگے کا ٹوٹا ہوا سرا میرے ہاتھ میں آیا، میرے پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور میں منہ کے بل مشین کے تنے ہوئے کپڑے پر آ رہا۔

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ مشین چل رہی تھی اور اس کے ساتھ مجھے اندر گھسیٹ رہی تھی۔ کپڑا لوہے کے رولر پر لپٹا جا رہا تھا اور میں مشین کے فولادی جبڑے کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ اس وقت تو سرکار، مجھے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آ گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ہاتھ پاؤں مارے مگر کپڑے کے جھول میں اتنا الجھ گیا تھا کہ کسی طرح نکلنے کی صورت نہ نکلی۔ اور ایک بار جو میں نے ٹانگوں کو زور سے جھٹکا دیا تو بایاں پاؤں اس کمبخت مشین کے نہ جانے کس پُرزے میں پھنس گیا۔ اب میں لاکھ چھڑانا چاہتا ہوں مگر پاؤں نہیں نکلتا۔ بلکہ میں گھسٹتا چلا جا رہا ہوں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور کتنے ہی مزدور میری طرف دوڑے۔ ویونگ ماسٹر کی آواز سنائی دی: ''بجلی بند کرو۔ بجلی بند کرو۔'' مگر ابھی کوئی بٹن نہ دبایا تھا کہ کٹھاک سے آواز آئی۔

اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی بھیانک ہاتھ نے میری ٹانگ کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں اور پھر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک مفت ہسپتال میں پڑا تھا اور میری داہنی ٹانگ کٹ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر پہلے تو مجھے دکھ ہوا، مگر میں نے سوچا خدا کا شکر ہے ٹانگ ہی گئی جان تو بچ گئی۔ اور اگر دونوں ٹانگیں چلی جاتیں تو کیا ہو سکتا تھا۔ آج میں بھی اسی لنجے رولدو کی طرح بانہوں اور کولھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتا۔

ہاں تو سرکار، پندرہ دن کے بعد جب میں اس ہسپتال سے نکلا تو میں لنگڑا ہو چکا تھا۔ میری جیب میں صرف سات روپے تھے۔ چھ روپے تو ہرنام نے چار دن کی مزدوری کے لے کر دیے تھے اور ایک روپیہ میرے پاس پہلے کا بچا ہوا تھا۔ ہرنام نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے ویونگ ماسٹر سے بات چیت کی تھی کہ کارخانے کی طرف سے میری کچھ مدد کی جائے مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ اناڑی مزدور اگر اپنی بھول سے اپنی ٹانگ اور ہماری مشین توڑ ڈالے، تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مل مالکوں کی طرف سے ہرجانے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ خیر میں نے دل کو سمجھایا کہ خدا تیرے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ گھبرا مت۔ جب میں بستی آیا اور گاڑی سے اتر کر دیوار کا سہارا لیتا ہوا اپنی کوٹھری تک پہنچا تو رحمت، منگو اور بہت سے مزدور مجھے دیکھنے آئے۔ تھوڑی دیر تو سب چپ چاپ کھڑے میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھتے رہے اور ان کو اس طرح سے گھورتے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے غصے کا پارہ ایک دم تیز ہو گیا اور میں چلاّیا: ''یہاں کھڑے کھڑے کیا گھورتے ہو؟ کیا پہلے کبھی ایک ٹانگ کا آدمی نہیں دیکھا؟ نکلو یہاں

ہے۔'' اس پر وہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے پر رحمت وہی کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا: ''ممدو! یہ خدا نے تجھے ہڑتال توڑنے کی سزا دی ہے۔'' بس یہ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ یہ سن کر مجھے ذرا سا بھی غصہ نہ آیا۔ صرف میں نے سوچا کتنا بدقسمت ہے یہ رحمت۔ اسے صبر کی قدر ہی نہیں معلوم! اور پھر کون جانتا ہے شاید خدا ہڑتال توڑنے والوں ہی سے خوش ہوا اور اس لیے اسے اتنے سخت حادثہ کے باوجود میری جان بچ گئی ورنہ سب ہڑتال توڑنے والوں کی ٹانگیں ٹوٹنی چاہیے تھیں۔

''ہاں تو سرکار! صبر کے امتحان میں میں پورا اُترا۔ جب ربڑ یا لکڑی کی ٹانگ نہ ملی تو میں نے صبر کی ٹانگ لگوا لی اور کباڑی کے یہاں سے یہ دو بیسا کھیاں لے لیں اور اس دن سے ان کے ہی سہارے کود پھاند کر چل لیتا ہوں۔ جب محنت مزدوری ممکن نہ ہوئی تو بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ روزی دینے والا خدا ہے۔ انسان تو اس کا ذریعہ ہے۔ پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے میں کہاں کی شرم؟ اصل میں تو ہم خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے سرکار کہ بھیک میں ڈیڑھ دو روپے روز کے زیادہ کما لیتا ہوں۔ پھر کارخانے میں جان کھپانے سے حاصل؟ اور ہاں، جب ہرنام بیوی بیاہ کر لے آیا اور اس نے مجھے میری ہی کوٹھری سے نکال دیا تب سے میں نے یہاں سڑک کی پٹری پر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ چھتیں اور فرش، بنگلے اور کوٹھیاں اور پلنگ کرسیاں، یہ سب تو بیکار کے چونچلے ہیں۔ صبر کا فرش ہو تو سڑک کا کنارہ بھی محل بن جاتا ہے۔

کتنے ہی مہینے میں نے صبر سے بھیک مانگ کر بتا دیے ہیں۔ مجھے اس فقیری کی زندگی میں مزہ آنے لگا۔ نہ محنت، نہ مزدوری، نہ مالک مکان کو کرایہ دینا۔ نہ چولھے چکی کا بکھیڑا۔ فقیر کی زندگی ہی اصل میں آزاد زندگی ہے۔ میں اور تمام بندھنوں، ضرورتوں اور جھگڑوں سے تو آزاد ہو گیا۔ پر کٹی ہوئی ٹانگ ہونے پر بھی ایک شیطانی ضرورت اب بھی جاڑے کی راتوں میں تنگ کرتی ہے۔ جب میرے پاس پانچ دس روپے جمع ہو جاتے تھے، میں رات کو چپکے سے سونا گاچی پہنچ جاتا تھا۔ آپ جانتے ہیں سرکار، اس بازار میں امیر غریب، نواب فقیر سب برابر ہیں۔ جس کی جیب میں دام ہوں وہ جو مال چاہے خرید سکتا ہے۔ چاہے وہ لولا لنگڑا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے۔ میں بیسا کھیوں کا سہارا لیتا ہوا سونا گاچی میں ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ یہ جگہ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اکثر میں وہیں آیا کرتا تھا۔ دو روپیہ میں سودا ہو جاتا تھا۔ مگر اس رات کو بوڑھی نائکہ مجھے دیکھتے ہی ہنس کر بولی: ''کیوں رے لنگڑے! پھر آ گیا تو؟

پر آج دو روپے سے کام نہیں چلے گا۔ گدڑی میں پانچ روپے ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں تو راستہ پکڑو۔''
ان دنوں مجھے بھیک میں اچھی رقم مل رہی تھی۔ چالیس کے نوٹ تو میں نے گدڑی کے اندر سیے ہوئے تھے اور سات آٹھ روپے اور پیسے اس وقت بھی میرے پاس تھے۔

میں نے کہا: ''لنگڑا ہوں تو کیا؟ پیسہ میرا بھی دو ٹانگ سے چلتا ہے۔ مال دکھاؤ، پانچ روپے بھی مل جائیں گے۔''

پر وہ بڑی گھاگ تھی۔ لونڈیا نہیں دکھائی۔ مجھ سے پانچ روپے لے کر مجھے اندر کمرے میں ڈھکیل دیا۔ اندر جا کر میں نے بیساکھیاں تو پھینک دیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لونڈیا کوئی سچ مچ نئی معلوم ہوتی تھی۔ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا: ''میری جان! صورت تو دکھاؤ۔ میں لنگڑا ہوں پر تمھیں خوش کر دوں گا۔'' مگر اس نے جو گھونگھٹ اٹھایا تو یقین مانیے سرکار، میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

وہ چلائی: ''ممدو۔''

اور میں نے کہا: ''چھوٹی بی بی۔ تم کہاں؟''

وہ بولی: ''ہاں ممدو۔ یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔ تمھاری ٹانگ کیا ہوئی؟''

میں نے کہا: ''اور یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔''

وہ رو رہی تھی — میں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی تو بانو مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے دھیان سے دیکھا — ان تین برسوں میں اس کا وہ رنگ روپ نہ رہا تھا۔ بیس اکیس برس کی عمر میں تیس پینتیس برس کی لگتی تھی۔

آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے تھے۔ پاؤڈر سرخی کے ہوتے ہوئے بھی رنگت پیلی تھی۔ آدھی اتنی ہو گئی تھی کہ باہوں کی ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ منہ پر کئی جگہ عجیب سی پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ جب آنسو کچھ دیر کو تھمے، تو اس نے مجھے اپنا حال بتایا۔

جس ڈرائیور کے ساتھ وہ بھاگی تھی وہ بڑا بدمعاش نکلا — کلکتہ لا کر دو تین مہینے تو بانو کا زیور بیچ بیچ کر خوب عیش کیا۔ پھر جب گزارے کی کوئی صورت نہ رہی تو اس نے کرم پر مجبور کیا اور ایک رات کو اسے ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ کر غائب ہو گیا۔ میں نے کہا: ''پر چھوٹی بی بی، تم نے پولس میں کیوں نہ رپٹ لکھوائی؟ تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تحصیلدار صاحب کو لکھا ہوتا۔ وہ آ کر تمھیں لے جاتے اور اس سور کی چمڑی ادھیڑ دیتے۔''

وہ بولی— ''پولس میں رپٹ لکھواتی تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ مجھے زبردستی گھر واپس بھیج دیا جاتا۔ جو کچھ مجھ پر گزر چکا تھا اس کے بعد میں کیا منہ لے کر ابا کے سامنے جاتی؟''

مطلب یہ کہ بانو بیچاری ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ ہوتی ہوئی آخر میں گھٹیا رنڈی خانے میں پہنچی تھی جہاں قسمت اسی رات مجھے لے آئی تھی۔ میں نے کہا— ''اب تم کوئی فکر نہ کرو۔ جب تک ممدو کے دم میں دم ہے، تمھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ اب میں تمھیں ایک منٹ بھی اس پاپ کے نرک میں نہ رہنے دوں گا۔''

وہ آنکھیں نیچی کر کے بولی: ''پر ممدو! میں بیمار ہوں۔ بہت بری بیماری ہے۔''

اب مجھے ان پھنسیوں کی وجہ سمجھ میں آئی جو بانو کے چاند جیسے مکھڑے کو داغدار بنائے ہوئے تھیں۔ مگر میں نے کہا: ''کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہی کون سا چھیلا جوان ہوں؟ لنگڑا فقیر ہی تو ہوں— میں تمھارا علاج کراؤں گا۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے سنا ہے اب ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ چلو میرے ساتھ اسی وقت۔''

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ میں نے کہا: ''آ جاؤ۔'' بوڑھی نائکہ بولی— ''ابے او لنگڑے! پانچ روپے دیے ہیں۔ کوئی رات بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ دوسرا گاہک انتظار کر رہا ہے۔''

پیچھے ایک بھیانک، کالا سا، موٹا تگڑا آدمی نشے میں جھوم رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بانو کا ہاتھ پکڑے ہوئے دوسرے سے بیساکھیاں اٹھاتے ہوئے کہا:

''یہ لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اب یہ یہاں نہ رہے گی۔''

اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہوا۔ ٹھیک یاد نہیں۔ شاید نائکہ نے اس آدمی کو اشارہ کیا— وہ بانو کو دبوچنے کے لیے بڑھا— بانو کی چیخ ضرور یاد ہے۔ ایسی چیخ جو پتھر دل کو موم کر دے۔ نہ جانے کب اور کیسے میری بیساکھی ہوا میں اٹھی اور اس شرابی کی کھوپڑی پر گری۔ اگلے پل میں وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور نائکہ چلا رہی تھی:

''خون! کوئی آؤ— دوڑو۔ اس خونی کو پکڑو۔''

اور بانو ڈری ڈری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''ممدو! یہ تو نے کیا کیا؟''

اور میں کہہ رہا تھا:

''چھوٹی بی بی! تم فکر نہ کرو۔ اس دن میں تانگہ وقت پر نہ لایا تھا۔ یہ اس کی سزا ہے۔''

اور سو، وہ دن اور آج کا دن، دس برس قید کاٹی۔ پرسوں ہی چھوٹا ہوں۔ اب پھر وہی سڑک کا کنارا، وہی صبر کا فرش اور صبر کی چھت۔ سنتا ہوں ان دس سالوں میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہوئی ہوگی۔ سنتا ہوں لاکھوں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ مارے گئے اور اس کلکتہ کی سڑکوں پر خون کے دریا بہے — بہے ہوں گے۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا۔ ہوا ہوگا۔ مجھے تو پتہ نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک پہلے سے کم ملتی ہے اور بہت سے رحم دل بابو بھی جب پاس سے گزرتے ہیں اور پیسے دینے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ لے جاتے ہیں تو جیب کو خالی پاتے ہیں۔

پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کم سے کم ایک ٹانگ تو ہے۔ رولدو کی طرح بالکل اپاہج نہیں ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ بانو اب تک زندہ ہے اور میرے پاس ہے۔ وہ بڑھیا آپ دیکھتے ہیں نا؟ سامنے بیٹھی اپنے سفید بالوں میں سے جوئیں نکال کر مار رہی ہے، وہی بانو ہے...... بانو...... جس کی رنگت کبھی ایسی تھی جیسے میدا اور شہد۔ اور جو کبھی کالے ریشمی برقعے میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل کر مسکرا رہا ہو۔ جس کی بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں اور جس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو مست کرنے کو کافی تھی۔

اب اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں اور سارا بدن پیپ رستے ہوئے پھوڑے پھنسیوں سے پٹا پڑا ہے۔ اور بہت دن ہوئے اس کا دماغ جواب دے چکا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کے سکھ یاد ہیں اور نہ جوانی کے دکھ۔ نہ تحصیلدار صاحب، نہ خانم، نہ ممدو۔ دن بھر وہ بیٹھی بیٹھی جوئیں مارا کرتی ہے اور آپ ہی آپ نہ جانے کیا بڑبڑاتی ہے۔

مگر شکر اللہ کا — بانو زندہ ہے، میرے پاس ہے اور میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔''

☆☆☆

ابابیل

اس کا نام تو رحیم خان تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے، نہ جانور پر۔ ایک دن رامولہار کے بچے نے اس کے بیل کی دُم میں کانٹے باندھ دیے تھے تو مارتے مارتے اس کو اَدھ مُوا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کم بخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہہ دیا— ''ارے بھئی رحیم خاں! تو کیوں بچوں کو مارتا ہے—؟'' بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانہ بھیجنا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدّو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا— ''کیوں بے نتھو! تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورے کرے گا۔ اور ابے چھدّو! تیری بھی شامت آئی ہے کیا؟'' اور پھر ان غریبوں کی شامت آ ہی جاتی۔ سوت کی رسّی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک ہے، بیوی کو ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اس کو الٹا لٹکا کر بیلوں والی رسّی سے مارتے مارتے بے ہوش

کردیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے چھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کے بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو اَدھ موئی ہوگئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ سال کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا، اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا— ''ہلاس پور کی طرف جاؤ ذرا، نورو کو لیتے آنا—'' بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہوگیا— ''میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔''

بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خان کو غصہ اتارنے کے لیے فقط بیوی رہ گئی تھی۔ سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خان کھیت پر گیا ہوا تھا، وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لیے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خان بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لیے گئی ہے۔ رحیم خان نے خلافِ معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر چھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلّی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دُم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولھے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا؟ بغیر کچھ کھائے پیے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خان جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دوہ کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔

پھر معلوم نہیں کیا سوچا۔ ایک گھڑونچی لا کراس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دیکھا دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل اپنی چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

''اری آنکھ پھوڑے گی—'' اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا اور گھڑونچی پر سے اتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب بھی کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا، لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آجاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب گھر میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدّت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدّو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خان ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آرہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کبڈّی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا— ''ارے میں کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں—'' آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہوگئی۔

اندر آکر کواڑ بند کیے اور چراغ جلا کر اجالا کیا۔ حسب معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دیے— ''ارے او بندو! ارے او نورو!'' پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا، وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بیچاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کر کے وہ اترا، تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں۔ مگر اس نے پروانہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا؟ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو ذیلدار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔۔ ''ارے بندو! ارے نورو! کہاں مر گئے؟ آج تمھیں کون کھانا دے گا۔۔؟'' چند ابابیلیں کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

''بے چارہ پاگل ہوگیا ہے۔'' کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا: ''صبح کو شفاخانہ والوں کو بتادیں گے کہ پاگل خانہ بھجوادیں۔''

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفاخانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی پر چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

نئی برسات

سات دن سے لگاتار پانی برس رہا تھا، دہلی کے پرانے رہنے والوں کا کہنا تھا کہ وہاں بیس برس میں اتنی بارش کبھی نہیں ہوئی۔ اس بار تو ایسا لگتا تھا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ نئی دہلی کے سبزہ زار پانی میں ڈوب چکے تھے۔ کناٹ پلیس ایک گول تالاب بن گیا تھا۔ انڈیا گیٹ کے سامنے جہاں بادشاہ جارج پنجم کا سفید بت ایک انتھک سنتری کی طرح اپنی اندھی آنکھیں سکرٹریٹ پر جمائے کھڑا ہے، مرغابیاں اطمینان سے سڑکوں پر تیر رہی تھیں۔ بادشاہ جارج پنجم کا بت بارش کی طرف سے لاپرواہ تھا کیونکہ اس کے سر پر سنگ مرمر کی چھتری تھی، جو اس کی سنگین شاہانہ پوشاک کو گیلا ہونے سے بچائے ہوئے تھی۔ یہ سنگ مرمر کی چھتری بے جان بادشاہ کے علاوہ چند جانداروں کو بھی پناہ دے رہی تھی۔ کئی چیلیں اور کوے گیلے پروں میں اپنے سر چھپائے سمٹے سکڑے وہاں بیٹھے تھے۔ کوئی بادشاہ کے تاج پر، کوئی بادشاہ کے پتھریلے قدموں میں۔

بارش ہو رہی تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس اور سکرٹریٹ میں، کناٹ پلیس میں، نئی دہلی کی چکنی سپاٹ سڑکوں پر، پرانی دہلی کی تنگ اور تاریک گلیوں میں، جامع مسجد اور لال قلعہ میں، راج گھاٹ پر جہاں سے بپھری ہوئی جمنا کا پانی اب چند قدم ہی رہ گیا تھا اور شرنارتھی کیمپ کی نئی بنی ہوئی نیچی نیچی بارکوں پر جہاں مغربی پنجاب کے وہ شرنارتھی ٹھہرے ہوئے تھے جن کو بسانے کا ابھی تک کوئی انتظام نہ ہو سکا تھا۔

بارش ہو رہی تھی، آسمان پر، زمین پر اور ان کے درمیان فضا میں ہر جگہ پانی ہی پانی تھا۔ مگر یہ تالاب کے پانی کی طرح ساکن پانی نہیں تھا۔ سمندر کی طرح اس میں طوفان تھا، جوش تھا، اُبال تھا، مگر سمندر کے پانی میں صرف اندرونی ہیجان ہوتا ہے۔ جوار بھاٹا بھی بس ساحل کو ہی بھگو کر پھر سمندر میں واپس چلا جاتا ہے۔ مگر یہ برستا ہوا پانی تھا، گرجتا ہوا پانی، گولیوں کی طرح برستا ہوا پانی، توپوں کی طرح گرجتا ہوا۔ اس پانی میں حرکت تھی، زور تھا، شور تھا، ہوا کے جھکڑ کے ساتھ بارش کا

طمانچہ اچھوں اچھوں کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

اوشا اپنی کھڑکی میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ وہ کون سی قوت، کونسا معجزہ ہے، جو پانی کی بوند جیسی حقیر اور ملائم اور بے ضرر شے کو یہ طاقت، یہ زور، یہ ولولہ بخشتا ہے؟ اس کے لیے برسات کسی معجزے سے کم نہ تھی۔

اس کی پیدائش اور پرورش ملتان جیسے سوکھے، ریگستانی علاقے میں ہوئی تھی، جہاں اگر کبھی بھولا بھٹکا بادل آ بھی نکلتا تھا تو اس خوشی میں اسکولوں کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ ملتان میں پانی کے بجائے رات دن ریت کی بارش ہوتی تھی۔ ملتان کی ریت کا خیال آتے ہی اوشا کو ایک جھرجھری سی آئی جیسے کبھی ریت میں بھرے ہوئے پاؤں ایک دوسرے سے رگڑ کھا جائیں اور سارے بدن میں بجلی سی دوڑ جائے...... ایک ایسی سنسنی جن میں جوان لڑکیاں مسرت اور اذیت دونوں محسوس کرتی ہیں۔

اور اس کے دانتوں میں کرکراہٹ محسوس ہونے لگی۔ جیسے آندھی نے اسے ریت کا ایک پھنکا کھلا دیا ہو۔

ملتان کا ریتیلا سمندر...... اور دہلی کی یہ برسات۔ دو سال میں وہ کہاں سے کہاں آ پہنچی تھی۔ وہ اور اس کے گھر والے اور ان جیسے لاکھوں اور شرنارتھی جن میں سے دو ڈھائی ہزار تو اسی کیمپ میں رہ رہے تھے۔ کوئی پشاور سے آیا تھا تو کوئی جھنگ سے۔ کوئی ملتان سے تو کوئی شیخوپورہ سے۔ اور کتنے تو آئے ہی نہ تھے۔ راستے ہی میں ختم ہو گئے تھے۔ جیسے ان کا پڑوسی رام لال اور اس کی بیوی لاجو اور ان کا دودھ پیتا بچہ۔ اور اوشا کا ماما جو شیخوپورہ میں مارا گیا تھا۔ اور اس کی ماسی کی بیٹی جو راستے میں اغوا کر لی گئی تھی...... اور...... اور...... فہرست بہت لمبی تھی۔ اور اس کو دہراتے دہراتے اوشا کا دماغ تھک چکا تھا۔ اور اس وقت موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔ برسات کا معجزہ، جو اس نے اپنی بائیس برس کی عمر میں ملتان میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ اوشا نے اپنی بانہہ باہر پھیلا دی۔ ہوا کے زور سے پانی کے قطرے اس کی نرم جلد پر ایسے لگے جیسے تیر۔ ایک عجیب چبھن سی محسوس ہوئی اور اوشا کو ایک جھرجھری سی آئی۔ ایک ایسی سنسنی جس میں اس کے جوان جسم نے بیک وقت ایک عجیب مسرت اور ایک عجیب اذیت کو محسوس کیا۔

ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بارش کے چھینٹے اب اوشا کے چہرے پر پڑنے لگے۔ اس کے بالوں میں موتی پرونے لگے۔ ننھی ننھی بوندیں سوئیں کی طرح اس کی آنکھوں میں پیوست ہوتی

گئیں۔ یہاں تک کہ آنکھیں چرمرا اٹھیں اور اسے حفاظت کے لیے پلکوں کے پردوں کو گرانا پڑا۔ مگر وہ کھڑکی سے نہ ہٹی۔ چہرے اور بانہوں پر پانی پڑنے سے اس کے جسم نے جو خون کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا، ایک عجیب تسکین محسوس کی — گویہ آگ پانی سے بجھنے والی نہ تھی۔

ٹپ۔ٹپ۔ٹپ،ٹپ۔

موسلا دھار بارش اور ہوا کے مسلسل شور میں اور سب آوازیں کھوئی ہوئی تھیں۔ نہ اوشا کو برابر کی کوٹھری سے اپنے باپ کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی نہ اپنی چھوٹی بہن کے گنگنانے کی، جو ایک کونے میں بیٹھی ایک چیتھڑوں کی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ اور نہ ہی اسی کمرے کے دوسرے کونے کی رسوئی سے ماں کے ہانڈی چولھا کرنے کی آواز۔ پر چھت سے پانی ٹپکنے کی ٹپ ٹپ نہ جانے کیسے اس کے شعور تک پہنچ گئی۔

ٹپ۔ٹپ۔ٹپ،ٹپ۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو کچی مٹی کے فرش پر چھوٹا سا کیچڑ کا دائرہ نظر آیا جہاں قطرہ قطرہ کر کے چھت سے پانی گر رہا تھا۔ ٹپ ٹپ کے ساتھ ہی جتنی آوازیں بارش کے شور میں کھوئی ہوئی تھیں یکلخت پھر زندہ ہو گئیں۔ اس کے باپ کی کھانسی، چھوٹی بہن کا گنگنانا، ماں کا ہانڈی میں ڈوئی چلانا۔ بارش کا شور اب ان آوازوں کے پس منظر میں چلا گیا اور ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ کی آواز اس کے شعور پر چھا گئی۔

چھت ٹپک رہی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا تو کڑیوں پر پانی کی سیل کا دھبہ پڑا ہوا پایا۔ دیواروں کے اوپر کے کونوں سے بھی پانی رس رہا تھا اور سیل آہستہ آہستہ نیچے کی طرف رینگ رہی تھی۔ اس کا تو کوئی علاج ہی نہ تھا۔ ہاں ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے اس نے دوڑ کر مٹی کا کونڈا رکھ دیا تا کہ پانی کی بوندیں اس میں گریں اور سارا فرش کیچڑ نہ بن جائے۔ لیکن ابھی اس نے کونڈا رکھا ہی تھا کہ چھت ایک اور جگہ سے ٹپکنے لگی اور اسے دوسری جگہ ٹین کا ایک خالی ڈبہ رکھنا پڑا، جو اس کا باپ کہیں سے اٹھا لایا تھا۔

اوشا پھر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی اور بچپن کی سنی ہوئی ایک کہانی یاد کر کے مسکرا دی۔ ایک بڑھیا جنگل میں اکیلی اپنے جھونپڑے میں رہتی تھی۔ برسات کے دن تھے۔ ایک شیر بھیگتا ہوا آیا اور جھونپڑے کی دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اندر بڑھیا سے کوئی مسافر پوچھ رہا تھا: ''بڑی بی! تم اس جنگل میں اکیلی رہتی ہو؟ تمھیں شیر سے ڈر نہیں لگتا؟'' بڑھیا بولی: ''نہیں بیٹا، میں شیر ویر سے

نہیں ڈرتی۔ ہاں ٹپکے سے ضرور ڈرتی ہوں۔'' یہ سن کر شیر وہاں سے بھاگا کہ نہ جانے یہ ٹپکا کون سی خوفناک بلا ہے؟ بھاگا جا رہا تھا کہ ایک گیدڑ نے روکا اور پوچھا: ''کیوں بھاگے جا رہے ہو؟ تم جنگل کے بادشاہ ہو۔ تمھیں کس کا ڈر؟'' شیر نے جلدی سے جواب دیا: ''ٹپکے کا۔'' اور بھاگتا چلا گیا۔

اوشا نے سوچا یہی حال آج ہم سب شرنارتھیوں کا ہے۔ دنیا کے کتنے خطروں اور کتنی مصیبتوں کا سامنا کر کے ہم یہاں آئے ہیں۔ انسانی بھیڑیوں اور شیروں سے تو بچ گئے، پر اب اس ٹپکے نے آن پکڑا، اس سے بھلا کون چھٹکارا پا سکتا ہے؟

بارش کے پردے میں باقی سب بارکیں دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ میدان میں ٹخنوں ٹخنوں پانی کھڑا تھا۔ اس لیے ایک دوسرے کی خیر خبر لینے کو تو کوئی آ جا نہیں سکتا تھا۔ پر اتنا اوشا یہاں سے بھی دیکھ رہی تھی کہ سب شرنارتھی اس ٹپکے کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ کوئی بالٹی رکھ رہا ہے، کوئی کونڈا، کوئی کنستر، دو چار لنگوٹ باندھ کر چھت پر چڑھے ہوئے تھے اور مٹی ڈال کر سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سب بارکوں میں سب کمروں کی چھتیں ٹپک رہی تھیں۔ مگر ان کے سر پر چھتیں تھیں تو، ورنہ پچھلے سال یہی زمانہ انھوں نے خیموں میں گذارا تھا اور اس سے پچھلے سال ان ہی دنوں میں وہ اور ان جیسے لاکھوں سڑک پر گھسٹتے آ رہے تھے یا میدانوں میں پڑے ہوئے تھے۔ ملتان سے نکل کر اوشا اور اس کے گھر والوں نے پہلی برسات کھلے آسمان کے تلے گذاری تھی۔ دوسری کپڑے کی چھت کے نیچے اور اب تیسری برسات میں انھیں یہ لکڑی اور مٹی کی چھت نصیب ہوئی تھی۔ گو یہ چھت ٹپکتی تھی مگر پھر بھی چھت تو تھی۔ اس کے لیے انھیں بھگوان، سرکار اور ان کے بارکوں کے بنانے والے ٹھیکیدار سندر لال کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

سندر لال کا خیال آتے ہی اوشا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی بانہوں کو بارش میں پھیلایا اور نکیلی بوندوں کے لمس سے ایک بار پھر وہ اس لذت سے آشنا ہوئی جو بیک وقت لذت بھی تھی اور اذیت بھی۔

سندر لال!

کیا اوشا کو اس سے اب تک محبت تھی؟

سندر لال جس نے یہ بارکیں بنوائی تھیں، یہ کمرے، یہ چھت، یہ دیواریں، یہ فرش...... یہ

سب کچھ اسی کا بنوایا ہوا تھا۔ اسی لیے تو ہر درو دیوار میں اوشا کو اس کی یاد دبکی ہوئی نظر آتی تھی۔ سندرلال نے شرنارتھیوں کے لیے یہ بستی ہی نہیں بنوائی تھی، کم سے کم ایک شرنارتھی یعنی اوشا کی زندگی اور روح کے کھنڈروں کو بھی از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔

اس سے پہلی ملاقات! کیا اوشا کبھی اسے بھلا سکے گی؟ وہ دن، وہ گھڑی، وہ لمحہ آج تک چراغ کی طرح اس کے دل میں روشن تھا۔ اوشا کو اکثر ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی زندگی اس لمحے سے شروع ہوتی تھی جب وہ سندرلال سے پہلی بار ملی۔

کتنی دل برداشتہ تھی ان دنوں وہ! زندگی سے کتنی مایوس اور بے زار۔ شرنارتھی جیون کے دکھ اٹھاتے اٹھاتے وہ اپنے آپ ہی سے اکتا گئی تھی۔ چاروں طرف اسے کہیں سے بھی تو سکھ یا امید کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ اور پھر ایک دن اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کی چند لڑکیاں بہت چمکیلی بڑی بڑی موٹروں میں بیٹھ کر ان کے کیمپ میں آئیں اور کہا کہ وہ شرنارتھیوں کے لیے چندہ جمع کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے کہا ہم اپنے شرنارتھی بھائی بہنوں کے لیے بھیک مانگنے نکل رہے ہیں۔ ہم گھر گھر جائیں گے اور چندے کے لیے دامن پھیلائیں گے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک شرنارتھی بہن بھی ہمارے ساتھ ہوتا کہ وہ اپنی دکھی برادری کی مصیبتوں کو اچھی طرح بیان کر سکے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس طرح ہم زیادہ سے زیادہ چندہ وصول کر سکیں گے۔ سب کی نظریں گھوم کر اوشا پر جم گئیں کیونکہ اس کیمپ میں اوشا ہی سب سے زیادہ پڑھی لکھی سمجھدار اور خوبصورت تھی اور سب یہ جانتے تھے کہ اوشا جیسی خوبصورت شرنارتھی لڑکی کو دیکھ کر پتھر دل والے بھی موم ہو جائیں گے۔ اس کے باپ نے بھی کہا: ''جا اوشی! تو ہی جا۔ جب یہ بیچاری ہماری سیوا کرنے نکلی ہیں تو ہمیں بھی ان کا ضرور ہاتھ بٹانا چاہیے۔''

اوشا ان لڑکیوں کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر نئی دہلی اور پرانی دہلی کی کتنی ہی شاندار سڑکوں پر گھومی تھی۔ محل، بنگلے، دوکانیں، کارخانے...... سب کہیں تو وہ گئیں۔ کسی نے کہلا دیا ''گھر پر نہیں ہیں'' کسی نے کہا ''اس وقت اکاؤنٹینٹ نہیں ہے۔ ہم بعد میں چیک بھجوا دیں گے آپ پتا چھوڑ جایئے۔'' کسی نے پانچ دس روپے دے کر ٹال دیا۔ ایک لکھ پتی نے اپنے پانچ سو روپے کے صوفا سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے سونے کی انگوٹھیوں سے کھیلتے ہوئے کہا: ''صاحب! میرا خود پاکستان میں اتنا نقصان ہوا ہے کہ اوروں کو چندہ دینے کی جگہ مجھے خود اپنے لیے چندہ جمع کرنا چاہیے......'' پر ان سب کی نگاہوں نے اوشا کو اس طرح گھورا جیسے اس کا مول تول کر رہی ہوں کہ یہ شرنارتھی لڑکی کس

قیمت پر مل سکتی ہے؟ اور ان میں سے کسی نے ان سے پوچھا کہ ''کس شرنارتھی کیمپ میں رہتی ہے؟ اکیلی یا اپنے ماں باپ کے ساتھ؟ وغیرہ وغیرہ......'' اور اپنے چہرے اور بدن پر ان کی ہوس ناک نگاہوں کی چبھن محسوس کرتے ہوئے اوشا کی مایوسی بڑھتی گئی اور اسے ایسا لگا جیسے دنیا میں انسانوں کی نسل ہی مفقود ہو چکی ہے اور اب صرف بھوکے بھیڑیے رہ گئے ہوں۔

اور وہ پھر سندر لال کے دفتر میں پہنچیں۔ اندر جانے سے پہلے ''سندر لال کنٹریکٹر امپورٹر ایکسپورٹر'' کا بورڈ دیکھ کر وہ سب سمجھی تھیں کہ وہ کوئی موٹا گنجا، بوڑھا سیٹھ ہوگا۔ مگر سفید قمیص، سفید پتلون میں ملبوس ایک گورے چٹے خوش وضع نوجوان کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ سیٹھ یا ٹھیکیدار کے بجائے وہ کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ان کو بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور اوشا نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بڑے ملائم اور نازک ہیں۔ پتلی پتلی مخروطی انگلیاں جیسی آرٹسٹ لوگوں کی ہوتی ہیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اوشا کو یا اس کے ساتھ کی لڑکیوں کو گھورا نہیں، بلکہ نہایت شرافت سے آنکھیں نیچی کیے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اوشا نے چند الفاظ میں شرنارتھیوں کا حال سنایا، کیمپ کی مشکلات کا ذکر کیا اور بتایا کہ سرکاری مدد ان کی حالت سدھارنے کے لیے کافی نہیں ہے اور انھوں نے دیکھا کہ جب سندر لال نے نگاہیں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

''معاف کیجیے گا۔'' اس نے جب ایک سفید براق رومال نکال کر اس سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ''آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میرے پتا جی بھی لائلپور میں مارے گئے تھے۔'' رومال میں ہلکا ہلکا سینٹ لگا ہوا تھا جس کی خوشبو ہوا میں پھیل گئی۔

تو......تو آپ بھی مغربی پنجاب کے رہنے والے ہیں؟ اوشا نے متاثر ہو کر پوچھا۔

''جی نہیں ہم رہنے والے تو یہیں دہلی کے ہیں۔ مگر ہمارا کافی کاروبار تھا ادھر۔ پتا جی لائل پور اسی لیے گئے ہوئے تھے۔''

پھر اس نے ان کے کہے بغیر پانچ سو روپے کا چیک لکھ کر دے دیا۔ ساتھ ہی انکسار کے ساتھ کہا ''آپ دیویوں کو میری سیوا کی پھر ضرورت ہو تو یاد کیجیے گا۔'' اور پھر ہاتھ جوڑ کر رخصت کر دیا۔

اوشا واپس آ گئی، مگر سندر لال کی شخصیت کا نقش اس کے دل اور دماغ پر ثبت ہو چکا تھا۔ اس دن سے اس نے اپنی زندگی میں ایک نئی شگفتگی ایک نئی توانائی محسوس کی۔ اب وہ اپنے گرد و پیش

میں دلچسپی لینے لگی۔ اب اسے جینا دوبھر یا بے معنی نہ معلوم ہوتا۔ اس نے سوچا بیکار بیٹھنے سے کیا فائدہ؟ اور اپنے کیمپ کے شرنارتھی بچوں کے لیے وہیں ایک تنبو میں اسکول کھول دیا۔ چالیس پچاس لڑکے لڑکیوں نے اپنے نام لکھا لیے، مگر اسکول چلانے کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ بچوں کے بیٹھنے کے لیے بنچ اور ڈسک نہیں تو چٹائیاں تو ضرور درکار تھیں۔ ان کے لیے کتابوں، تختیوں، سلیٹوں اور قلم دوات کی ضرورت تھی۔ غریب شرنارتھیوں کے پاس پیسے کہاں تھے کہ اپنے بچوں کے لیے پڑھائی لکھائی کا سامان خرید سکیں۔ بغیر سرمایے کے اوشا بیچاری کا اسکول چلے تو کیسے چلے؟ اور یہ سرمایہ وہ لائے تو کہاں سے لائے؟ کئی دن وہ اس ادھیڑ بن میں اور پریشانی میں رہی اور پھر ایک دن دل کی گہرائی میں سے کسی نے آہستہ سے کہا: ''آپ دیویوں کو میری سیوا کی ضرورت ہو تو پھر یاد کیجیے گا۔'' اور اگلے دن اوشا سندرلال کے دفتر جا پہنچی۔ مگر آج تک وہ خود یہ نہ طے کر پائی تھی کہ وہ وہاں اپنے اسکول کے غرض سے گئی تھی، یا سندرلال کی مقناطیسی شخصیت کی کشش اسے وہاں لے گئی تھی۔

سندرلال اسے دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ کتنی دل کش تھی اس کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھیں کتنی خوبصورت اور زندگی سے بھرپور تھیں۔ مسکراتی، ناچتی ہوئی آنکھیں، مسکراتے کھلتے ہوئے ہونٹ۔ مگر اس کی ٹھوڑی سے عزم کا پتا چلتا تھا اور جن مضبوطی سے اس کے نازک ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیاں شیشے کی سیٹ کو دبوچے ہوئے تھیں اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کی گرفت سے کسی چیز یا کسی شخص کا نکلنا کافی مشکل ہوگا۔

سندرلال مسکرا دیا اور کہا: ''تو آپ آ ہی گئیں؟'' اور نہ جانے اوشا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کا انتظار کرتا رہا ہو۔ اس نے کسی قدر ہکلاتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ابھی وہ اسکول چلانے میں جتنی مشکلات تھیں ان کی فہرست پوری نہ کر پائی تھی کہ سندرلال نے بٹوے سے سو سو روپے کے دو کرارے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

''معاف کیجیے گا، اس مہینے اس سے زیادہ نہ دے سکوں گا۔''

''جی!...... اس مہینے؟...... یعنی؟''

''یعنی یہ کہ اگلے مہینے آپ کو پھر تکلیف کرنی پڑے گی...... ہاں آپ کا شبھ نام کیا ہے؟''

''اوشا، اوشا بھلہ۔''

''اچھا تو نمستے۔'' نرم اور نازک ہاتھ نمسکار کر رہے تھے۔

''نمستے'' کہہ کر وہ چلی آئی اور گھبراہٹ میں شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی، مگر راستے بھر وہ سوچتی رہی کتنا اچھا ہے وہ۔ کتنا خوبصورت، کتنا شریف۔ اور کوئی ہوتا تو اکیلی لڑکی کو دیکھ کر نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں کرتا اور اس نے تو ایک غیر ضروری لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا اور پھر ایک پریشان کن شبہ نے اس کے دل میں سر اٹھایا۔ شاید وہ مجھے بالکل ناپسند کرتا ہے، جبھی تو جلدی سے چندہ دے کر ٹال دیا اور مجھے ٹھہرنے کے لیے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا میں اتنی بدصورت ہوں؟ چلتے چلتے وہ کناٹ پلیس کی ایک دواؤں کی دکان کے سامنے رک گئی، جہاں وزن کرنے کی مشین رکھی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے کے لیے بلاضرورت اپنا وزن بھی کر ڈالا۔ اکنی ڈالی تو کارڈ نکلا جس پر وزن ایک من دس سیر لکھا ہوا تھا۔ ساتھ میں قسمت کی پیشین گوئی بھی چھپی ہوئی تھی: ''تمھاری زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔'' اوشا نے مسکرا کر اپنے آپ کو شیشے میں دیکھا۔ اس کے گالوں پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

ایک مہینے کے بعد وہ پھر سندر لال کے دفتر میں پہنچ گئی۔ دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہونے والی تھی اور سندر لال باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

''معاف کیجیے گا میں غلط وقت پہنچی۔ راستے میں بس میں بڑی دیر لگ گئی......'' اور جواب میں وہ مسکرا دیا۔ وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ جس میں تسکین اور ہمدردی کے علاوہ مذاق کی ہلکی سی چاشنی بھی تھی، جیسے کوئی کسی بچے کو گڑ بڑاتا دیکھ کر مسکرا دے۔

''آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئی ہیں مس...... مس......''

''بھلہ ،،......اوشا بھلہ۔'' اس نے جلدی سے کہا اور دل میں سوچا اسے تو میرا نام بھی یاد نہیں۔ امیر آدمی ہے بھلا اسے میری کیا پرواہ؟''

''اوشا مجھے یاد تھا...... صرف بھلہ بھول گیا تھا۔ بیٹھیے بیٹھیے۔ کہیے آپ کا اسکول کیسا چل رہا ہے؟''

اوشا نے مختصر سی رپورٹ سنا ڈالی۔ سندر لال کے روپیوں سے چٹائیاں آ گئی تھیں۔ خود اس کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ میز اور کرسی بھی آ گئی تھی۔ بچوں کو قاعدے، سلیٹیں، قلم دوات، پنسلیں بھی مل گئی تھیں۔ پڑھائی باقاعدہ ہو رہی تھی۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ دو تنخواہ دار استانیوں کو رکھ لے تاکہ درجوں کی پڑھائی الگ ہو سکے۔

اور ایک بار پھر سو سو روپے کے دو کرارے نوٹ سندر لال کے بٹوے سے اوشا کے بٹوے

میں پہنچ گئے۔

''اچھا تو میں چلتی ہوں'' کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔آپ کی امداد کا بہت بہت شکریہ نمستے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے؟''

''کھانا کھائے بغیر ہی چل پڑی تھی۔بس میں اتنی دیر لگ گئی......''

''یوں کہیے بھوک لگی ہے۔میں خود کھانا کھانے جانے ہی والا تھا۔اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اکٹھے کھانا کھالیں......''

ایک لمحے کے لیے اوشا گھبرائی کہ شاید وہ اسے کھانا کھلانے گھر لے جائے گا۔مگر سندر لال نے جلدی اس کا شبہ دور کر دیا ''صرف سامنے والے ریستوراں تک جانا ہوگا۔یہاں کھانا اچھا ملتا ہے۔''اور اوشا نے اتنا شاندار ریستوراں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ملتان چھوڑنے کے بعد کبھی اتنا اچھا کھانا کھایا تھا۔مگر کھانے سے زیادہ مزیدار سندر لال کی باتیں تھیں۔اس نے صرف دو سال پہلے کالج چھوڑا تھا اور اب بھی وہ کالج کا طالب علم ہی معلوم ہوتا تھا۔اس نے اپنی کالج کی زندگی کے کتنے ہی لطیفے سنا ڈالے۔اوشا کو خوب ہنسایا۔چودہ مہینے کے شرنارتھی جیون میں آج وہ پہلی بار اس طرح دل کھول کر ہنسی تھی۔کتنا بھولا تھا سندر لال کا انداز۔باتیں کرتے کرتے اس نے میز پر رکھے ہوئے ایک گلدان سے ایک گلاب کا پھول اٹھالیا اور دیکھتے دیکھتے غیر ارادی طور پر اسے مسل ڈالا۔پھر جب اس نے محسوس کیا کہ اس نے کیا کیا ہے تو مسلی ہوئی پتیوں کو اوشا کی پلیٹ کے سامنے ڈھیر کر دیا اور آپ ہی آپ ہنس پڑا۔

اوشا نے ضرورت سے زیادہ کھانا کھالیا......اس لیے نہیں کہ اسے بہت بھوک لگی تھی، بلکہ وہ خوشی کے ان لمحوں کو طول دینا چاہتی تھی۔ریستوران سے اور سب لوگ کھانا کھا کر ایک ایک کر کے جا رہے تھے اور جب اوشا نے آئس کریم کی دوسری پلیٹ ختم کر کے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا تو ڈھائی بجے تھے۔اتنی دیر ہونے کے خیال سے وہ گھبرا گئی۔

''مجھے فوراً جانا چاہیے۔بس میں جاتے جاتے چار بج جائیں گے۔ماتا جی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''گھبرائیے نہیں۔آپ پونے تین بجے پہنچ جائیں گی''۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ایک گھنٹہ کا تو راستہ ہی ہے اور پھر نہ جانے کتنی دیر کیو میں کھڑا رہنا پڑے گا۔''

''آپ میرے ساتھ آیئے۔ میں بتاتا ہوں کیسے ہوسکتا ہے۔'' دفتر کے سامنے اس کی چھوٹی سی بھوری کار کھڑی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر اوشا سے کہا: ''آیئے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی، اس نے سن رکھا تھا کہ اوباش قسم کے رئیس راستہ چلتی لڑکیوں کو اس طرح موٹر میں بٹھا کر بھگا لے جاتے ہیں۔ مگر نہیں سندر لال جیسے معصوم چہرے والا نوجوان کبھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا، پھر اس کے ساتھ جانے میں کیا ڈر؟ وہ موٹر میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کی جگہ سندر لال خود بیٹھا اور موٹر روانہ ہوگئی۔

کسی قدر سہمی ہوئی نظروں سے اوشا دیکھتی رہی کہ موٹر کون سا راستہ اختیار کرتی ہے اور یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ سیدھی شرنارتھی کیمپ کی طرف جارہی تھی۔ تب اس کے دل نے سندر لال بیچارے پر شبہ کرنے کے الزام میں اس پر لعنت وملامت کی۔ وہ کتنا شریف تھا۔ راستہ بھر اس نے سڑک سے اپنی نگاہ نہ اٹھائی۔ برابر بیٹھی اوشا کو چھونا تو درکنار، اس کی طرف نظر گھما کر دیکھا بھی نہیں۔ نہ کوئی ایسی بات کی جس سے معلوم ہو کہ وہ ایک شرنارتھی لڑکی کی غربت سے فائدہ اٹھا کر اس سے معاشقہ لڑانا چاہتا ہے۔ صرف شرنارتھی کیمپ، اوشا کے اسکول اور ایسے ہی عام مسائل پر گفتگو کرتا رہا۔

''لیجیے آ گیا آپ کا کیمپ۔'' سڑک کے کنارے اس نے گاڑی روک لی اور کلائی کی گھڑی دکھاتے ہوئے کہا: ''دیکھ لیجیے پونے تین بجنے میں تین منٹ باقی ہیں، اس لیے مجھے آپ سے اور تین منٹ باتیں کرنے کا حق ہے۔''

کتنا سادہ، دوستانہ اور پرخلوص انداز تھا اس کے مذاقیہ جملوں کا بھی! اوشا ہنس کر بولی:

''کہیے کیا بات کرنی ہے؟''

وہ دور تک پھیلی ہوئی خیموں کی قطاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اوشا کو ایسے لگا جیسے سندر لال کے بشاش چہرے پر سوچ اور فکر...... اور شاید رنج...... کا ہلکا سا بادل چھا گیا ہو...... وہ بولا: ''کتنے آدمی ہیں آپ کے کیمپ میں؟''

''عورتیں بچے ملا کر سب ڈھائی ہزار ہوں گے''۔

''خیموں میں رہنا کافی تکلیف دہ ہوگا؟'' اور یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا۔''

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ ہم میں شرنارتھیوں کے ساتھ ہمدردی جتانے والے تو بہت سے ہیں

مگر بہت کم کو احساس ہے کہ ان بیچاروں کی کتنے دکھ اور تکلیف سے زندگی بسر ہوتی ہے۔" اور پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد "میں سوچ رہا ہوں کی گورنمنٹ شرنارتھیوں کو کب تک ان خیموں میں رکھے گی؟ ان کے لیے پکے مکان کیوں نہیں بنوائے جاتے؟"

تیسرے یا چوتھے دن اوشا نے اخبار میں پڑھا کہ گورنمنٹ شرنارتھی کیمپ میں پکی بارکیں بنوانے کی تجویز کر رہی ہے تو اس نے سوچا ان کے منہ میں گھی شکر۔ اس کی بات کتنی مبارک ثابت ہوئی۔

اس کے چند روز بعد سرکاری انجینئر اور اوورسیئر آئے اور زمین کی پیمائش شروع ہوگئی۔ پھر اخباروں میں اشتہار نکلے کہ شرنارتھی کیمپ کی بارکوں کے لیے ٹنڈر مطلوب ہیں۔

اگلا مہینہ آن پہنچا اور اوشا نے اپنے اسکول کے لیے چندہ لینے پھر سندر لال کے دفتر پہنچ گئی۔ اس بار اسے ملنے کے لیے چند منٹ باہر کے کمرے میں انتظار کرنا پڑا کیونکہ چپراسی نے بتایا کہ صاحب کام میں مصروف ہیں۔ دفتر میں کافی رونق اور گہما گہمی تھی۔ سندر لال کے کمرے سے کلرک، چپراسی وغیرہ فائلیں، نقشے وغیرہ لے کر اندر باہر آ جا رہے تھے۔ ٹائپسٹ کھٹا کھٹ چٹھیاں ٹائپ کر رہے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ خود سندر لال کی شخصیت کی طرح اس کے دفتر میں بھی کتنی نفاست کتنی زندگی تھی۔ اوشا کو اس دفتر کی ہر چیز پسند تھی۔ جس قاعدے سے میزیں، کرسیاں سجائی گئی تھیں، جس منظم طریقے سے یہاں کام ہوتا تھا، دیواروں پر لگی ہوئی خوبصورت عمارتوں کی رنگین تصویریں اور مکانوں کے نیلے نیلے نقشے، ٹائپ رائٹر، ٹیلیفون، چپراسیوں کی صاف ستھری کھدر کی وردیاں، سفید کوٹ، سفید پتلون اور سفید گاندھی ٹوپی اور سینے پر پیتل کا چمکتا ہوا بلاّ، جس پر سندر لال کی کمپنی کا نام کھدا ہوا تھا۔ ہر چیز میں اس کی شخصیت جھلکتی تھی۔

ایک کلرک فائلوں کا انبار لیے ہوئے نکلا تو بیچ کے دروازے کو بند کرنا بھول گیا اور اندر کے دفتر میں جو بات ہو رہی تھیں ان کی بھنک اوشا کے کان میں پڑنے لگی۔

کوئی آدمی کہہ رہا تھا "سندر لال جی! سوچ لیجیے۔ آپ ٹھیکہ لینے کی خاطر اتنا نیچا ٹنڈر دے رہے ہیں کہ آپ اس قیمت میں ہرگز یہ عمارتیں نہ بنا پائیں گے۔" اور سندر لال کہہ رہا تھا، "انجینئر صاحب! آپ اس کی پرواہ نہ کیجیے۔ یہ سب میں سمجھ لوں گا، مگر میں نے طے کر لیا ہے کہ اس شرنارتھی کیمپ کا ٹھیکہ میں لوں گا اور اسے میں ہی بنواؤں گا۔"

''کیوں کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں یہی سمجھ لیجیے۔''

نہ جانے کیسے اوشا کو یقین ہو گیا کہ اندر جس ٹھیکے کی باتیں ہو رہی ہیں وہ ان کے کیمپ کے لیے ہی ہے اور اس خیال سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا کہ شاید......شاید......وہ خاص وجہ خود ہے جس کے لیے سندر لال اس کیمپ کا ٹھیکہ لینے کے لیے اتنا مصر تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انھیں میرا اتنا خیال ہے کہ نقصان اٹھا کر بھی وہ ہمارا کیمپ بنوانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے؟......کیا یہ ممکن ہے؟......

یہ سوال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور انجینئر اور کلرک وغیرہ اندر کے کمرے سے نکلے۔ سندر لال ان سب کو چھوڑنے دروازے تک آیا۔ انجینئر سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی نظر اوشا پر پڑی اور دفعتاً ان سب کو چھوڑ کر اس کی طرف مخاطب ہو گیا۔

''اوہ......ہیلو......ہیلو......مس بھلہ! کیسی ہیں آپ؟ آیئے اندر تشریف لایئے۔'' اور اوشا کو اندر ساتھ لے جاتے ہوئے ''معاف کیجیے گا آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں ان لوگوں سے ایک ضروری بات کر رہا تھا۔''

اور اوشا سے نہ رہا گیا ''دروازہ کھلا رہ گیا تھا، اس لیے دو چار باتیں میرے کان میں پڑ گئیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ ہمارے شرنارتھی کیمپ کی بارکیں بنوانے کا ٹھیکہ لے رہے ہیں؟''

اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سر ہلا کر اقرار کیا ''دیکھیے کوشش تو کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے لیے دعا کریں تو شاید کام بن جائے۔''

اور اوشا نے اسے یقین دلایا ''میں کیا ہم سب ہی دعا مانگیں گے کہ آپ کو ٹھیکہ ملے۔'' کیونکہ آپ سے زیادہ کسی ٹھکیدار کو ہم سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ مگر آپ اتنا نیچا ٹنڈر کیوں دے رہے ہیں؟ کیا آپ کو نقصان نہیں ہو گا؟''

''نفع نقصان تو بزنس میں ہوتا ہی رہتا ہے۔'' اس نے ایک معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا ''اور کبھی کبھی ایک ہی سودے میں اگر ایک طرف نقصان ہوتا ہے تو دوسری طرف فائدہ بھی ہو جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اوشا کی طرف اس طرح دیکھا کہ وہ سمجھ گئی کہ اس کا اشارہ کس فائدہ کی طرف ہے اور وہ شرما گئی۔

''یہ لیجیے اس مہینہ کا چندہ۔ اور اگر ٹھیکہ مل گیا تو پھر آپ کو یہاں آنے کی تکلیف نہ کرنی

پڑے گی۔ میں خود ہی دے دیا کروں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ آئندہ چندہ مہینوں میں مجھے آپ کے کیمپ کے کتنے ہی چکر لگانے پڑیں گے۔''

یہی ہوا۔ تیسرے دن سندرلال اپنے انجینئروں کو لے کر وہاں کی زمین کی پیمائش کی غرض سے آیا۔ اوشا نے اسے اپنا اسکول دکھایا جو اسی کے چندے سے چل رہا تھا اور سندرلال نے کہا ''اب بہت جلد اس اسکول کے لیے پکی عمارت بن جائے گی۔ ہم نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ اگر ہمیں ٹھیکہ دیا گیا تو ہم اسکول کے لیے ایک ہال اپنے خرچ پر بنوا دیں گے۔'' یہ سن کر اوشا کا دل تشکر سے بھر گیا۔ چند ہفتے کے بعد سندرلال پھر آیا اور اوشا کو خوش خبری سنائی کہ اس کی کمپنی کو ٹھیکہ مل گیا ہے اور چند روز میں بنیادیں کھودنے کا کام شروع ہو جائے گا۔ اوشا ابھی اسکول نہیں گئی تھی۔ اس نے سندرلال کا تعارف اپنے باپ اور ماں سے کرایا۔ وہ دونوں پہلے ہی اس دریا دل نوجوان کا دم بھرتے تھے۔ مل کر اور بھی گرویدہ ہو گئے۔ سندرلال نے اوشا کے باپ سے کہا: ''آپ کوئی چنتا نہ کیجیے۔ میں یہ عمارتیں نئے ڈھنگ سے بنوا رہا ہوں۔ آپ دیکھیے گا میں کتنی جلدی یہ ساری بارکیں کھڑی کرا دیتا ہوں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے آپ سب ان ڈیروں خیموں سے نکل کر پکے مکانوں میں رہنے سہنے لگیں۔'' اوشا کی ماں نے کہا: ''جیتے رہو بیٹا۔ ہم غریبوں کا تمھیں کتنا خیال ہے۔ بھگوان تمھیں سکھی رکھیں گے۔'' اوشا کی چھوٹی بہن اوما ایک کونے میں شرمائی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سندرلال نے جیب سے چمکیلے کاغذ میں لپٹا ہوا چاکلیٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا: ''یہ لو اوما، یہ چاکلیٹ میں خاص تمھارے لیے لایا ہوں۔'' اور دیکھتے دیکھتے کاغذ کی چمک نے شرمیلی اوما کو لبھا لیا اور اس نے بڑھ کر چاکلیٹ لے لیا۔

اس دن سے سارے کیمپ میں سندرلال اور اس کے ہنس مکھ سبھاؤ اور اس کی دریا دلی کے چرچے ہونے لگے اور انھیں سن سن کر اوشا آپ ہی آپ شرماتی رہی اور اس کا دل گاتا رہا، ''وہ میرا ہے......وہ میرا ہے......'' اور رات کو اس نے اپنے ماں باپ کو اس کی باتیں کرتے ہوئے سنا۔ ماں کہہ رہی تھی ''کیوں جی، یہ سندرلال ہماری اوشی کو کافی پسند کرتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کیسا ہے؟''

اس رات خوشی کے مارے اوشا کو نیند نہ آئی اور سویرا ہوتے آنکھ بھی لگی تو سپنے میں ایک ہنس مکھ چہرہ شرارت بھری نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ دو گوری باہیں اسے اپنی آغوش میں لیے رہیں۔ پتلے پتلے ہونٹ اس کے لبوں کو چومتے رہے اور نرم و نازک ہاتھوں کی انگلیاں اپنے لمس

سے تن بدن میں بجلی دوڑاتی رہیں۔

چند دنوں میں بنیادیں کھدنا شروع ہوگئیں۔ پہلے روز ہی سے سندر لال کو کام ختم کروانے کی جلدی تھی۔ وہ ہر کام اپنی نگرانی میں کرواتا۔ ہر وقت معماروں اور مزدوروں کے سر پر کھڑا رہتا۔ انھیں گھڑی بھر کام روکنے کا موقع نہ دیتا۔ ابھی بنیادیں دو دو فٹ ہی گہری کھدی تھیں کہ اس نے حکم دے دیا کہ بس کافی ہے، اب دیواروں کی چنائی شروع کردو۔ اوشا کا باپ جو ملتان میں اپنی کئی عمارتیں بنوا چکا تھا بولا ''سندر لال! دو فٹ گہری بنیادیں تو کافی نہیں ہوتیں۔'' اور سندر لال نے ہنس کر جواب دیا ''آپ تو پرانے زمانے کی باتیں کررہے ہیں بھلہ صاحب۔ آج سیمنٹ کی عمارتیں نئے ڈھنگ سے بنتی ہیں۔ ان کی لیے دو فٹ بنیادیں بھی کافی ہیں۔''

جوں جوں بارکوں کی دیواریں بلند ہوتی گئیں اوشا اور سندر کی محبت بھی پروان چڑھتی گئی۔ مگر اس محبت کا اظہار ابھی صرف نگاہوں تک محدود تھا۔ جب تک سندر لال کام کی نگرانی کے لیے کیمپ میں موجود رہتا، اوشا کی نگاہیں اس پر لگی رہتیں۔ سندر کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ سیدھا اوشا کے پاس پہنچ جاتا۔ انھوں نے ہیرو ہیروئن کی طرح پریم کے گیت نہ گائے، نہ ٹھنڈی آہیں بھریں، نہ آنسو بہائے۔ کبھی ایک دوسرے سے اظہار محبت نہ کیا، مگر اوشا جانتی تھی کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس سے پریم کرتی ہے۔

دیواریں قد آدم سے بھی بلند ہوگئیں۔ گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت تھا۔ اوشا اسکول ختم کرکے خیمے کی طرف واپس آرہی تھی۔ راستے میں دیکھا کہ زیر تعمیر بارکوں کے قریب سندر کھڑا مزدوروں پر چیخ پکار کررہا ہے۔ ''بس بس کھانے کی چھٹی ختم ہوگئی۔ کام شروع کردو۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعی مزدوروں سے بڑی سختی سے کام لیتا، مگر اوشا نے سوچا وہ خود بھی تو کبھی آرام نہیں کرتا۔ اسی وقت دیکھ لو۔ دوپہر کے ایک بجے دھوپ میں یہاں کھڑا کام کی نگرانی کررہا ہے۔ سر پر ہیٹ بھی کبھی نہیں پہنتا۔ دھوپ اور گرمی سے ان چند مہینوں میں رنگ بھی سانولا پڑ گیا ہے۔ مگر خاکی نیکر پہنے کالا دھوپ کا چشمہ پہنے کھلے گلے کی قمیص پہنے کتنا اچھا لگتا ہے۔

قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے کہا: ''آپ کیوں اتنی محنت کررہے ہیں؟ بارکیں بنتے بنتے بن جائیں گی۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے؟''

وہ چشمہ اتار کر مسکرایا۔ کتنی محبت بھری تھی اس مسکراہٹ میں اور رومال سے پیشانی کا پسینہ پوچھ کر بولا: ''تم نہیں جانتیں اوشا، اب وہ مس بھلہ سے اوشا ہوگئی تھی۔ مجھے بہت جلدی ہے اور

پھر تانبے کی طرح تپتے آسمان کو دیکھ کر" جانتی ہو مہینے ڈیڑھ مہینے میں برسات آنے والی ہے۔اس وقت تک اگر یہ بارکیں تیار نہ ہوئیں تو تم لوگوں کا ان خیموں میں کیا حال ہوگا؟ یہ سارا میدان ایک بڑا تالاب بن جائے گا۔ میں چاہتا ہوں یہ سب شرنارتھی اور خصوصا تمھارے گھر والے اور تم جلد سے جلد خیموں کو چھوڑ کر بارکوں میں آجاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ میں ان مزدوروں پر سختی کر رہا ہوں مگر یہ سب شرنارتھی بھائیوں کی خاطر ہے، تمھاری خاطر۔"

اوشا کا دل گنگنا رہا تھا۔کتنا اچھا کتنا پیارا۔ پر اس نے کہا" اچھا اب ہمارے یہاں چل کر منہ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو جائیں۔اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو دال روٹی کھا لیجیے۔"

سندر نے کہا:" مجھے تمھارے ہاں کی دال روٹی ہوٹل کے پراٹھے کباب سے زیادہ پسند ہے۔"

اور آخر کار بارکیں مکمل ہوگئیں۔سارے کیمپ میں وہ دن خوشی کا تھا جب شرنارتھی خیموں کو خیر باد کہہ کر پکے کمروں میں آئے۔ کتنے تو ایسے تھے جنھوں نے سال بھر سے زیادہ کے بعد پہلی بار اینٹ پتھر کے مکان میں قدم رکھا تھا۔ بہت سوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ بچے برآمدوں کے مکان میں بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔عورتیں اپنے اپنے کمروں میں رسوئی کی پکی جگہ کو ٹھیک ٹھاک کر رہی تھیں۔

اوشا اپنے نئے کمروں میں چیزیں رکھ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور سندر لال داخل ہوا۔

"کہو اوشا! یہ مکان پسند آئے؟"

"بہت اچھے ہیں۔" اوشا کے باپ نے جلدی سے جواب دیا اور ماں نے لقمہ دیا،" بیٹا! یہ سب تمھاری مہربانی ہے۔نہیں تو یہ برسات بھی ڈیروں خیموں ہی میں گذرتی۔"

"چلو اوشا! اپنا اسکول تو دیکھ لو۔"

اوشا نے ماں کی طرف دیکھا۔ماں نے باپ کی طرف۔باپ نے کہا:" ہاں کیا حرج ہے۔ ضرور دیکھ آؤ۔ہم اتنے میں چیزیں ٹھیک ٹھاک کر لیتے ہیں۔ پھر سندر لال جی آج آپ ضرور یہاں چائے پی کر جائیں۔"

اسکول واقعی بڑا خوبصورت بنا تھا۔ یا کم سے کم تنبو کے مقابلے میں تو محل ہی لگتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بنچ اور ڈسک بھی لگے ہوئے تھے۔ ہیڈ مسٹریس یعنی اوشا کے لیے ایک پالش کی ہوئی میز اور کرسی بھی تھی۔

''یہ سب تمہاری بھینٹ ہے۔''

خوشی کے مارے اوشا کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

آؤ، ایک چیز اور دکھاؤں۔'

سڑک کے کنارے ایک موٹر کھڑی تھی۔ لمبی کالی چکنی شاندار موٹر۔ ''یہ کس کی ہے......؟ آپ کی؟''

تم اپنی ہی سمجھو۔ اس ٹھیکے کے منافع سے آج ہی خریدی ہے۔''

ایک ہلکا سا شبہ اوشا کے دماغ میں کلبلایا ''پر آپ نے تو بہت نیچا ٹنڈر دیا تھا۔ میں تو سمجھی تھی منافع ہوگا ہی نہیں......اور پھر یہ اسکول......؟''

''جب کوئی کام نیک نیت سے کیا جائے تو بھگوان اس میں ضرور برکت دیتا ہے اور پھر محنت بھی تو کتنی کی ہے میں نے۔''

اوشا کو دفعتاً گرمی کی وہ دوپہر یاد آگئی جب وہ دھوپ میں کھڑا مزدوروں کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے سنولائے ہوئے چہرہ پر پسینہ بہہ رہا تھا اور بعد میں جب اوشا نے اپنے خیمے کے باہر خود پانی ڈال کر اس کا ہاتھ منہ دھلوایا تھا تو اس کے تمتماتے ہوئے جسم سے گرم گرم خوشبو کا ایک بھپکا اٹھا تھا جو آج تک اوشا کے شعور میں چھایا ہوا تھا۔

''آؤ بیٹھو۔ میں نے طے کر رکھا ہے کہ اس موٹر میں سب سے پہلے تم سوار ہوگی۔''

اوشا موٹر میں بیٹھ گئی۔ کتنی آرام دہ اور خوش خرام تھی وہ موٹر۔ نزاکت اور قوت کا عجیب مجموعہ......جیسا سندر لال کی اپنی ذات میں تھا۔ سندر لال حسب معمول موٹر چلاتے ہوئے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پر اوشا اسے دیکھ رہی تھی۔ آج وہ خوش تھی کیونکہ شرنارتھیوں کو رہنے کے لیے پکے مکان مل گئے تھے۔ اسکول کے بچوں کو نیا اسکول۔ سندر لال کو نئی موٹر اور خود اسے اس کا سندر لال مل گیا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں شام کی خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ سڑک ہموار تھی اور موٹر کے گدے نرم اور لچکدار، اس وقت دنیا میں سکھ ہی سکھ آنند ہی آنند تھا۔ اوشا نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو مسرت کے دھارے میں بہنے کے لیے چھوڑ دیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور موٹر سڑک کے کنارے رکی کھڑی تھی۔ درختوں اور کھنڈروں سے گھری ہوئی۔ شاید ایک یا دو فرلانگ پر قطب مینار دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اوشا نے جوانی کے نشے سے سرشار آنکھیں کھولیں تو سندر کے مسکراتے ہوئے چہرے کو اپنے

سے اتنا قریب پایا کہ وہ اس کے گرم سانس کا لمس اپنے گالوں پر محسوس کر سکتی تھی۔

''اوشا! تم جانتی ہو میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

اس نے سر ہلا کر جواب دیا: ''ہاں۔''

''تو پھر کہوں کہ مجھے تم سے......''

مگر اس نے آگے کچھ کہنے سے روک دیا: ''تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

''تم تو جانتی ہو؟''

اس نے سر کے اشارے سے اقرار کیا ''ہاں۔''

''اور تم بھی؟''

اور اوشا نے شرما کر گردن جھکا لی۔

اور اگلے لمحے سندر کے آتشیں سانس کا لمس اوشا کو اپنے گالوں پر سے ہوتا ہوا ہونٹوں تک آتا محسوس ہوا۔

اس لمحے میں اوشا نے اپنے حسین ترین خوابوں اور چھپی ہوئی آرزوں کا نچوڑ پا لیا۔ اس لمحے میں اس نے آسمان تک پرواز کی اور وہاں سے اپنے بالوں میں لگانے کے لیے تارے توڑ لائی۔ اس لمحے میں دنیا کے تمام ساز بیک وقت جھنجھنا اٹھے۔ اس لمحے سندر اور اوشا دو ہستیوں سے ایک ہو گئے۔ اوشا کا خیال اب یقین بن گیا کہ وہ سندر کے بغیر نہیں جی سکتی اور اس کے دل کی دھڑکن میں ایک ہی صدا گونجتی رہی ''وہ میرا ہے۔ وہ میرا ہے۔''

جب وہ کیمپ واپس لوٹے تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔ موٹر رکی تو دیکھا ایک آدمی خاکی برجس پہنے اور کوٹ ہیٹ پہنے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''ہیلو سندر صاحب۔'' وہ وہیں سے چلایا ایک کرخت بھدی سی آواز میں۔

اوشا نے محسوس کیا کہ سندر کو اس شخص سے اس وقت ملنا کچھ ناگوار سا ہوا۔ اچھی خاصی کوفت ہوئی اور ہونی بھی چاہیے تھی۔ ابھی ابھی راستے میں ان دونوں نے طے کیا تھا کہ سندر فوراً اوشا کے ماں باپ سے بات کرے گا اور جتنی جلدی ممکن ہو ان کی شادی ہو جائے گی۔ پر یہ کمبخت نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔

''کیوں انسپکٹر! کیا بات ہے؟'' سندر نے موٹر سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''بات کیا ہوئی۔ آپ ہی کے کام سے آیا تھا مگر موٹر سائیکل خراب ہو گئی۔ خیر اب آپ کے

ساتھ لوٹ چلتا ہوں۔ راستے میں کام کی بات بھی ہو جائے گی۔''

''ویسے سب کچھ دیکھ لیا نا؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے؟

''اجی میرے ہوتے ہوئے کیا خرابی آسکتی ہے۔ آپ کسی بات کا فکر نہ کریں میں سب سنبھال لوں گا۔''

اوشا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کس معاملے پر بات کر رہے ہیں۔ وہ انسپکٹر پولیس والا تو نہ نظر آتا تھا۔ سندر کا کوئی دوست بھی ہرگز نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کیوں سندر اس سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے اس سے ڈرتا ہو۔ شاید یہ اس کا واہمہ ہی ہو۔

''تو پھر چلیے سندر صاحب۔'' اور یہ کہہ کر وہ انسپکٹر...... جو پولیس کا انسپکٹر نہیں تھا، موٹر میں بیٹھ گیا۔

''اچھا اوشا! تو اب میں جاتا ہوں۔ تمھارے پتا جی سے کل ملوں گا۔ ان سے آج نہ آنے کی معافی مانگنا اور کہنا کل کی چائے یہاں ضرور پیوں گا اور ہاں، کل تم دوپہر کو ضرور آنا۔ لنچ ساتھ کھائیں گے۔ اسی ریستوران میں۔ بھولنا مت۔''

موٹر روانہ ہوگئی اور جلد ہی بادل کے دھول میں کھوگئی۔ اوشا کیمپ کی طرف چل پڑی۔ ہر جانب روشنیاں جگمگا رہی تھیں جیسے دیوالی ہو۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ خوش تھی آج اس کی زندگی کا سب سے حسین سب سے سکھ بھرا دن تھا۔ پر اس کے دل میں ایک عجیب اور نامعلوم شبہ کا ننھا کیڑا کیوں کلبلا رہا تھا۔

اگلے دن وہ ایک بجے سے چند منٹ پہلے ہی سندر لال کے دفتر میں پہنچ گئی۔ چپراسی نے معمول سے زیادہ تپاک سے اس کا استقبال کیا اور کہا: ''صاحب کوئی ضروری بات کر رہے ہیں۔ پر آپ کو بیٹھنے کو کہا ہے۔'' اور اوشا باہر کے کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر ایک رسالے کے ورق الٹنے لگی۔

اندر کے کمرے کا دروازہ کسی قدر کھلا رہ گیا تھا اور دو آدمیوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک آواز تو سندر کی تھی پر دوسری آواز؟ وہ بھی جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی کہاں سنی تھی اس نے وہ آواز؟

سندر غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اونچا بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: ''بیس ہزار دماغ خراب ہوگیا ہے تمھارا۔ پانچ ہزار دوں گا۔ لینا ہے لو، ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

اوشانے سوچا ضرور کسی بدمعاش نے بیچارے سندر کو دھوکا دیا ہے۔ کام کیا ہوگا پانچ ہزار کا اور اس کو سیدھا اور شریف سمجھ کر اب بیس ہزار اور وصول کرنے کی فکر میں ہے۔ شاید کوئی اینٹوں کے بھٹے والا یا لکڑی کا سوداگر ہوگا۔ مگر اگلے لمحے اسے معلوم ہوگیا کہ وہ دوسری آواز والا کون تھا اور سندر سے بیس ہزار کاہے کے مانگ رہا تھا۔

اندر سے آواز آئی ''سندر صاحب! تمھارا پورے ایک لاکھ کا منافع ہوا ہے ان بارکوں کے ٹھیکے میں۔ اگر میں انھیں پاس نہ کرتا تو تمھیں کوڑی نہ ملتی۔ اب بیس ہزار دیتے تمھاری جان نکلتی ہے۔''

اوشا کے من نے دعا کی کاش میرے کان جو سن رہے ہیں وہ جھوٹ ہو۔ میرے کانوں کا تصور ہو۔ مگر اندر سے اس موٹر سائیکل والے بلڈنگ انسپکٹر کی آواز برابر آرہی تھی اور اوشا کے شبہوں کو یقین میں تبدیل کر رہی تھی۔ اس کے بھروسے، اس کے من کے سکھ کو خاک میں ملا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ''دوفٹ گہری بنیادیں، سیمنٹ کے بجائے ریتا، کچی پکی اینٹیں، چھتوں کے لیے دیمک لگی لکڑی کی کڑیاں...... تم نے جیسا کام کیا ہے، میں ہی جانتا ہوں...... بولو کردوں رپورٹ؟''

اور سندر کی آواز خلاف معمول بوکھلائی ہوئی تھی: ''نہیں نہیں۔ پاگل ہوئے ہو۔ مگر سوچو تو کرتا کیا؟ ٹنڈر اتنا نیچا دیا تھا کہ اور کسی طرح منافع کی صورت ہی نہ تھی......''

اوشا نے ان کی باتیں ختم ہونے کا انتظار نہ کیا اور وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ چپراسی نے گھبرا کر پوچھا: ''آپ کہاں جارہی ہیں؟ صاحب پوچھیں گے تو میں کیا کہوں؟'' تو اس نے کہا، ''کہہ دینا ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس لیے چلی گئیں۔'' اس کی طبیعت دفعتاً ہو بھی گئی تھی خراب۔ سر چکرا رہا تھا اور نہ جانے کیوں اس کا دل متلا رہا تھا۔

اسی شام کو بارش شروع ہوگئی۔

موسلا دھار بارش ہی میں وہ اوشا سے ملنے آیا۔ مگر اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دردسر کا بہانہ کیے پلنگ پر پڑی رہی۔

دوسرے دن وہ پھر آیا مگر وہ اس وقت اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ باہر موٹر میں بیٹھا ہوا وہ اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب اسکول ختم ہونے کی گھنٹی ہوئی تو اس وقت تھوڑی دیر کے لیے بارش تھمی ہوئی تھی۔ صرف بوندا باندی ہورہی تھی۔ سندر نے راستہ روک کر اسے بات کرنے پر مجبور کردیا:

''آؤ اوشا! ایک منٹ کے لیے موٹر میں بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''
اوروں کے سامنے جھگڑا کرنے سے بچنے کے لیے وہ موٹر تک آنے میں راضی ہوگئی۔
''اوشا! تمھیں کل سے کیا ہوگیا ہے؟ دفتر سے دفعتاً چلی آئیں۔ رات مجھ سے بات بھی نہ کی۔ میں تو تمھارے پتا جی سے شادی کی بات کرنے آیا تھا۔''
''آپ پتا جی سے کوئی بات نہ کریں......''
''مگر کیوں؟ ہوا کیا؟ پرسوں تک تو تم مجھے پسند کرتی تھیں۔ مجھ سے پریم کرتی تھیں۔ کل کیا ہوگیا؟''
''کل آپ جو باتیں بلڈنگ انسپکٹر سے کر رہے تھے، وہ میں نے سن لیں۔''
''بس اتنی سی بات؟'' اور یہ کہہ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس پڑا۔ ''پر اوشا، میں کسی سے رشوت لے نہیں رہا تھا۔ وہ بدمعاش الٹا مجھ سے رشوت طلب کر رہا تھا۔''
''مگر کس لیے؟ اس لیے نا کہ آپ نے اس بلڈنگ میں ردّی مال استعمال کر کے منافع کمایا ہے؟ اور اس انسپکٹر سے عمارت پاس کرالی ہے۔''
''ٹھیک ہے مگر......'' اس کے چہرے پر اصلی نہیں نقلی استعجاب تھا۔ ''مگر...... اس میں تمھارے خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ تم کس بات پر بگڑی ہوئی ہو؟
''میں آپ کو کیا سمجھتی تھی اور آپ کیا نکلے؟ میں ایک بے ایمان آدمی سے شادی نہیں کرسکتی۔''
''بے ایمان؟'' اور ایک بار وہ پھر ہنسا، مگر اس بار اس کی ہنسی میں معصومیت نہ تھی۔ ایک نئی کرختگی، ایک نئی تلخی تھی۔ ''بے ایمانی نہیں ہے اوشا! یہ بزنس ہے، کاروبار اور تجارت کا یہی ڈھنگ ہے۔ ہر کوئی منافع کی خاطر یہی کرتا ہے۔''
''مگر میں آپ کو ہر کوئی نہیں سمجھتی تھی۔ میں آپ کو اوروں سے اونچا اور اچھا سمجھتی تھی۔''
''اب میں تمھیں روپے کمانے کے ڈھنگ کیا سکھاؤں۔ مگر چھوڑو نا اس جھگڑے کو۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں اوشا۔ تمھارے بغیر جی نہیں سکتا۔ یہ دھن دولت جو کچھ کمایا ہے، یا کما رہا ہوں سب تمھارے لیے ہے۔ تم بھی دل پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ بتاؤ، کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟''
اس وقت بادل زور سے گرجے اور اوشا دفعتاً خوف سے اچھل پڑی۔ مگر اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔

''اوشا! بولو۔ جواب کیوں نہیں دیتیں؟......اوشا......اوشا......؟''

اوشا موٹر سے اتر کر چلی آئی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ جواب دے۔ کہے ''نہیں سندر! میں تم سے پریم نہیں کرتی۔ تم سے نفرت کرتی ہوں۔'' مگر وہ جانتی تھی کہ یہ جھوٹ ہے۔ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی......

سات دن سے بارش ہو رہی تھی۔ گر اوشا کے من کی آگ اسی طرح سلگ رہی تھی۔ ایک کٹھن موت اور زندگی کا سوال اب بھی اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ کیا وہ ایسے آدمی سے پریم کر سکتی ہے جس کی عزت اس کے دل میں نہ ہو؟ اور کیا وہ ایسے آدمی کو ٹھکرا سکتی ہے، جس سے اس کو محبت ہو؟ محبت، عزت، نفرت، ایمان، بے ایمانی، بزنس، منافع ان تمام قدروں کے گورکھ دھندے میں وہ ایسی پھنسی تھی کہ اب نکلتے بن نہ پڑتا تھا۔

پر اتنے دن تک سندر سے نہ ملنے کے بعد بھی وہ اس خوفناک حقیقت سے انکار نہ کر سکتی تھی کہ وہ اب بھی سندر سے پریم کرتی ہے۔ خوفناک حد تک اس کو چاہتی ہے۔ اس کو، اس کے خوبصورت چہرے کو، اس کے جوان جسم کو، اس کے سانس کے لمس کو، اس کے لبوں کو اور اس کے بوسوں کو۔ باوجود اس کے دماغ کے فیصلے کے کہ وہ کسی ایسے آدمی سے پریم نہیں کر سکتی، جس کی وہ عزت نہ کر سکتی ہو۔ جو بے ایمان اور پیسے کا لوبھی ہو۔ اوشا کا دل پھر بھی سندر کی چاہت سے بھرپور تھا۔

بارش اور تیز ہوگئی اور کھڑکی میں سے آتی ہوئی بوچھار نے اوشا کے چہرے کو ہی نہیں اس کے جسم کو بھی بھگو دیا تھا۔ اسے سردی سے ہلکی سی جھرجھری آئی اور وہ کھڑکی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر اس بار بارش نے اس پر اوپر سے حملہ کیا۔ ایک کے بعد ایک میلے پانی کے کتنے ہی قطرے اس پر چھت سے ٹپکے۔ اس نے اوپر نظر کی تو دیکھا کہ چھت چھلنی بن چکی ہے اور دس بارہ جگہ سے ٹپک رہی ہے، دیواروں پر سیل کے دھبے بھی اب کوڑھ کے ناسوروں کی طرح بڑھتے جا رہے ہیں......

اس کی ماں گھبرا کر کبھی دیواروں کو دیکھتی تھی کبھی چھت کو۔ ''ہے بھگوان اب کیا ہوگا؟'' اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا اوشا نے مڑ کر دیکھا۔ پانی میں نہایا ہوا سندر وہاں کھڑا تھا۔ بھیگے کپڑوں میں بھی وہ کتنا اچھا لگتا تھا......اس کے گیلے بال اس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر وہی پرانی معصومیت تھی: ''اوشا، جلدی کرو، تم سب موٹر میں میرے گھر چلو۔'' اور پھر اوشا کے

ماں باپ سے مخاطب ہوکر، ''سب چیزیں چھوڑ کر آ جائیے۔ وقت بالکل نہیں ہے۔''

اور اس افراتفری میں کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ہوا کیا؟ آخر اتنی جلدی کیوں؟ خطرہ کیا ہے؟ اوشا کے ماں باپ اور بہن کو اس ٹپکتی چھت سے چھٹکارا پانے کا یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور اوشا! اس کے لیے تو یہی کافی تھا کہ سندر اس سے کہہ رہا تھا کہ میرے گھر چلو۔

بھیگتے، گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتے وہ سڑک پر موٹر تک آئے اور اب پہلی بار انھیں معلوم ہوا کہ سندر اتنی جلدی کیوں کر رہا تھا۔ خوفزدہ نگاہوں سے ان سب نے ادھر دیکھا کہ جنوب مشرق کی جانب آخری بارک تھی، مگر اب وہ بارک وہاں نہیں تھی۔ صرف ملبے کا ایک ڈھیر تھا۔ رات کے دھندلکے میں چند بدنصیب مٹی اور اینٹوں کو کرید رہے تھے اور کچھ عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں بارش کے شور کو چیرتی ہوئی آ رہی تھیں۔

''اوشا! اوشا! جلدی کرو۔ بارش میں کیوں بھیگ رہی ہو؟'' سندر کی آواز گونجی۔ مگر اوشا نے اسے نہیں سنا۔ وہ بے تحاشہ گری ہوئی بارک کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ سندر اس کے پیچھے دوڑا اور چند قدم پر پکڑ لیا۔ ''کیا پاگل ہوگئی ہو اوشا؟ یہ عمارتیں خطرناک ہیں۔ اب تمھارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔'' اوشا نے مڑ کر سندر کی طرف دیکھا مگر اسے پہچانا نہیں۔ اندھیری رات اور بارش میں اس کے خدوخال کا دھندلا خاکہ ہی نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس اندھیرے میں اوشا کو ایسا لگا جیسے پہلی بار اندھیرا دور ہوکر اسے صاف نظر آ رہا ہو۔ یہ وہ سندر نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی جسے وہ چاہتی تھی۔

اپنا بازو چھڑائی ہوئی وہ چلائی: ''مجھے چھوڑ دو۔ قاتل۔'' اور اس ایک لفظ قاتل میں سندر پر ہی نہیں، بلکہ اس کی بزنس پر، اس کی زندگی اور اس کے سماج پر سزائے موت کا حکم تھا۔ اس لمحے میں اوشا نے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس کی۔ مگر یہ اس کا دل نہیں صرف وہ دھوکے کی محبت کا بندھن تھا، جس میں اب تک اس کا دل بند تھا اور وہ اب آزاد تھی۔

سندر نے ہمدردی جتانے کی کوشش کی: ''مجھے افسوس ہے تمھارا اسکول......''

وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اوشا نے اس طرح گھور کر دیکھا کہ اس کی آواز جم کر رہ گئی...... اس نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا، مگر اس کی خاموش نگاہ کہہ رہی تھی ''یہ میرا اسکول نہیں سندر، یہ تمھارا سماج ہے۔ یہ تمھارا بزنس ہے۔ اس کی بنیادیں کھوکھلی ہیں اور اس کی چھت کی کڑیوں میں دیمک لگی ہوئی ہیں...... وہ دیکھو...... تمھارے سماج کے گھروندے گر رہے ہیں...... بچاؤ،

انھیں، سندر بچاؤ......''

دھما کے ساتھ ایک اور بارک کے کئی کمروں کی چھت گر پڑی۔ عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ پر اس بار واویلا کے ساتھ ایک نیا شور بھی تھا۔ ایک عجیب جوشیلا شور جو موسلا دھار بارش کے شور سے بھی زیادہ اونچا تھا۔

شرنارتھیوں کا گروہ اپنی بارکوں سے نکل کر بھیگتا ہوا آرہا تھا۔ وہ جلوس بنا کر چل رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ ایک عورت اپنے ننھے بچے کی لاش بازوؤں پر اٹھائے چل رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ گورنمنٹ کے وزیروں کے دروازے کھٹکھٹانے جارہے تھے۔ وہ انصاف اور آزادی طلب کررہے تھے۔ ان کی آوازوں میں غصہ تھا اور ایک نیا عزم......

اوشا نے سندر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی، جیسے بڑے راز کی بات بتا رہی ہو: ''دیکھا تم نے! کس طرح برسات میں پانی کے قطرے مل کر طوفان بن جاتے ہیں اور بڑی بڑی عمارتوں کو اکھاڑ پھینکتے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر وہ بھی اس جلوس میں شامل ہوگئی، جو طوفان میں سے گذرتا ہوا ایک نئے طوفان کی طرف جارہا تھا۔

☆☆☆

تیسرا دریا

(۱)

ایک مسافر نے دوسرے سے پوچھا: ''کیا آپ پہلی بار الہ آباد جا رہے ہیں؟'' اس نے کہا، ''جی ہاں۔''

''تو سمجھ لیجیے بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔ ایسا شہر ہندوستان میں تو کیا دنیا میں دوسرا نہیں ہے۔ اہاہا، کیا بات ہے صاحب الہ آباد کی۔''

وہ جو ریلوے میں بکنگ کلرک تھا اور مئو ناتھ بھنجن سے بدلی ہو کر الہ آباد جا رہا تھا اس نے بڑی سادگی اور معصومیت سے سوال کیا:

''کیوں بھائی صاحب! الہ آباد کی کون کون سی چیزیں مشہور ہیں؟''

اور وہ جو دراصل الہ آباد کا نہیں بلکہ کرچھنا کا رہنے والا تھا اور مہینے میں ایک دو بار پیشہ ور گواہ کی حیثیت سے ہائی کورٹ کے مقدموں میں گواہی دینے وہاں جاتا تھا (اور ججوں اور وکیلوں کو بیوقوف بنا کر روزی کماتا تھا اور اس لیے اپنے آرٹ کی پریکٹس ہر وقت جاری رکھتا تھا) فوراً چمک کر بولا: ''ارے اب تم کو کیا کیا چیز گنوائیں۔ ہمارے مشہور شاعر جو گزرے ہیں ان کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا، امرود الہ آبادی۔''

بیچارا بکنگ کلرک (جس کو بس اتنا معلوم تھا کہ مئو ناتھ بھنجن سے نیلو کھیڑی کا کرایہ اتنالیس روپے پچیس نئے پیسے ہے) جھجکتے ہوئے بولا، ''جی ہاں نام تو سنا ہے۔''

اور پیشہ ور گواہ نے اپنے مذاق کی کامیابی پر آپ ہی آپ ہنس کر کہا ''ویسے الہ آباد کے اکبر بھی مشہور ہیں...... آج کل ان کا موسم بھی ہے۔ نمک مرچ لگا کر کھائیے، ہونٹ چاٹتے رہ جائیے گا۔''

بکنگ کلرک نے سوچا ایسا قابل اور سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی پھر ملے نہ ملے۔ اس ملاقات

سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

''کیوں بھائی صاحب!'' اس نے پوچھا، ''الٰہ باد کی خاص پیداوار کیا ہے؟''

الٰہ آباد کی سب سے مشہور پیداوار ہیں لیڈر۔'' پیشہ ور گواہ نے جواب دیا: ''ماہرین زراعت کا کہنا ہے کہ یہاں کا پانی اور یہاں کی زمین لیڈری کے لیے نہایت زرخیز ہے۔ بعض موسموں میں تو امرود مہنگے ہوتے ہیں اور لیڈر سستے۔''

بکنگ کلرک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''جی کون وہ امرود الٰہ آبادی؟''

کرچھنا والے نے اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے بات بنائی، ''بات یہ ہے کہ یہ پھل جنھیں اب امرود کہتے ہیں، پہلے انھیں کٹھل وڈل کہتے تھے۔ لیکن کیونکہ ہمارے امرود الٰہ آبادی کو یہ پھل نہایت مرغوب تھا ایسے ہی جیسے مرزا غالب کو آم پسند تھا۔ تو ان کے نام پر اس پھل کا نام بھی امرود پڑ گیا۔'' اور پھر جلدی سے اس نے امرود کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:

''ہاں تو میں آپ کو الٰہ آباد کے بارے میں بتا رہا تھا۔ لیڈروں کے علاوہ یہاں وکیل بھی بہت پیدا ہوتے ہیں۔ برسات میں تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک پتھر کو اٹھایئے تو نیچے سے تین چار وکیل کلبلاتے ہوئے نکل آتے ہیں۔ مگر ان دنوں پبلشروں کی گنتی وکیلوں سے بھی بڑھ گئی ہے۔ کہتے ہیں تیسری پنچ ورشی یوجنا کے ختم ہونے تک الٰہ آباد میں پبلشروں کی تعداد کتاب پڑھنے والوں سے بڑھ جائے گی۔''

بکنگ کلرک نے علم کے اس سمندر میں غوطہ کھاتے ہوئے عاجزی سے اقرار کیا، ''جی میں کتاب نہیں پڑھتا، کیا کروں صاحب، وقت ہی نہیں ملتا۔ سات بچے ہیں۔''

''سات بچے ہیں تو ظاہر ہے آپ دن رات مصروف رہتے ہوں گے۔ مگر کوئی بات نہیں الٰہ آباد بچوں کی تعلیم کے لیے بہترین جگہ ہے۔''

مگر وہ جو مئو ناتھ بھنجن سے آ رہا تھا، اس کو کوئی اور ہی دھن تھی۔ بولا ''کیوں جی، سنگم بھی تو الٰہ آباد ہی میں ہے نا؟''

''سنگم؟'' اہاہا، سنگم کی کیا بات ہے۔ وہ تو بیکنٹھ کا دوار ہے، وہاں آپ ضرور جایئے گا۔ مگر اشنان کیجیے گا کنارے پر۔ بیچ میں جہاں گنگا جی اور جمنا جی دونوں کے دھارے ملتے ہیں وہاں تین ہاتھی ڈباؤ پانی ہے۔ بڑے بڑے تیراک وہاں ڈوب گئے ہیں۔''

اور سنگم کا ذکر سن کر وہ جو ایک کونے میں بیٹھا تھا، جو اندھا نہیں تھا مگر اس وقت کچھ دیکھ نہیں

رہا تھا، بہرا نہیں تھا مگر اس وقت کچھ سن نہیں رہا تھا، جو نوجوان تھا مگر جس کے چہرے پر صدیوں کے غم کی لکیریں تھیں، وہ دفعتاً چونک پڑا، ''جی، کوئی سنگم کا ذکر کر رہا تھا؟''

''جی ہاں میں کہہ رہا تھا کہ سنگم پر پانی بہت گہرا ہے۔''

نوجوان جس کی آواز صدیوں کے دکھ سے بوجھل تھی، بولا، ''میں جانتا ہوں۔'' مگر نوجوان لوگ آج کل کب تیرتھ اسنان گیان کی بات سوچتے ہیں۔ تم بھلا سنگم کیوں جانے لگے؟''

اور نوجوان نے نہ جانے کیا سوچتے ہوئے نہ جانے کس سے کہا، ''میں وہیں جانے کے لیے آیا ہوں۔''

''تو بھیا سنبھل کے جانا اور سویرے جانا نہیں تو ناؤ کے لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی۔''

اور اس نوجوان نے کہا ایسی آواز میں جو لگتا تھا دکھ کے گہرے اندھے کنویں میں سے آ رہی ہے، ''میں وہاں سے واپس نہیں آؤں گا۔''

پیشہ ور گواہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پٹریاں بدلتے ہوئے ٹرین نے ایک جھٹکا کھایا اور کسی نے چلا کر کہا، ''ارے او گنگوا، بستر الپیٹ جلدی سے۔ الہ آباد آ گیا۔''

یہ سن کر ٹرین میں بیٹھے ہوئے ایک شاعر نے فی البدیہہ مصرع کہا۔

''الہ آباد آ گیا اے دوست۔''

اور ایک دوسرے شاعر نے جو اس کے ساتھ سفر کر رہا تھا گرہ لگائی۔

پھر کوئی یاد آ گیا اے دوست۔

(۲)

یاد سے کوئی چھٹکارا نہیں، نوجوان نے سوچا، یہ ظالم یاد میری جان لے کے رہے گی۔

پٹریاں بدلتی، جھٹکے کھاتی اور مسافروں کو جھٹکے کھلاتی ٹرین الہ آباد کے اسٹیشن کی طرف دوڑ رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اس کی یاد جھٹکے دیتی اسے ماضی کی طرف لے جا رہی تھی۔

ٹرین کو پلیٹ فارم تک پہنچ کر رکنے میں مشکل سے ڈیڑھ منٹ لگا ہوگا مگر اتنی دیر میں اس کی یاد زندگی کی نہ جانے کتنی پٹریاں بدلتی، کتنے اسٹیشنوں سے گزرتی، کتنی جھلکیاں دکھاتی ہوئی پھر اسے الہ آباد جنکشن کے پلیٹ فارم نمبر پانچ پر واپس لے آئی۔

ماضی کے اندھیرے میں دو چمکتی مسکراتی ہوئی کالی آنکھیں، سمترا کی آنکھیں دو اور آنکھیں، چھوٹی چھوٹی بے نور پیلی آنکھیں، مینڈک کی آنکھیں جو کلوروفام کے اثر سے بے ہوش لکڑی کے تختے پر پڑا تھا اور وہ اور سمترا دونوں مل کر زولوجی کلاس میں اس کی چیر پھاڑ کر رہے تھے۔

تب وہ دونوں لکھنؤ کرسچن کالج میں انٹر میڈیٹ کے میڈیکل کورس کے لیے پڑھ رہے تھے۔ مینڈک چیرتے ہوئے اس نے سمترا سے پوچھا تھا ''مس ماتھر! آپ کو اس مینڈک سے ڈر نہیں لگتا؟''

اور سمترا نے جواب دیا تھا، ''مسٹر رمیش چندر! مینڈک بیچارہ بے ہوش ہے۔، مجھے تو صرف دو ٹانگ کے بندروں سے ڈر لگتا ہے۔''

پھر کئی ہفتے تک اس کو سمترا سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مغرور اور بد دماغ لڑکی سے میں اب کبھی بات نہیں کروں گا۔ یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟ (اس نے سوچا تھا) مانا کہ وہ ہائی کورٹ کے ایک جج کی بیٹی ہے، مانا کہ وہ ایک لمبی چوڑی موٹر میں بیٹھ کر کالج جاتی ہے اور جتنے روپے کے اسکالرشپ میں میں ہاسٹل میں گزارا کرتا ہوں اتنا روپیہ تو وہ اپنے کتوں پر خرچ کر دیتی ہے۔ لیکن میں بھی تو کوئی ایسا ویسا نہیں ہوں۔ پتا جی کانپور کے ایک چھوٹے موٹے وکیل ہی ہیں تو کیا۔ میں نے میٹرک فرسٹ کلاس میں پاس کیا ہے۔ سارے یوپی میں تیسرے نمبر پر آ کر اسکالرشپ حاصل کیا ہے۔ چند سال میں میں تو ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ مس ماتھر تو نہ جانے میڈیکل کالج میں کتنے برس گدا کھائیں گی۔ ایک تو جاہل اوپر سے بد دماغ۔ مگر (اس نے بے اختیار سوچا تھا) کمبخت کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں۔

اور پھر جب انٹر میڈیٹ کے امتحان قریب آ رہے تھے، سمترا نے ایک دن اس سے کہا تھا، ''مسٹر رمیش چندر! اگر تکلیف نہ ہو تو مجھے سائنس کا کورس Revise کروا دیجیے۔''

اب رمیش کی بن آئی تھی اور اس نے کہا تھا، ''آپ کو پڑھنے لکھنے کی فکر ہے، مس ماتھر؟ آپ تو ویسے ہی ہم سب کو خرید سکتی ہیں۔''

اور سمترا نے کہا تھا، ''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں فیل ہو جاؤں؟'' اور اس کے انداز میں اتنی لجاجت اور عاجزی اور لاچاری تھی کہ رمیش کا دل پسیج گیا تھا اور اس نے وعدہ کر لیا تھا، ''اچھا تو کل سے ہر شام ساڑھے پانچ بجے میں آپ کے ہاں آ جایا کروں گا۔''

پھر دوست بن گئے تھے۔ ساتھ ہی دونوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔

فرسٹ ایر کا امتحان دے کر کالج کے دوسرے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ وہ لکھنؤ گئے تھے اور لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے وہ سب آگرہ گئے تھے اور تاج محل کے سامنے سمترا نے کہا تھا، ''ہائے رام! شاہ جہاں کو اپنی ممتاز سے کتنا پریم رہا ہوگا جو ایسا خوبصورت مقبرہ بنوا دیا۔'' اور رمیش نے ساحر کی نظم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا، ''میرا بس چلے تو اس مقبرے کو ہسپتال بنا دوں۔ کئی سو بیڈ کی جگہ نکل ہی آئے گی۔'' اس پر ایک لڑکے نے جو سمترا کی وجہ سے رمیش سے جلتا تھا کہا تھا، ''یار! ہسپتال تو اب بھی یہ ہے، مگر یہاں صرف دل کے بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔ تم اور سمترا ابھی یہاں داخلہ کروالو۔'' اور رمیش نے اس لڑکے کو گریبان سے پکڑ لیا تھا اور گھونسا دکھاتے ہوئے کہا تھا، ''خبردار جو اب کبھی اس قسم کی فقرے بازی کی۔ نہیں تو منہ توڑ دوں گا۔''

سیکنڈ ایر میں تھے وہ لوگ۔ کرسمس کی چھٹیوں میں بنارس اور سارناتھ گئے تھے اور وشوناتھ کے مندر سے لوٹ کر سمترا نے رمیش سے کہا تھا، ''میں نے تمھارے لیے پرارتھنا کی ہے۔ تم ایک بہت بڑے ڈاکٹر بن جاؤ۔'' اور رمیش نے کہا تھا، ''بس اتنی سی بات کے لیے بھگوان کو کشٹ دیا۔ میں پرارتھنا کرتا تو اور ہی مانگتا۔''

''کیا مانگتے؟''

''یہ اپنے دل سے پوچھو سمترا۔''

اور یہ سن کر وہ شرما گئی تھی اور اس کے گال تمتما اٹھے تھے اور وہاں سے بھاگ کر دوسری لڑکیوں کے گروہ میں جا ملی تھی۔

وہ تھرڈ ایر میں تھے تو رمیش نے ایک بار سوچا میں اپنے دل کی بات سمترا سے کہہ دوں۔ اس کے ماتا پتا کہیں اور اس کی سگائی نہ کر دیں۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ جب تک پڑھائی ختم کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائے، شادی کا خیال ہی نہیں کر سکتا۔ ایک بار اظہار محبت کر دیا اور سمترا نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ان کی دوستی بھی کہیں ختم نہ ہو جائے اور اس وقت وہ دوستی ہی تو اس کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھی۔

اور پھر اس سال وہ لوگ بھارت درشن کو نکلے تو دہلی گئے۔ لال قلعہ دیکھا، شاہ جہاں کی بنائی ہوئی شاندار مسجد، دریا کے کنارے گاندھی جی کی سمادھی، نئی دہلی میں راشٹر پتی بھون اور سکریٹریٹ اور برلا مندر اور پھر شہر کے باہر ہمایوں کا مقبرہ اور فیروز شاہ کا قلعہ اور پھر قطب مینار۔ وہیں سمراٹ اشوک کے زمانے کی بنی ہوئی لوہے کی لاٹھ بھی کھڑی ہے۔ گائڈ نے بتایا کہ جو کوئی اس لاٹھ کے

گرد اپنے بازوؤں سے حلقہ کر کے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ملا دے گا، اس کے من کی ہر مراد پوری ہو جائے گی۔

سب لڑکے لڑکیاں ہنس ہنس کر لوہے کی لاٹھ سے گلے ملنے لگے۔ سمترا نے کہا، ''رمیش! تم بھی اپنی قسمت آزمانا۔'' وہ ایک بار لاٹھ کی طرف بڑھا اور پھر جھجک کر رک گیا۔

''نہیں سمترا، میں نہیں جاننا چاہتا کہ میرے دل کی مراد پوری ہو گی یا نہیں۔ مجھے اپنے مستقبل سے ڈر لگتا ہے۔ ابھی کم سے کم امید تو ہے۔''

''چلو قطب مینار پر چڑھیں۔'' سمترا نے کہا۔

''مگر یہ شرط ہے کہ ایک سانس میں۔''

وہ مینار پر چڑھنے کے لیے دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ ایک دربان نے روک دیا، ''ٹھہریئے، دو چار آدمی آجائیں تب آپ جا سکتے ہیں۔''

اتنے میں ان کے ہی کئی اور ساتھی آگئے اور ان لوگوں کو مینار پر چڑھنے کی اجازت مل گئی اور وہ دونوں تیز تیز سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سب سے آگے نکل گئے۔

مینار کی پہلی منزل کی گیلری سے نیچے جھانکتے ہوئے سمترا نے پوچھا، ''یہ دربان ہمیں کیوں روک رہا تھا؟''

رمیش نے ہنس کر کہا، ''اسے ڈر تھا کہ ہم اکیلے اوپر جا کر کہیں خودکشی نہ کرلیں۔''

مینار کی چوٹی پر وہ پہنچے تو ہوا اتنے زور کی چل رہی تھی کہ سمترا کے بال پریشان ہو گئے اور اس کی ساڑی کا آنچل پرچم کی طرح لہرانے لگا اور رمیش کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی ہیٹ سنبھالنی پڑی۔ نیچے جھک کر انھوں نے دیکھا تو چلتے پھرتے آدمی گڑیوں جیسے لگے اور آتی جاتی بسیں اور موٹریں کھلونوں کی طرح۔

ایک لمبا سوکھا پچکے گالوں اور پیلی رنگت والا ادھیڑ عمر کا آدمی جو وہاں چپ چاپ کھڑا تھا نہ جانے کب سے آسمان کو تک رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر گھبرا سا گیا اور جلدی سے نیچے اتر گیا۔ اس تنگ گول کنویں جیسی برجی میں جب وہ ان کے پاس سے گزرا تو انھوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھ لال ہیں۔ نہ جانے شراب کے اثر سے یا رونے سے اور اس کے چہرے پر ایک عجیب مایوسی چھائی ہوئی ہے، جیسے وہ زندگی کی آخری حدوں کو پار کر چکا ہو۔

سمترا کا بدن ایک جھرجھری سے کانپ اٹھا۔

''کیا ہوا؟'' رمیش نے پوچھا، ''سردی لگ رہی ہے کیا؟''

''نہیں، مگر اس آدمی کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔ کون جانے ہم لوگ اس وقت یہاں نہ آتے تو وہ کیا کر بیٹھتا۔''

''کیا کرتا، جیسے اور کتنے ہی لوگوں نے کیا ہے۔ یہاں سے کود کر خودکشی کر لیتا۔''

''رام رام۔ اتنے اوپر سے گرتا تو ہڈی پسلی کا سرمہ بن جاتا۔ ایسی بھیانک موت بھی نہ ہو کسی کی۔''

رمیش نے ہنس کر کہا، ''اچھا ہوا تم نے مجھے بتا دیا سمترا۔ اگر میں نے کبھی خودکشی کی تو قطب مینار سے نہیں کودوں گا۔ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔''

''ایسی اشبھ باتیں زبان سے نہ نکالو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''سچ سمترا؟''

ابھی وہ جواب دینے نہ پائی تھی کہ ان کے باقی ساتھی ہانپتے کانپتے وہاں پہنچ گئے اور ایک نے چلا کر کہا، ''ارے تم دونوں یہاں چھپے ہوئے ہو۔ ہم تو ڈر رہے تھے کہیں رمیش نے مینار کی چوٹی سے چھلانگ نہ لگا دی ہو۔''

اور پھر چند مہینے بعد ان کے کالج سے بہت سے طالب علم یوتھ فیسٹول کے سلسلے میں الہ آباد آگئے تھے، اور وہاں انھوں نے آنند بھون دیکھا تھا اور سوراج بھون اور یونیورسٹی کی عمارتیں اور دریا کے کنارے وہ ریت کا میدان جہاں کمبھ میلہ لگتا ہے اور جہاں پچھلے کمبھ کے ہنگامے میں سیکڑوں آدمی مارے گئے تھے، اور پھر کشتیوں میں بیٹھ کر وہ سنگم تک گئے تھے، جہاں گنگا اور جمنا کے دھارے مل رہے تھے۔ گنگا کا دھارا جو میدان کی مٹی سمیٹ کر لایا تھا گدلے مٹیالے پانی کا تھا اور میلوں تک یہ دھارے ساتھ ساتھ مگر الگ الگ بہہ رہے تھے اور ان کے ایک بوڑھے پروفیسر کہہ رہے تھے کہ پریم کا جیون سنگم بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ دو ہستیاں اپنی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے بھی ساتھ بہتی جائیں، رہتی جائیں۔

بے اختیار رمیش نے سمترا کی طرف دیکھا تھا جو پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور خاموشی کے دھارے پر بہتے ہوئے ان کے خیالات اور جذبات ایک ان دیکھے سنگم پر مل کر آگے بڑھ گئے۔ کسی بہت ہی طوفانی سمندر کی طرف۔

دور سورج ڈوب رہا تھا۔ پانی میں آگ لگی ہوئی تھی اور خون کے رنگ کا ایک تیسرا دریا بھی

سنگم میں آ کر مل رہا تھا۔

ان کے گائیڈ نے بتایا کہ پرانی روایات کے مطابق سنگم گنگا اور جمنا دو دریاؤں کا ہی نہیں ہے، تین دریاؤں کا ملاپ ہے۔ مگر تیسرا دریا سرسوتی، زمین کے اندر غائب ہو گیا ہے اور اس لیے نظر نہیں آتا۔

پروفیسر نے کہا، ''یہ سب قصہ کہانی ہے۔''

رمیش نے کشتی کے کنارے پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ پر کسی کے نرم ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ مگر اس کو سمترا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دھیرے سے اس نے کہا ''سنگم دو دھاروں کا ملاپ، زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بس یہی ہے۔''

''اور تیسرا دریا؟'' سمترا نے پوچھا۔

''تیسرا دریا جیسا پروفیسر صاحب نے ابھی کہا، قصہ کہانی ہے، وہم اور ڈھونگ ہے۔''

اب ان کی کشتی سنگم کے بیچوں بیچ تھی۔ آدھی گنگا میں آدھی جمنا میں۔ عین اس جگہ جہاں دو دھارے مل رہے تھے اور کشتی چلانے والا کہہ رہا تھا ''بابو! جرا سنبھل کے بیٹھو۔ تین ہاتھی ڈباؤ پانی ہے یہاں۔ پرسوں ہی کسی نے یہاں آتم ہتیا کی ہے۔ اس کا بھی پتہ نہیں چلا۔''

اور نہ جانے کیوں سمترا نے کہا۔ کشتی بان سے یا اپنے آپ سے یا رمیش سے ''ہائے کتنی شانت اور سندر جگہ جان دی ہے بیچارے نے۔''

اور اب وہ کشتی میں تھا اور کشتی گنگا کے دھارے میں تھی اور اس دھارے کے ساتھ ساتھ سنگم کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں کشتی سنگم کے بھنور میں ہوگی جہاں تین ہاتھی ڈباؤ پانی ہے اور پھر وہ کشتی بان کی نظر بچا کر چپکے سے پانی میں کود پڑے گا۔ عین اس جگہ جہاں گنگا جمنا کا امر ملاپ ہوتا ہے۔ مگر جہاں رمیش اور سمترا کی زندگیوں کا سنگم نہ بن سکا۔ عین اس جگہ جہاں سمترا نے کہا تھا، ''ہائے کتنی شانت اور سندر جگہ جان دی ہے بیچارے نے۔''

زندگی اور موت کے اس سنگم تک پہنچنے کے لیے اسے کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا۔

وہ فورتھ ایر میں تھا اور اس کے پروفیسروں کا کہنا تھا کہ سارے کالج میں کسی طالب علم کا ہاتھ سرجری کی چیر پھاڑ میں اتنا صاف نہیں ہے جتنا رمیش کا۔ سمترا اکثر کہتی، ''رمیش! تم سرجن بن کر ایک ایک آپریشن کے دو دو تین تین ہزار لیا کرنا۔ مگر پریکٹس کہاں کرو گے؟ کانپور یا لکھنؤ میں؟ اور رمیش ہنس کر کہتا، ''الہ آباد میں۔ اگر پریکٹس نہ چلی اور کوئی خطرناک آپریشن ناکامیاب ہو گیا تو

سنگم قریب ہی ہے، ڈوب مرنے کے لیے۔'' پھر سمترا ہنس کر اسے چڑاتی، ''شریف آدمی کو تو چلو بھر پانی ہی کافی ہے'' اور رمیش اس کا جواب دیتا، ''مگر مشکل یہ ہے سمترا کہ میں شریف آدمی نہیں ہوں۔ مجھ جیسے بے حیا کو ڈوبنے کے لیے سنگم کا تین ہاتھی ڈباؤ پانی چاہیے۔''

ابھی وہ امتحان کی تیاری کر ہی رہا تھا، صرف فیس بھرنے کے لیے گھر سے منی آرڈر کا انتظار تھا کہ کانپور سے ان کے ایک پڑوسی کا تار آیا کہ اس کے باپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ فوراً ایس۔ ٹی کی بس میں گھر پہنچا تو دیکھا باپ کی حالت نازک ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے ٹائیفائڈ تجویز کیا ہے۔ لیکن رمیش نے خود معائنہ کیا تو معلوم ہوا ساتھ میں ہائی بلڈ پریشر بھی ہے اور دل کی حرکت تشویش ناک ہے۔ رمیش کی ماں اس کے بچپن ہی میں مرگئی تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ گھر میں دیکھ بھال کرنے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ رمیش کو اپنے امتحان کا خیال چھوڑ کر باپ کی تیمارداری کرنی پڑی۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ باپ اس کو میڈیکل کالج میں پڑھانے کے لیے خود کتنی تنگی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ تین مہینے سے بیماری کے کارن وکالت تو بند ہی تھی۔ تھوڑی بہت پونجی جو تھی علاج میں خرچ ہو چکی تھی۔ مہنگی دوائیں جو رمیش خود تجویز کرتا تھا، ان کو خریدنے کے لیے گھر میں پیسے نہیں تھے۔ جیسے بھی ہوا وہ بیمار باپ کی دیکھ بھال کرتا اور آخر ایک دن آیا جب اسے باپ کے منہ میں دوا کے بجائے گنگا جل کے قطرے ٹپکانے پڑے۔ یہ وہی دن تھا جب اس کا فورتھ ایر کا امتحان شروع ہو رہا تھا۔

اور سو رمیش کی دنیا بدل گئی۔ دو ہزار روپے فی آپریشن فیس لینے والے سرجن بننے کی بجائے وہ بیکار ہو گیا۔ اس کے ساتھی فورتھ سے فائنل ایر میں پہنچ کر ڈاکٹر بننے کی تیاری کرنے لگے اور رمیش کانپور کے ایک ہسپتال میں کمپاؤنڈری کی نوکری کرنے پر مجبور ہو گیا۔ باپ کے انتقال پر اس کو کئی اور دوستوں اور پروفیسروں کے خطوط کے ساتھ سمترا کا خط بھی ملا تھا، ''ڈیئر رمیش! مجھے تمھارے پتاجی کے سورگباش ہونے کی خبر سے بڑا دکھ ہوا۔ افسوس ہے کہ اس وجہ سے تم امتحان بھی نہ دے سکے۔ میں تم سے ملنے کانپور آتی مگر امتحان ہو رہے ہیں۔ تم کب لکھنؤ آؤ گے؟ اور اب کیا پروگرام ہے؟ تمھاری شبھ چنتک، سمترا''۔

اور اس خط کی ٹھنڈی راکھ میں رمیش محبت کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کو کریدتا رہا تھا۔ نہیں، (اس نے سوچا تھا) خط میں بے چاری اپنا پورا حال کیسے بتا سکتی ہے۔ شریف لڑکی اپنے جذبات کا اعلان کرتی تھوڑا ہی پھرتی ہے۔

اور سواس نے سمترا کو بڑا پیار بھرا خط لکھا تھا:

''پتا جی کے دیہانت کے بعد آج تمھیں خط لکھتے سمے میں پہلی بار اپنا دل ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں تمھارے خط نے مجھے اس دکھ بھرے وقت میں کتنی ڈھارس دی ہے۔ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ تم میرے پاس ہو سمترا۔ اس سال میں امتحان نہیں دے سکا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ اگلے سال میں پھر داخلہ لوں گا۔ ڈاکٹر بنوں گا۔ ہندوستان کا بہترین سرجن بنوں گا جیسا تم چاہتی تھیں۔ کیا تم میرا انتظار کرو گی سمترا؟''

مگر اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا تھا اور رمیش نے دل کو بہلا لیا کہ سمترا امتحان میں مصروف ہے۔

جب تک امتحان ہوتے رہے وہ لکھنؤ نہیں گیا۔ جب آخری پیپر ہو چکا تو وہ اپنی چھٹی کے دن دلی سے لکھنؤ پہنچا۔ وہ صرف تین مہینے کے بعد کانپور سے لوٹا تھا۔ لیکن اتنے عرصے میں ہی ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لکھنؤ میں بالکل اجنبی ہو۔ جیسے پہلی بار وہ چار باغ پر اترا ہو۔ پہلی بار سائیکل رکشا میں سوار ہو کر حضرت گنج کے بارونق ہنگامے سے گزر رہا ہو۔ پہلی بار کارلٹن ہوٹل کی سڑک سے گزر کر موتی رام ماتھر روڈ پر سمترا کے پتا کی کوٹھی لکشمی گنج کے سامنے اترا ہو۔

برساتی میں جج صاحب کی چمکتی ہوئی لمبی چوڑی موٹر کھڑی تھی، جس کے سامنے لگے ہوئے لیمپ اتنے چمک رہے تھے کہ ان میں رمیش کو اپنی صورت جھانکتی ہوئی نظر آئی اور دفعتاً اس کے اس احساس کی چوٹ پڑی کہ اس کے جوتوں پر دھول کی تہہ چڑھی ہوئی ہے اور اس کے گھر کے دھلے ہوئے کپڑوں پر استری نہیں کی گئی اور شاید اس کی قمیص کا کالر ادھڑا ہوا ہے۔ گھبرا کر اس نے جیب سے اپنا ملگجا سا رومال نکالا۔ جوتا جھاڑنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے چہرے پر بہتا ہوا پسینہ محسوس ہوا اور پہلے اس نے رومال سے منہ پونچھا اور پھر اس سے جوتا صاف کیا، سامنے دروازے کی گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا، اس کو بجانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ اندر ڈرائنگ روم سے سمترا اور اس کے سہیلیوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ایک لڑکی کہہ رہی تھی، ''سمترا اب تو تمھارا امتحان بھی ہو گیا اور دو چار روز میں تم مسوری چلی جاؤ گی۔ ان دنوں میں ایک دن اپنے کالج کے دوستوں کی پارٹی ہو جائے، سمترا نے جواب دیا، ''ضرور، ضرور آ ؤ لسٹ بنالیں۔ اے کشوری، ذرا لے تو کاغذ پنسل۔''

یہ سن کر رمیش کا ہاتھ گھنٹی کے بٹن پر پڑتے پڑتے رک گیا۔

اندر دعوت کے مہمان کی فہرست بنائی جا رہی تھی۔

رام چندر۔
کنور برجیندر سنگھ
سلمہ بلگرامی
رما بینر جی
اوشا پنڈت
پرمیلا ٹھاکر
للی لوتھر

وہ سب اس کے کلاس فیلو تھے۔اس کے دوست تھے۔کبھی ایسے ناموں کی فہرست میں اس کا نام سب سے پہلے لکھا جاتا تھا۔ اور اب سب نام لیے جا چکے تو کسی نے کہا، ''سمترا! اپنے دوست کو نہیں بلاؤ گی؟''

''کون؟'' سمترا کی آواز ایسے آئی جیسے اس نے یہ نام پہلی بار سنا ہو، ''اوہ...... وہ...... رمیش...... اس نے کالج چھوڑ دیا ہے۔کانپور میں رہتا ہے شاید۔''

''تو کانپور کون سا دور ہے۔'' اس کی ایک سہیلی نے کہا، ''آج خط لکھو کل مل جائے گا۔نہیں تو تار دے دیتے ہیں۔رمیش ہوگا تو ذرا دلچسپی رہے گی۔''

''چھوڑو بھی۔'' سمترا کی آواز آئی اور اس کی ٹھنڈی روکھی آواز رمیش کو ایسی لگی جیسے ہائی کورٹ کا جج موت کا فیصلہ سنا رہا ہو۔ وہ کہہ رہی تھی، ''چھوڑو بھئی، سنا ہے اس نے کانپور کے کسی ہسپتال میں نوکری کر لی ہے۔''

''ارے واہ! فورتھ ایر کا امتحان بھی نہیں دیا اور رمیش ڈاکٹر بھی بن گیا۔''

''ڈاکٹر نہیں کمپاؤنڈر ہو گیا ہے۔''

''نہیں نہیں۔یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ رمیش جیسا قابل لڑکا اور کمپاؤنڈری کر رہا ہو۔کسی نے یوں ہی گپ چھوڑی ہوگی۔''

اور سمترا کی آواز آئی۔ ''گپ نہیں ہے بھئی۔ مجھے معلوم ہے، مگر اب اس رمیش کا ذکر چھوڑو نا۔''

اس کی ایک سہیلی نے چھیڑا، ''آج اس کے نام سے اتنی چڑ کیوں رہی ہو سمترا؟ کبھی تو اس

سے ملے بنا چین نہیں پڑتا تھا۔ ہم تو سمجھتے تھے تم دونوں کی شادی ہونے والی ہے، سچ کہتی ہوں جوڑی بڑی اچھی رہتی۔''

''کشوری!'' سمترا کی آواز اتنے زور سے گونجی کہ سیڑھیوں پر کھڑا ہوا رمیش سناٹے میں آ گیا، ''کشوری! مجھے ایسا مذاق بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کیا دنیا میں سارے لڑکے مر گئے ہیں کہ اس کمپاؤنڈر کا نام لے کر مجھے چھیڑا جاتا ہے۔''

اور اس کے بعد ایک ایسا طوفانی سنگیت رمیش کے کانوں میں گونجا کہ وہ کچھ نہیں سن سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور ان آنسوؤں کے شیشے میں سے ہر چیز دھندلی نظر آئی جیسے ایک دم ساری دنیا پر ایک گہری دھند چھا گئی ہو۔

''اے!'' ایک کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔ سامنے ایک بیرا کھڑا دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ ''کیا چاہیے؟''

''کیا چاہیے؟'' رمیش نے دہرایا اور کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے چلا آیا۔

''کیا چاہیے؟'' گرمیوں کی دوپہر میں سنسان سڑک پر اس کے پیروں کی آہٹ نے سوال کیا:

''کیا چاہیے؟'' دور جاتے ہوئے ایک اکے کے پہیوں کی کھڑ کھڑ نے سوال کیا۔

''کیا چاہیے؟'' چھتر منزل کے سنہری کلس نے اس سے سوال کیا۔

''کیا چاہیے؟'' سامنے بہتی ہوئی گومتی کی لہروں نے اس سے سوال کیا۔

''کیا چاہیے؟'' کنارے کھڑی ہوئی ۱۸۵۷ کے شہیدوں کی یادگار نے اپنی خاموش زبان سے سوال کیا؟۔

''مجھے سمترا کی محبت چاہیے۔'' اس کے دل کی دھڑکن نے جواب دیا، ''مجھے اتنا روپیہ چاہیے کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ ڈاکٹر بن سکوں۔ سرجن بن کر ایک آپریشن کے دو ہزار روپے لے سکوں۔ مجھے ایک بنگلہ اور موٹر چاہیے۔ اتنی لمبی اور شاندار موٹر جیسی سمترا کے پتاجی کی ہے اور یہ سب مجھے اس لیے چاہیے کہ مجھے سمترا کی محبت چاہیے۔''۔

''یہ سب تمھیں نہیں مل سکتا۔'' سڑک پر اُڑتے ہوئے بگولوں نے جواب دیا۔

''یہ سب تمھیں نہیں مل سکتا۔'' حضرت گنج میں سجی ہوئی دکان نے اسے جواب دیا۔

''یہ سب تمھیں نہیں مل سکتا۔'' خطرناک رفتار پر اس کے پاس سے گزرتی ہوئی ایک موٹر

کے کرخت ہارن نے جواب دیا۔

''یہ سب تمھیں نہیں مل سکتا۔'' ریلوے لائن پر شنٹنگ کرتے ہوئے انجن نے جواب دیا، ''اور بولو تمھیں کیا چاہیے؟''

اور اس کے دل کی دھڑکن نے خاموشی سے چلا کر کہا، ''اگر مجھے سمترا کی محبت نہیں مل سکتی تو مجھے زندگی نہیں چاہیے، موت چاہیے۔''

اور سڑک پر اڑتے بگولے ہنس پڑے۔

سنسناتی ہوئی لُو گانے لگی۔

رمیش کی اپنی رگوں میں گردش کرتا ہوا خون ناچنے لگا۔

اس کے شعور میں قطب مینار کی چوٹی ابھرنے لگی، گومتی کی لہریں لہرا لہرا کر اسے بلانے لگیں۔ اس کی زبان پر سائنائڈ کی انجانی لذت گدگدانے لگی۔ کتنی ہی تیز رفتار ریلیں، دھڑ دھڑاتی ہوئی اس کی زندگی کا سرمہ پیستی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئیں اور پھر دفعتاً یہ سارا شور خاموش ہو گیا۔ اس کی نظر میں دور تک پانی ہی پانی چھا گیا۔ گہرا شانت اتھاہ پانی، جو دو دھاروں میں کٹا ہوا تھا۔ ایک نیلے پانی کا دھارا اور دوسرا مٹیالے پانی کا اور اس کا دل ایک خوبصورت اور خطرناک لے پر دھڑکنے لگا۔

سنگم!

سنگم!!

سنگم!!!

اب کشتی سے سنگم تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔

ایک زندگی کا دریا ہے۔ رمیش نے سوچا، جو پہاڑوں چٹانوں سے ٹکراتا، الجھتا، شور مچاتا آتا ہے، ایک موت کا دریا ہے، جو شانتی سے بہتا ہے، بہتا رہا ہے اور بہتا رہے گا۔ ان دونوں کے سنگم پر ایک بلبلہ ابھرتا ہے اور پھر پھوٹ جاتا ہے اور اس بلبلے کا نام انسان ہے، جو سر اٹھا کر آسمان سے باتیں کرنا چاہتا ہے، ہزاروں ٹن بھاری ایٹم بم اپنے کندھے پر رکھ کر دوسرے انسانوں کو...... دوسرے بلبلوں کو...... موت سے ڈرانا چاہتا ہے۔

زندگی کیا ہے؟ اس نے سوچا۔ زندگی ماں کی نرم گرم گود ہے جو اس سے بچپن ہی میں چھٹ گئی۔ زندگی باپ کی پیار بھری ڈانٹ ہے جو اب وہ کبھی نہیں سن سکے گا۔ زندگی کانپور کا وہ اسکول

ہے جہاں وہ اور اس کے ساتھی کتابیں پڑھنے سے زیادہ وقت لٹو گھمانے میں صرف کیا کرتے تھے۔ زندگی گھومتا ہوا لٹو ہے، زندگی فزکس کا فارمولا ہے، زندگی ڈسکٹنگ بورڈ پر تڑپتا ہوا مینڈک ہے، زندگی سمترا کی آنکھیں ہیں، زندگی سمترا کی دھیمی آواز ہے، جو دنیا کے ہر راگ سے زیادہ مدھر اور میٹھی ہے، مگر یہی آواز ٹھنڈی اور روکھی بھی ہوسکتی ہے، یہی آواز جو کبھی زندگی کا پیغام لاتی تھی سزائے موت کا حکم بھی سنا سکتی ہے۔

اور موت؟ موت کیا ہے؟ پیغمبر، عالم، وِدّوان مہا تما بھی اس سوال کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ مگر ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ موت سے اتنا واقف نہیں ہوسکتا۔ موت کیا ہے؟ ایک مینڈک کی بے نور پیلی آنکھیں، وہ اکڑی ہوئی ٹھنڈی لاشیں جن کی چیر پھاڑ کر کے اس نے زندگی کی خدمت کرنے کے لیے سرجری سیکھی تھی تو کیا کل جب اس کی لاش سنگم سے نکالی جائے گی تو اس کو بھی لاوارثوں کے رجسٹر میں درج کر کے میڈیکل کالج کے ڈسکٹنگ ہال میں بھیج دیا جائے گا؟ اسے اپنے سینے پر دل کے قریب سمترا کے نشتر کی ٹھنڈی سی میٹھی سی چبھن محسوس ہوئی۔

اب وقت قریب آ گیا ہے۔ اس نے سوچا، وہی وقت ہے، وہی جگہ ہے جب سمترا نے کہا تھا، ''ہائے کتنی شانت اور سندر جگہ جان دی ہے بیچارے نے۔'' اسی طرح آج بھی سورج ڈوب رہا ہے، پانی میں آگ لگی ہوئی ہے اور خون کے رنگ کا ایک تیسرا دریا بھی سنگم میں مل رہا ہے۔

تیسرا دریا؟ ایک گنگا ایک جمنا مگر اس تیسرے دریا کا نام کیا ہے؟

تیسرا دریا؟ ایک زندگی، ایک موت، اس کے علاوہ تیسرا دھارا کون سا ہوسکتا ہے؟ کیا یہ سب قصہ کہانی ہی ہے یا کبھی کسی زمانے میں اس سنگم پر واقعی کوئی تیسرا دریا بھی ملتا تھا؟ نہ جانے کیوں اس وقت یہ سوال اس کے لیے اہم بن گیا تھا۔

چند منٹ میں وہ مر جائے گا اور اس کے ساتھ یہ سوال بھی جواب ملے بنا مر جائے گا۔

اس نے بوڑھے کشتی بان کو آواز دی جو خاموشی سے کشتی کھے رہا تھا، ''اے کاکا! یہاں کتنا گہرا پانی ہوگا؟''

''تین ہاتھی ڈباؤ پانی ہے، سرکار۔'' بوڑھے نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا۔

''تین ہاتھی ڈباؤ پانی ہے؟''

''جی سرکار تین دریاؤں کا پانی ہے نا۔''

''تین دریا؟''

''ہاں سرکار۔ایک گنگا میا، ایک جمنا جی۔''

''اور تیسرا دریا؟''

''سرسوتی ہے سرکار۔''

''سرسوتی کہاں ہے؟ دکھاؤ ہمیں۔''

''سرسوتی میا ہر کوئی کو درشن نہیں دیتی سرکار۔وہ تو جمین کے بھیتر ہی بہتی ہے۔''

''مگر کدھر سے بہتی ہے؟''

''ادھر سے، سرکار۔''

اور بوڑھے کے اشارے پر رمیش نے گنگا اور جمنا کے دھاروں سے ہٹ کر، تیسری طرف دیکھا جہاں شام کے دھندلکے میں سفید سفید ریت جھلک رہی تھی اور کنارے پر جہاں کشتیاں کھڑی تھیں۔جھونپڑوں میں سے نیلا نیلا دھواں اٹھ رہا تھا۔

''ادھر تمھارے گاؤں کی طرف سے یہ تیسرا دریا بہتا ہے؟''

''ہاں سرکار، بڑے بوڑھوں سے ایسا ہی سنتے آئے ہیں۔''

اور رمیش کو ایسا محسوس ہوا کہ اس بیکار سوال و جواب سے وہ ہلکان ہو گیا ہے۔اس بحث سے فائدہ بھی کیا؟ جب جلد ہی زندگی اور موت کے سارے جھگڑوں سے آزاد ہو جائے گا۔اب تو اسے کسی دم میں کشتی بان کی نظر بچا کر پانی میں کود پڑنا چاہیے۔اس نے دیکھا کہ بوڑھا کشتی کھیتے کھیتے ہانپ رہا ہے اور اس نے دیکھا کہ بیچارے کے میلے کپڑے بھی پھٹے ہوئے ہیں۔مرنے سے پہلے (اس نے سوچا) اس بچارے کو اس کی کشتی کا کرایہ تو دے دینا چاہیے۔

اس نے اپنی جیب میں ٹٹولا۔صرف ایک روپیہ بارہ آنے تھے، کیونکہ اسے واپس جانا نہیں تھا اس لیے اس نے کرایہ طے ہی نہیں کیا تھا۔

''کاکا! یہ لو اپنا کرایہ۔''

''یہاں سنگم پر سرکار؟'' بوڑھے نے تعجب سے مڑکر پوچھا، ''واپس گھاٹ پر جا کر دے دیجیے گا۔''

''نہیں کاکا! واپسی کا کون بھروسہ؟ یہ لو۔''

بوڑھے نے بڑی احتیاط سے پیسے گنے، پھر بولا، ''سرکار! چار آنے اور مل جاتے بڑی کرپا ہوتی۔تین روپے میرے پاس ہیں پہلے کے؟''

''میرے پاس تو بس اتنے ہی ہیں۔'' رمیش نے کہا اور بوڑھا ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ مگر زندگی کے اس آخری لمحے میں بھی رمیش کے دل میں ایک سوال کھٹکتا رہا۔

''کاکا!'' اس نے آواز دی۔

''جی سرکار!''

''تمھیں پانچ روپے چاہئیں؟''

''جی سرکار۔''

''کس کے لیے؟''

''ڈاگدر لانا ہے، سرکار۔ پانچ روپے سے کم ناہیں لے گا سسر۔''

''ڈاکٹر لانا ہے؟ کوئی بیمار ہے کیا؟''

''ہماری اکلوتی بٹیا سرکار۔''

''کیا بیماری ہے؟ اور کب سے؟''

''بھگوان جانے کیا روگ ہے سرکار۔ مہینہ بھر ہونے کو آیا بکھار میں پڑی ہے۔ شریر ایسے جلے ہے جیسے جلتا توا۔ آج تو بڑے ہی جور کی کپکپی چڑھی ہے۔ کون جانے بچے گی بھی کہ نہیں۔''

رمیش نے سوچا، ''ٹائیفائڈ'' پھر اس نے پوچھا، ''اور تمھارے ہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟''

''نہیں سرکار، گریب ناؤ والوں کی جھونپڑیوں میں ڈاگدر کہاں سے آئے گا؟ پانچ روپیہ لے کے بھی ڈاگدر دریا پار جاتے گھبراوے ہیں۔'' اور پھر ایک نہایت گہری ٹھنڈی سانس لے کر وہ بولا، ''آج کی رات بچ گئی تو کل کوئی ڈاگدر لاؤں گا سرکار۔''

اور پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے اور شام کے سناٹے میں صرف پانی میں چپو چلنے کی آواز آتی رہی۔ چپ چپ چپ چپ۔

رمیش نے آخری بار چاروں طرف دیکھا۔ آسمان پر تارے ابھر آئے تھے۔ ایک طرف گنگا کا صاف نیلا دھارا تھا، دوسری طرف جمنا کا دودھیا مٹی ملا پانی اور تیسری طرف؟ اس نے چونک کر دیکھا کہ دور کنارے پر کشتی والوں کے گاؤں کے پیچھے ستاروں کی مدھم روشنی میں سفید سفید ریت بہتے ہوئے پانی کی طرح جھلملا رہی ہے۔

اور دفعتاً رمیش کو ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں اسے راستہ نظر آ گیا ہو۔

''کشتی موڑلو کاکا۔'' اس نے چلا کر کہا۔

''واپس گھاٹ پر چلیں سرکار؟''

''نہیں، واپس نہیں۔ ادھر چلو۔''

''کدھر؟''

''جدھر تمھارا تیسرا دریا بہتا ہے۔''

اور اس کے بعد بوڑھے کشتی بان نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنے جھرّیاں پڑے مگر مضبوط ہاتھوں سے وہ چپو چلا کر کشتی کو کھیتا رہا۔ اپنے گاؤں کی طرف جہاں اس کی بیٹی ایک مہینے سے بخار میں پڑی کسی ڈاکٹر کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

(۱۹۶۲ء)

☆☆☆

مسوری ۱۹۵۳ء

(قرۃ العین حیدر سے معذرت کے ساتھ)

روز نامچہ

مسوری......۱۱رجون ۱۹۵۳ء

اوشا ڈارلنگ!

تم ضرور خفا ہوگی کہ میں نے اب تک تمھیں خط نہیں لکھا اور شاید یہ بھی سوچتی ہوں گی کہ مسوری جا کر سلمہ نے مجھے بھلا دیا۔ یقین ماننا کہتی ہوں سچ (کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے) جب سے ہم یہاں آئے ہیں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ تمھاری یاد نہ آئی ہو یا تمھیں خط لکھنے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ مگر پاپا اور ممی اور بھائی جان کی مشترکہ سازش سے مجھے صبح سے شام تک اتنا مصروف رکھا جاتا ہے کہ ایک ،منٹ کی بھی فرصت یا تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔ صبح کا ناشتہ نہیں کر پاتی کہ بھائی جان کا حکم ہوتا ہے کہ رائڈنگ کو چلو۔ (پہلے چند روز تو سلیکس میں ہی سواری کی مگر اب میں نے برجلیس سلوالی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ رائڈنگ ڈریس میں میں بُری نہیں لگتی) ہاں تو کیملز بیک روڈ کا چکر لگا کر آتے ہیں تو گیارہ بج جاتے ہیں اور رمی کا دور شروع ہوتا ہے۔ پاپا تو تم جانو رمی کے پرانے شوقین بلکہ ماہر کھلاڑی ہیں اور بھائی جان کو خود انھوں نے سکھایا ہے۔ مگر میری خاطر ممی نے بھی رمی کھیلنا شروع کر دیا ہے تا کہ ان کی اکلوتی پیاری بیٹی سلمہ کا جی نہ گھبرائے۔ ہاں تو لنچ تک رمی کا سلسلہ رہتا ہے اور لنچ کے بعد ممی کا حکم ہوتا ہے کہ آرام کرو۔ ورنہ تمھاری صحت خراب ہو جائے گی۔ رنگت پھیکی پڑ جائے گی، آنکھوں میں حلقے پڑ جائیں گے وغیرہ غیرہ۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آج کل ممی میرے کمرے ہی میں سوتی ہیں۔ (بیٹی کی خاطر پاپا کا ایثار تو دیکھو) شاید ان کو خدشہ یہ ہے کہ دو منٹ بھی اکیلی رہی تو کہیں انگوٹھی کا ہیرا نہ چبا لوں۔

تو اس طرح چائے کا وقت ہو جاتا ہے اور چائے پیتے ہی باہر نکلنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔تم جانتی ہو مسوری میں فیشن ایبل لڑکیوں کی کتنی کثرت ہوتی ہے۔ اگر روز نئی ساڑھی یا غرارے کا نیا سوٹ نہ پہنو اور میک اَپ پر آدھ پون گھنٹہ نہ لگاؤ تو لائبریری کی ''گرل پریڈ'' میں شاید کوئی نوٹس نہ لے۔اس لیے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔(ہاں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ پاپا نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر کتنے ہی نئے کپڑے مجھے سلوا دیے ہیں۔کوئی دس تو نئی ساڑھیاں ہیں۔شیفون کی ایک نیلی ساڑھی لی ہے اور اس کے ساتھ سنہری بروکیڈ کا ایک بہت ہی چست بلاؤز۔میری جان! دیکھو تو ایک بار تم زُم ہو جاؤ)۔

شام کو ہم لوگ لائبریری کی بھیڑ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے کیونکہ پاپا کہتے ہیں کہ یہاں اب Low کلاس کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی لائبریری کو ایک سیر سے بائی پاس بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس نچلے درجے کی لڑکیوں میں کوئی کوئی بڑی حسین صورتیں نظر آتی ہیں اور انھیں دیکھنے کے لیے ہائی کلاس کے لڑکے ادھر ضرور چکر لگاتے ہیں۔کمبخت اس بُری طرح گھورتے ہوئے گزرتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے ان کی ایکسرے نگاہیں کپڑوں کو چیرتی ہوئی ننگے ندن کو گدگدا رہی ہیں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ گردن کٹی کھال اُتری ہوئی بکریاں ہیں جو قصائی کی دکان پر لٹکی ہوئی ہیں اور ہمارا گوشت خریدنے کو یہ سب لڑکے جمع ہیں اور کوئی کہتا ہے: ''ران کا گوشت دینا'' اور کوئی کہتا ہے ''سینے کا''۔کبھی کبھی تو میرا جی متلانے لگتا ہے اور طبیعت چاہتی ہے کہ اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالوں،میک اپ کیے ہوئے منہ پر کیچڑ مل لوں اور کسی پہاڑن کے گندے چیتھڑے پہن کر اس سڑک سے گزرا کروں تاکہ یہ بے شرم بے رحم نگاہیں گدگدانے،چھیڑنے،کاٹنے کو میری طرف نہ دوڑیں۔

ہاں تو اس طرح لائبریری سے گزرتے ہوئے ہم ہیک مینز کے ہال روم پہنچ جاتے ہیں جہاں پاپا اپنے مقرر چار پیگ وہسکی کے پیتے ہیں اور بھائی جان بھی ان کی نظر بچا کر کسی دوسری میز پر جا کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیئر کا ایک گلاس پی آتے ہیں اور ممی کوئی پندرھویں بار یہ اعلان کرتی ہیں کہ شیری کوئی شراب تھوڑا ہی ہے۔مگر میرے لیے کافی ہی آرڈر کی جاتی ہے۔

پچھلی بار ہم ۱۹۴۷ء کی سیزن میں مسوری آئے تھے جب تو میں میٹرک میں پڑھتی تھی اور کانونٹ اسکول کا نیلا فراک پہنتی تھی اور نہ میک اپ کرنے کی اجازت تھی نہ ہیک مینز کے ہال روم میں آنے کی۔اسی لیے مجھے تو اس زمانے کی کوئی خاص یاد ہے نہیں مگر پاپا (جنھوں نے فسادات

کے بعد پہلی بار مسوری پھر آنے کی ہمت کی ہے) کہتے ہیں، اب مسوری میں وہ لائف اور گیٹی (Gaiety) نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک تو تم جانو، ان کے پیارے انگریز اب یہاں مشکل سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پھر ان کا تعلقہ دار سیٹ کے اکثر مسلمان پاکستان چلے گئے ہیں جو باقی ہیں ان میں سے بہت سے زمینداری ابالیشن کے بعد اب مصوری آنا افورڈ ہی نہیں کر سکتے۔ کچھ ایسے ہیں جو ۱۹۴۷ء کے واقعات سے اب تک خوفزدہ ہیں اور اس لیے ادھر کا رُخ نہیں کرتے۔ مگر پاپا کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اب گھٹیا درجے کے لوگ مسوری آنے لگے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں کے وکیل، ڈاکٹر، تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر وغیرہ۔ بھلا ان لوگوں کو پاپا کب خاطر میں لاتے ہیں۔ رہے بزنس کلاس کے سندھی اور پنجابی۔ روپیہ تو ان لوگوں کے پاس بہت ہے اور خرچ بھی کرتے ہیں بُری طرح، شراب تو پیتے نہیں، لنڈھاتے ہیں۔ مگر پاپا کہتے ہیں یہ سب مذاق ہیں۔ ان میں کلچر نہیں ہے۔ ان کی فلم اسٹاروں کی تصویروں والی شرٹس اور چیختے ہوئے رنگوں کی ٹائیاں دیکھ کر تو پاپا تلملا اٹھتے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ ان سب کو زبردستی مسوری سے باہر کر دیں۔ مشکل یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ ہیک منیز میں بھرے رہتے ہیں۔ ان کی لڑکیاں، بیویاں سب سے بڑھیا کپڑے پہنتی ہیں اور سب سے زیادہ میک اپ کرتی ہیں۔ ڈانس بھی زوروں سے کرتی ہیں۔ دو چار سندھی پنجابی نوجوانوں نے مجھ سے بھی ڈانس کے لیے کہا مگر میں نے پاپا کے ڈر سے انکار کر دیا اور مجھے ڈانس آتا بھی نہیں تھا۔ ممی ایک زمانے میں ڈانس کیا کرتی تھیں، اب نہیں کرتیں۔ میں نے پاپا سے کہا پھر کیا حرج ہے۔ میں بھی سیکھ لوں۔ پہلے تو انھوں نے اجازت نہیں دی۔ کہنے لگے ان دنوں کی بات اور تھی۔ انگریز ڈانس کرنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ پھر جو ہندستانی ہوتے تھے وہ بھی ہائی کلاس کے ہوتے تھے۔ تمھاری ممی نے نواب رام پور اور راجہ صاحب ناناپارہ اور سر جے پی کے ساتھ ڈانس کیا ہے۔ اور یہ.......... یہ لوگ تو وحشی ہیں وحشی۔ مگر چند روز بعد جب ڈانس کے شوقین نوجوانوں نے میری جانب رُخ کرنا بھی چھوڑ دیا تو پاپا کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور اب اتنی اجازت مل گئی ہے کہ بھائی جان سے ڈانس سیکھوں۔ اس لیے اب میں بھی ڈانس فلور پر نظر آتی ہوں۔ مگر اپنے بھائی کے ساتھ ڈانس کرنے میں وہ بات اور وہ تھرل کہاں جو..........

ہاں تو جانِ من! اس طرح اپنا وقت صَرف ہوتا ہے۔ صرف رات کو جب گیارہ بجے پلنگ پر لیٹتی ہوں اور ممی ''گڈ نائٹ'' کہہ کر خراٹے لینا شروع کر دیتی ہیں، صرف اس وقت میں اپنے خیالات کے ساتھ تنہا ہوتی ہوں اور اس وقت اور یادوں کے ساتھ تمھاری یاد بھی آتی ہے۔

''اور یادوں'' کا مطلب سمجھ گئیں نا؟ اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے گزرو تو اور ایک کالی ورسٹڈ پتلون اور ایک بھورا ٹویڈ کا کوٹ نظر آئے (اس کوٹ کے مونڈھے پر تمھیں شاید میرے ہاتھ کا رفو کیا ہوا حصہ دکھائی دے گا) تو میری طرف سے ایک نظرِ شوق اُدھر ڈال لینا بس۔ ڈیڈی اور ممی اور بھائی جان نے مجھے اس سنہرے پنجرے میں تو بند کر رکھا ہے مگر ''مرے خیال کو بیڑیاں پہنا نہیں سکتے'' اور اس لیے اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے.........

اچھا میری جان! یہ خط غسل خانے میں بند ہو کر لکھ رہی ہوں اور ممی دروازہ دھڑ دھڑا رہی ہیں کہ جلدی کرو۔ اس لیے باقی آیندہ۔ لکھنؤ کے مفصل حالات لکھنا۔ روشنی اور شمی اور نورو اور نینا کو بہت بہت پیار۔ (کہو تمھارا چاند باغ والا رومانس کیسا لڑ رہا ہے؟)

تمھاری (مگر صرف تمھاری نہیں)

سلمہ

....

روز کا میچ

مسوری......۱۸رجون

جان سلمہ، جیتی رہو۔

تمھارا خط آیا۔ لکھنؤ کی یادوں کا دروازہ کھل گیا اور مسوری کی ''جنت نظیر'' بیوٹی پھیکی پڑ گئی۔ تم گرمی اور لُو اور پسینے کی شکایت کرتی ہو اور میرا جی چاہتا ہے کہ پَر لگا کر وہاں پہنچ جاؤں جہاں تم ہو۔ جہاں وہ ہے......خواہ وہاں جہنم جتنی گرمی کیوں نہ پڑ رہی ہو!

بنتی کیوں ہو! جیسے تمھیں احمد کے بارے میں میری جو فیلنگز ہیں، ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نہیں مان سکتی کہ تم جو اُڑتی چڑیا پہچانتی ہو، اس اوپن سیکرٹ سے بے خبر تھیں۔ تم پوچھتی ہو ''آخر تم نے اس بے ہنگم، گنوار کے لٹھ لکچرر میں ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا دیکھا ہے جو اس کو دل دے بیٹھی ہو؟'' (اور جو میں یہی بات تمھارے جگر کے ٹکڑے زمل کے بارے میں کہوں جس کے دودھ کے دانت بھی ابھی نہیں ٹوٹے اور جو ابھی تک محبت کو ودّیا پتی کا فلم اور مہادیوی ورما کی کویتا ہی سمجھتا ہے) تو میری جان بات یہ ہے کہ ہمیں تو احمد کی ہر آن بھاتی ہے۔ اس گرمی، لُو میں اس کا گرم کوٹ پہننا بھی بھاتا ہے (اس لیے کہ اس کوٹ پر میرا رفو کیا ہوا ہے!) اور اس کے بے کنگھی کیے ہوئے گھنے کالے بال بھاتے ہیں اور اس کا اکنامکس پڑھانے کے بہانے سوشلزم پر

لکچر جھاڑ نا بھاتا ہے اور جس انداز سے وہ کہتا ہے ''ہاں مس سلمہ شمشاد علی خاں! آپ بھی تو ایک تعلقہ داری خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی رائے زمینداری ابالیشن کے بارے میں کیا ہے؟'' وہ بھاتا ہے اور بتاؤں؟ نہیں کیوں منہ کھلواتی ہو۔ کسی اور کے ہاتھ خط پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

تمھارا خیال غلط ہے کہ اس بچکانہ موڈ میں ہوں جب لڑکیوں کہ اپنے ہر پروفیسر سے عشق ہوتا ہے۔ معاف کرنا مجھ پر یہ دورے کبھی نہیں پڑے اور احمد تو مجھے اس وقت سے بھاتا ہے جب وہ پروفیسر نہیں تھا۔ بی اے میں پڑھتا تھا اور ہم لوگ آئی ٹی میں فرسٹ ائیر میں تھے اور ایک دن ہمت کر کے تم اور میں اور روشنی تینوں کافی ہاؤس گئے تھے اور وہاں ایک شرابی انگریز فوج میں گھس آیا تھا اور ہم لڑکیوں کو Unescorted دیکھ کر اول فول بکنے لگا تھا اور ہم ڈر کے مارے کانپ رہے تھے اور وہ بالکل قریب آ گیا تھا—— لال لال منہ کا بندر کہیں کا—— اتنے قریب کہ اس کے سانس سے شراب کی بُو آتی تھی اور میرا دوپٹہ سر سے اٹھا کر کہنے لگا تھا ''او مائی ڈارلنگ! کم، دس از دی نائٹ فارلو'' اور جتنے بھی لڑکے کافی ہاؤس میں تھے، ان میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کمبخت کوٹو کے۔ اس لیے کہ اس کی پیٹی میں پستول لگا ہوا تھا اور ہر ایک کو ڈر تھا کہ وہ پستول نکال کر گولی چلانا نہ شروع کر دے۔ اور اس وقت ایک دُبلا سا لمبا سا سانولا لڑکا جو اس وقت تک اکیلا بیٹھا ہوا، کتاب پڑھ رہا تھا خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور میز پر سے کافی پوٹ اٹھا کر ہٹے کٹے انگریز کے سر پر دے مارا۔ یاد ہے کتنی خوفناک ہاتھا پائی ہوئی تھی اور ان دونوں میں اور جب ملٹری پولیس والے آ کر اسے لے گئے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ہماری جان اور عزت بچانے والے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اس خون کو اس طرح پونچھ رہا تھا جیسے کوئی پسینا پونچھتا ہے۔ اور ہم سے کہہ رہا تھا ''معاف کیجیے گا، آپ کو تکلیف ہوئی۔ اب وہ موذی آپ کو تنگ کرنے کی ہمت نہ کرے گا......'' اور پھر اتنا بہت خون نکلتے دیکھ کر میرا سر چکرا گیا تھا اور میں بے ہوش ہو گئی تھی...... وہ دن میں اب تک نہیں بھولی۔ اور وہ بھی نہیں بھولا۔ اس لیے کہ اس کی پیشانی پر اب بھی اس زخم کا نشان ہے...... اور جب بھی وہ آئینہ دیکھتا ہے اسے اس دن کی...... اور میری...... یاد دلاتا ہے۔

نہیں اوشا، میری جان! میں اسکول گرلش Infatnation میں بالکل گرفتار نہیں ہوں۔ میں نے احمد کو ہر ڈھنگ سے دیکھا ہے۔ ہنستے ہوئے بھی، غصہ ہوتے ہوئے بھی، ایک بار روتے ہوئے بھی۔ اس کی زبان سے میں نے اکنامکس پر لکچر بھی سنے ہیں اور اسی زبان سے غالب

اور اقبالؔ، فراقؔ اور مجازؔ کی نظمیں اور غزلیں بھی سنی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس نے آج تک مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں''، مگر اس کا مطلب یہ نہیں (جیسا تم نے لکھا) کہ ہوسکتا ہے کہ اسے تم سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو...... یا صرف اتنی ہو جتنی ہر نوجوان پروفیسر کو ہر خوبصورت و نوجوان گرل اسٹوڈنٹ میں ہوتی ہے۔ ''اول تو میں سرے سے خوبصورت ہی نہیں ہوں۔ ہماری کلاس میں کتنی ہی لڑکیاں مجھ سے کہیں زیادہ ''زُم'' ہیں۔ مگر وہ ان میں سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ دوسرے یہ کہ میں بھی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔ اچھے برے میں تمیز کرسکتی ہوں۔ نہ پردے میں پلی بڑھی ہوں۔ احمد کے علاوہ اور بھی دو چار خاصے معقول نوجوانوں سے ملی ہوں۔ خود پسندی کا الزام نہ دو تو کہوں کہ احمد پہلا نوجوان تو نہیں تھا جس نے مجھ میں دلچسپی لی ہے اور اگر بے شرم نہ کہو تو یہ اعتراف بھی کر ڈالوں کہ وہ بھی میری زندگی کا پہلا ''درِدل'' نہیں ہے۔ اس لیے اگر مجھے وہ اچھا لگتا ہے اور میں اس کی خاطر بہت کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں تو کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔ سمجھیں...... یا نہیں سمجھیں؟

خیر، اب یہ سنو پاپا اور ممی اور بھائی جان تینوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مسوری کے سیزن کی دلچسپیوں میں میں احمد کو بالکل بھلا بیٹھی ہوں۔ اس لیے ممی نے میرے کمرے سے اپنا ڈیرہ اٹھا لیا ہے اور اس لیے اب مجھے اپنے دوستوں کو خط لکھنے کی آزادی ہے۔ کل رات پہلا خط اسے لکھا ہے (اور چھٹیوں میں مسوری آنے کی صلاح دی ہے) اور دوسرا خط یہ تمھیں لکھ رہی ہوں۔ اس وقت سہ پہر کے چار بجے ہیں اور عام طور سے ہم لوگ ساڑھے چار بجے چائے پیتے ہیں۔ اس لیے تمھیں اور بہت کچھ لکھنے کا ارادہ تھا ممی اپنے کمرے سے چلّا چلّا کر اعلان کر رہی ہیں کہ ہمیں اپنے پڑوسی مسٹر ماتھر کے ہاں چائے پینے جانا ہے۔ (کوئی پی سی ایس قسم کے بور ہیں جو برابر والے بنگلے میں آکر ٹھہرے ہیں اور ان کے ہاں جانے کے خیال سے ہی مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ لیکن پاپا اور ممی ان سوشل معاملات میں بہت ہی فورمل ہیں اور اگر میں انکار کردوں تو ایسی ڈانٹ پڑے گی کہ بس) اس لیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ باقی آئندہ۔

تمھاری...... سلمہ

P.S. تم کتنی خوش قسمت ہو کہ لکھنؤ میں ہو اور روز یونیورسٹی میں پڑھنے جاتی ہو اور ''کسی'' کو دیکھ سکتی ہو! P.P.S. کیا تم نے رام کمار کی نئی تصویر ''خواب'' دیکھی؟ نہ دیکھی ہو تو ضرور دیکھنا۔ یہ لڑکا تو دلیپ اور راج سے بھی زیادہ ''زُم'' نکلا۔ مسوری میں تو ہر لڑکی اس کی دیوانی ہو رہی ہے۔

......

۲۶؍جون

اوشا، مائی ڈیئر۔ بہت بہت پیار

ایک تیر میرے سینے پر مارا کہ ہائے ہائے''...... گومتی چاندنی رات میں چھتر منزل کا نقرئی منظر۔ بوٹ کلب کا پکنک اور اس میں ''وہ'' بھی موجود۔ تم نے اتنی خوبصورت تفصیل سے نقشا کھینچا ہے کہ واہ واہ۔ میں جل ہی تو گئی۔ ذکر اس پری وش کا اور بیان تیرا!...... کیا وہ سچ مچ میری بابت پوچھ رہا تھا؟ یا یہ سب تم نے مجھے چھیڑنے کے لیے من گھڑت لکھا ہے؟ بھئی اس سیریس معاملے میں تم نے مذاق کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ تم سے یہ بات اس لیے کرید کر پوچھ رہی ہوں کہ میرے پاس جو خط آیا ہے وہ تو اتنا روکھا پھیکا اور فورمل ہے کہ دور دور بھی رومانس کا نام ونشان نہیں۔ امید ہے کہ اب آپ کی طبیعت بہتر ہوگی اور آپ نے کالج میں جو لکچر مِس کیے ہیں ان کے بدلے میں آپ خود گھر پر پڑھ رہی ہوں گی۔ کمیونزم کی اقتصادیات کو سمجھنا ہے تو ویبز Webbs کی کتاب پڑھنا ضروری ہے۔ ویسے مخالفین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے برنہم Managerial-Revolution وغیرہ جیسی کتابیں بھی پڑھ لیجیے تا کہ معلوم ہو جائے کہ اینٹی سوشلسٹ طبقے کی منطق کتنی لچر لوچ ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ اب تم ہی بتاؤ میں نے خوامخواہ اتنی احتیاط برتی کہ خط گھر کے پتے کے بجائے مسز ناتھ کی معرفت منگایا۔ (ہاں تم بھی آیندہ سب خط ''معرفت مسز روپ کماری ماتھر، پربت لاج، مسوری کے پتے سے مجھے بھیجنا۔)

اب ان ماتھرز کے بارے میں سنو۔ (شاید پچھلے خط میں میں نے ان کا کچھ ذکر لکھا تھا) یہ فیملی تین ہفتے سے ہمارے برابر والے بنگلے میں آ کر ٹھہری ہے۔ نفسیاتی مطالعے کے لحاظ سے نہایت دلچسپ لوگ ہیں۔ ہر ایک سائیکولوجی کتاب کا ایک چیپٹر معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر ماتھر پی سی ایس کے پرانے آدمی ہیں۔ بیس برس سے سروس میں ہیں اور اب کسی ضلع میں کلکٹر ہیں۔ عمر کوئی پینتالیس سال کی ہوگی۔ سر کے بال بالکل غائب ہیں۔ ان کے بے تکلف دوست اکثر ان پر انڈے کی پھبتی کستے رہتے ہیں۔ رنگ سانولا اور اس پر چیچک کے نشان، کمزور آنکھوں پر بڑے موٹے شیشوں کا چشمہ پہنتے ہیں۔ پان بکثرت کھاتے ہیں خوشبودار تمباکو ڈال کر۔ شاید اس لیے کہ دانتوں میں پائیریا ہے اور جب پان نہ کھا رہے ہوں تو دور سے بدبو کا جھپکا آتا ہے۔ انفیریورٹی کومپلکس کی مثال دیکھنا ہو تو ماتھر صاحب کو دیکھ لو۔ بچارے شکل سے ہی کمترین ہی نہیں یتیم

و مسکین بھی معلوم ہوتے ہیں۔ پی سی ایس کے ہیں اس لیے آئی سی ایس والوں سے کمتر محسوس کرتے ہیں۔ گنجے ہیں اس لیے بال والوں سے اپنے آپ کو گھٹیا سمجھتے ہیں۔ بچارے پستہ قد ہی نہیں ایک درمیانہ توند کے مالک بھی ہیں اس لیے لمبے اور تگڑے، صحت منداور اسمارٹ نوجوانوں کا سامنا کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ باپ کسی وکیل کے منشی تھے اور بیٹے کو سرکاری وظیفوں کی مدد سے تعلیم دلوائی تھی اس لیے خاندانی رئیسوں، تعلقہ داروں اور لکھ پتی سندھی تاجروں کے مقابلے میں ماتھر صاحب احساسِ کمتری محسوس کرتے ہیں۔ اس کمتری کا سب سے شدید احساس ان کو اپنی نوجوان بیوی کے سامنے ہوتا ہے۔

مسز ماتھر کافی حسین اور شاندار عورت ہیں۔ گو ان کا حسن شاہانہ اور رعب دار قسم کا ہے۔ نسیم اور وینا جیسا۔ عمر کوئی اٹھائیس برس کی ہوگی۔ مگر ان کو اپنے سے عمر کی لڑکیوں کی برابری کرنے میں مزا آتا ہے۔ مجھ سے بچاری بڑی محبت سے پیش آتی ہیں مگر ان کا اصرار ہے کہ مجھے مسز ماتھر نہیں روپ کہا کرو۔ آخر میں تم سے کوئی زیادہ بڑی تھوڑا ہی ہوں۔ اور ہاں، میری رومانی وارداتوں کے قصے سننے کی برابر فرمایش کرتی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنی زندگی میں رومانس مس کرنے کی وجہ سے دوسروں کے رومانوں میں انھیں غیر معمولی اور غیر قدرتی حد تک دلچسپی ہوگئی ہو۔ سنا ہے کسی زمانے میں وہ روپ کماری کے نام سے ہندی میں بڑے اچھے رومانی افسانے لکھا کرتی تھیں۔ تم نے شاید کبھی ''مایا'' یا ''سریتا'' میں ان کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ کہتے ہیں ان دنوں ایک نوجوان ادیب سے ان کا کافی گہرا عشق بھی چل رہا تھا۔ (افسانوی اور ادبی عشق .... کنہیا لال منشی اور لیلاوتی منشی یا امتیاز علی تاج اور حجاب اسمٰعیل کے عشق جیسا) مگر ان کے والدین کو اصرار تھا کہ داماد آئی سی ایس نہ ہو تو کم سے کم پی سی ایس ہو۔ وہ بچارا اس پر بھی راضی ہوگیا کہ ادبی کام چھوڑ کر آئی سی ایس کا امتحان دے......... مگر مقابلے میں صرف ایک نمبر سے رہ گیا اور روپ کے والد نے بیٹی کو زبردستی مسٹر ماتھر کے ساتھ بیاہ دیا۔ اوشا پیاری! ہم نے تم نے بھی بہت سے امتحان دیے ہیں اور امتحانوں کے سارے سسٹم کو ہی کنڈم کرتے رہتے ہیں مگر کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ایک نمبر...... سنا تم نے صرف ایک نمبر...... کی کمی سے پوری پوری زندگیاں تباہ ہوسکتی ہیں؟ ہاں تو جب وہ بچارا ایک نمبر سے آئی سی ایس میں آنے سے رہ گیا تو روپ کے پتاجی نے زبردستی اس کی شادی ماتھر صاحب سے کردی (یہ اور بات ہے کہ اب کہ اس شادی کو ہوئے چھے برس گذر چکے ہیں۔ ماتھر صاحب صرف نوسو روپے ماہوار پاتے ہیں اور وہ نوجوان ادیب جو آئی سی ایس میں صرف ایک نمبر

سے رہ گیا تھا، اس وقت واشنگٹن ایمبیسی میں پریس اٹاچی لگا ہوا ہے اور اٹھارہ سو روپے ماہوار پا رہا ہے۔)

کم عمر بیوی اور بوڑھا ادھیڑ شوہر...... یہ تو کافی پرانی اور جانی پہچانی کہانی ہے۔ مگر ماتھر صاحب پہلے سے شادی شدہ بھی تھے اور ان کی پہلی بیوی سے ایک بچّی بھی تھی۔ سنا ہے کہ ان کی پہلی بیوی کم رو ہی نہیں ان پڑھ بھی ہے۔ اس لیے ایک سرکاری افسر کی بیوی کی حیثیت سے بچاری بالکل ناکامیاب ثابت ہوئی۔ راوی (یعنی مسوری کے پروفیشنل اسکینڈل منگر) بیان کرتے ہیں کہ کمشنر صاحب کے ڈنر میں ایک دن غریب بوکھلاہٹ میں فنگر بول میں ہاتھ دھونے کے بجائے اس کا پانی پی گئی۔ بس اسی دن سے ماتھر صاحب نے اسے تو واپس میکے بھیج دیا (اور اس وقت سے آج تک اس کو سو روپے ماہوار باقاعدگی سے بھیجتے ہیں) اور اپنی بیٹی کو نینی تال کے ایک کانوینٹ اسکول میں داخل کرا دیا ہے۔ اور اس کے بعد برسوں کسی خوبصورت اور پڑھی لکھی بیوی کی تلاش کرتے رہے جو ان کی سوشل لائف میں ان کا ہاتھ بٹا سکے اور فنگر بول سے پانی نہ پیتی ہو۔ اور آخر ان کی نظر انتخاب روپ کماری پر پڑی۔ نتیجہ کیا ہوا وہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ماتھر صاحب تو روپ کماری پر جان دیتے ہیں۔ اپنی مسی مسی آنکھوں سے بیوی کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے من ہی من میں اس کی پوجا کر رہے ہوں۔ اس کی ادنا سے ادنا خدمت بجا لانے میں عار نہیں سمجھتے۔ میں نے خود روپ کو اطمینان سے پان چباتے اور ماتھر صاحب کو بار بار اگالدان پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کپڑے والوں، درزیوں، جیولرز وغیرہ کے بل بے چوں وچرا ادا کرتے رہتے ہیں۔ روپ کماری کے پاس کم سے کم ڈیڑھ سو ساڑھیاں تو ضرور ہوں گی اور نہ جانے کتنے غرارے اور قمیض۔ ہر رنگ کی ساڑھیوں کے ساتھ پہننے کے لیے الگ الگ کوٹ، جوتوں اور سینڈلوں کی قطار تو کمرے کے چاروں طرف لگی ہوئی ہے۔ ہر مہینے بیوی کے لیے درجنوں رسالے اور اخبار اور کتابیں منگواتے ہیں۔ مگر روپ کماری کہتی ہیں اب ان کی ادبی دلچسپی مرجھا گئی ہے اور وہ صرف فلمی رسالوں اور ہفتہ واروں خصوصاً فلم انڈیا کا بغور مطالعہ کرتی ہیں۔ ہر فلم اسٹار کا شجرۂ نسب انھیں زبانی یاد ہے۔ کون کب پیدا ہوا، کب فلمی دنیا میں داخل ہوا، کس کس کمپنی کی کس کس تصویر میں آیا، کون سا ہیرو کس ہیروئین کے ساتھ وابستہ ہے؟ ایسی باتیں تو انھیں پوری تفصیل سے معلوم ہیں۔ پرسوں ہی ہم لوگ رام کمار کی نئی فلم ”خواب“ دیکھ کر لوٹ رہے تھے تو کہنے لگیں جانتی ہو کہ یہ رام کمار اپنے لکھنؤ ہی کا رہنے والا ہے۔

لا مارٹینئری سے تو سینئر کیمبرج کیا تھا۔ اس کے بعد انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا کہ رائل فلم کمپنی کا رستم ایرانی لکھنؤ کسی فلم کی شوٹنگ کرنے آیا اور رام کمار کو کنٹراکٹ کر کے ساتھ لیتا گیا...... پہلی ہی فلم میں رام کمار بملا رانی کے ساتھ ہیرو کے رول میں آیا۔ بملا رانی اس پر عاشق ہوگئی اور اس کے بعد ہر پروڈیوسر جو بملا رانی کو لینا چاہتا ہے اس کو ساتھ میں رام کمار سے بھی کنٹراکٹ کرنا پڑتا...... وغیرہ وغیرہ...... لو میں بھی کہاں سے کہاں بھٹک آئی۔ کہنا یہ چاہتی تھی کہ ماتھر صاحب روپ کی اتنی خاطر مدارات کرتے ہیں مگر وہ اس بچارے کو منہ نہیں لگاتیں...... اور سنو! ہر رات کو ڈنر کے کوئی گھنٹہ بھر بعد انھیں بنورلجیا (یعنی آدھے سر کے درد) کا شدید دورہ پڑتا ہے۔ اسپرین کی درجنوں گولیاں بھی بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ شوہر بچارا اگر سر دبانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر ڈانٹ پڑتی ہے۔ بچارے کمرے در کمرے پریشان گھومتا رہتا ہے...... بالکل اسی طرح جس طرح روپ کی پالتو کالی بلّی جولیٹ اپنی مالکہ کی خاطر ماری ماری پھرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گیارہ بارہ بجے جب روپ سونے کی دوا پی کر لحاف میں سر چھپاتی ہیں تو جولیٹ ان کے پیروں میں دبک کر سو جاتی ہے اور ماتھر صاحب بچارے دوسرے کمرے میں خود بھی ایک سلیپنگ ڈوز پی کر سو جاتے ہیں۔

تو یہ بچاری روپ اور بچارے ماتھر صاحب کی حالت ہے۔ مجھے تو دونوں پر بہت ہی ترس آتا ہے۔ مگر ان سے بھی زیادہ عجیب اور قابلِ رحم حالت شمو کی ہے۔ شمو ماتھر صاحب کی بیٹی ہے پہلی بیوی سے۔ پورا نام شیام کماری ہے۔ مگر گھر میں شمو شمو کہتے ہیں۔ کوئی اٹھارہ سال کی ہوگی۔ پچھلے سال نینی تال کے ایک کانوینٹ اسکول سے سینئر کیمبرج کیا ہے۔ اب آئی ٹی کالج میں فرسٹ ائیر میں پڑھتی ہے......

مگر اب مجھے خط ختم کرنا چاہیے۔ ممی ڈارلنگ روم سے چلاّ رہی ہیں کہ چلو کھانے کا وقت ہوگیا۔ اس لیے شمو کے بارے میں اگلے خط میں لکھوں گی۔ تم تو اپنے آپ کو سائیکالوجی اور سائیکوانالیسس کی توپ سمجھتی ہو۔ مگر اس ماتھر خاندان جیسے نمونے تم کو اپنی کتابوں میں بھی نہ ملے ہوں گی۔

اچھا خود کو بہت بہت پیار۔ اور موقع ملے تو کسی کو میری طرف سے بس ایک نظر دیکھ لینا۔ مگر ایک نظر سے زیادہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ''ہوگئی رقیب آخر تھی جو راز داں اپنی'' والا مضمون ہو جائے۔

تمھاری...... سلمہ

....

مسوری............۲۷؍جون

اوشا پیاری

کل ہی تمھیں ایک کافی طویل خط لکھ چکی ہوں۔ جو شاید آج ہی کی ڈاک سے نکلے گا اور اس خط کے ساتھ ہی تمھیں ملے گا۔

یہ مختصر سا خط جلدی میں صرف اس غرض سے لکھ رہی ہوں کہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے دفتر سے یہ پوچھ کر لکھو کہ کوئی لڑکی پرائیویٹ کینڈیڈیٹ کی حیثیت سے انٹر کا امتحان دے سکتی ہے یا نہیں؟ یہ بات شمو معلوم کرنا چاہتی ہے۔ (شمو یعنی ماتھر صاحب کی بیٹی شیام کماری، جس کی صحت اچھی نہیں ہے اور اس لیے اس کے پتا جی اس کی پڑھائی چھڑانا چاہتے ہیں۔ مگر وہ چاہتی ہے کہ جب تک صحت بہتر ہو، گھر پر پڑھ کر امتحان دے سکے۔)

دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب (یعنی اپنے پاپا) سے پوچھنا کہ اگر کسی لڑکی کو ہر تیسرے چوتھے دن پیٹ میں سخت درد ہوتا ہو (کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف) اور ایکسرے میں اپنڈکس نہ نکلے اور نہ اسٹول میں کیچوؤں یا کیڑوں کا ہونا ثابت ہو تو اور نہ پرانی پیچش ہو تو یہ کیا بیماری ہو سکتی ہے۔ درجنوں ڈاکٹر شمو بچاری کا معائنہ اور علاج کر چکے ہیں مگر اب تک کوئی صحیح تشخیص نہیں کر سکا۔

اس خط ج کا جواب واپسی ڈاک سے دینا۔

بہت ہی جلدی میں

تمھاری.....سلمہ

P.S. ''وہ'' نظر پڑے تو میرا ذکر بالکل نہ کرنا۔ وہ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو؟ دس دن ہو گئے مجھے خط لکھے ہوئے۔ اور اب تک جواب میں ایک سطر بھی نہیں آئی۔

....

مسوری......۳؍جولائی

اوشا ڈارلنگ!

تمھارے پاپا کی تشخیص سچ مچ صحیح نکلی۔ شمو کے پیٹ کا درد واقعی ہسٹیریا ہی کی ایک نئی شکل نکلا۔ ایسا لگتا ہے اس کا ''سب کونشس''، یعنی تحت الشعور اپنے پتا جی کی توجہ، سوتیلی ماں کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کرتا ہے۔ تم کہو گی مجھے یہ کیسے معلوم ہوا؟ تو سنو۔ پچھلے اتوار کا ذکر ہے کہ روپ تو دن گزارنے اپنی سہیلی بیگم نقشبندی کے ہاں گئی ہوئی

تھیں۔(دونوں ایک ہی درزی سے کپڑے سلواتی ہیں اور ہر ہفتے نئے کپڑے ڈیزائن کرانے کے لیے مشترکہ کانفرنس کرتی ہیں) ماتھر صاحب دن بھر شمو کے پاس بیٹھے کیرم کھیلتے رہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہی میں روپ سے اس ہفتے کا ''اسکرین'' مانگنے گئی۔ (اس میں خبر چھپی ہے کہ رام کمار بچارے کو پلوروسی ہوگئی ہے...... کئی ہفتے سے بیمار ہے اور اس کی جتنی فلمیں بن رہی ہیں، سب کی سب لٹک گئی ہیں) تو دیکھا شمو کی حالت بہت بہتر ہے۔ صبح کا درد کا دورہ بالکل نہیں ہوا۔ شام کو باہر جاتے ہوئے ممی نے کہا ''چلو ماتھر صاحب کے ہاں ہوتے چلیں۔ وہاں گئے تو ماتھر صاحب اور شمو بیٹھے چائے پی رہے تھے اور شمو بالکل خوش وخرم نظر آتی تھی۔ ماتھر صاحب کہنے لگے'' آؤ بھئی تم بھی ایک ایک پیالی چائے پیو۔ پھر ہم بھی ٹہلنے چلیں گے۔'' اتنے میں روپ آگئیں اور آتے ہی ماتھر صاحب سے کہنے لگیں: ''چلو سینما چلیں۔ آج رام کمار کی فلم ''کلنک'' کا آخری دن ہے۔'' ماتھر صاحب نے فرمانبردارانہ لہجے میں کہا: ''ہاں ہاں۔ ضرور ضرور۔ میں ابھی سیٹوں کے لیے فون کرتا ہوں۔ آج تو شمو کی طبیعت بھی اچھی ہے۔ اسے بھی لے چلتے ہیں۔'' مگر روپ نے ڈانٹ کر کہا: ''نہیں، ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے کو منع کیا ہے۔ وہ سینما نہیں جائے گی۔ چلو جلدی کرو۔ اپنا اوورکوٹ اٹھاؤ۔''

ماتھر صاحب تو اس وقت ایسے لگ رہے تھے جیسے ماسٹر کے سامنے اسکول کا بچہ۔ چپکے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہیٹ اسٹینڈ سے اپنا ہیٹ اور کوٹ اتار ہی رہے تھے کہ شمو کے کمرے سے اتنی خوفناک چیخوں کی آواز آئی کہ ہم سب اُدھر دوڑے۔ جا کر دیکھا کہ درد کے مارے بچاری بستر پر لوٹ رہی ہے اور ''ہائے میں مرجاؤں گی۔ ہائے میں مرجاؤں گی پتاجی'' چلاّ رہی تھی۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھنڈے برف مگر ماتھے پر پسینا پھوٹا ہوا تھا۔ آنکھوں کی پُتلیاں اوپر کو چڑھی ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو زور سے دبائے ہوئے۔ ''سلمہ بی بی'' ماتھر صاحب چلاّئے۔ ''ذرا ڈاکٹر کو فون تو کرو۔'' اور بہت ڈرے ڈرے انداز میں بیوی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے ''اب سینما تو......''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ روپ نے ان کی بات کاٹ کر پیر پٹختے ہوئے کہا؛ ''وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ تو آپ رہیے اپنی بیٹی کے پاس۔ میں جارہی ہوں۔ کیوں، سلمہ چلتی ہو؟''

رام کمار کی فلم دیکھنے کا شوق تو مجھے بھی بہت ہے مگر شمو کے خیال سے میں نے کہا: ''جی......

میں پھر کبھی دیکھ لوں گی۔ آج تو شمو کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔'' مگر ممی نے کہا: ''کوئی بات نہیں۔ میں یہاں ٹھہرے جاتی ہوں۔ تم پکچر دیکھ آؤ روپ کے ساتھ۔''

سو میں اور روپ ''کلنک'' دیکھنے گئے۔ رام کمار کی پچھلی فلم ''خواب'' کے بارے میں تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ مگر ''کلنک'' میں تو اس نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ایک شرابی شاعر کے کردار کو ایسی خوبی سے نبھایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ تم تو جانتی ہو کہ مجھے عام طور سے ہندستانی پکچرز نہیں بھاتیں۔ (ان میں وہ ہالی ووڈ کی شان و شوکت اور گلیمر بھلا کہاں؟) مگر رام کمار کی ہر فلم میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، (اس کا اپنا کام اتنا اچھا ہوتا ہے کہ میری جیسی سوپر کریٹک (Super Critic) بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ''کلنک'' میں کمزوری ہے تو صرف یہ کہ وہ بھینگی آنکھوں والی نیلما اس میں ہیروئین کا کام کرتی ہے۔ ایک سین میں بھی تو رام کمار کے سامنے آنے کی قابل نہیں ہوتی۔ نہ جانے اتنا بڑا اور مشہور اور قابل ایکٹر کیسے نیلما جیسی تھرڈ گریٹ ایکٹرسز کے ساتھ کام کرنے کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ فلم کے دوران میں روپ کہنے لگیں: ''کیوں سلمہ! اگر کسی لڑکی کو رام کمار جیسا خوبصورت اور اچھا شوہر مل جائے تو کیسا ہو؟ کیا اسے خوشی اور فخر سے شادی مرگ نہ ہو جائے؟'' میں نے کہا: ''اس وقت تو خود رام کمار کی جان کی خیر منانی چاہیے۔ بچارا پلوری جیسے خطرناک مرض کا شکار رہا ہے۔'' اس پر روپ نے چپکے سے میرے کان میں کہا: ''میں نے تو آج ہی منت مانی ہے کہ رام کمار اچھا ہو گیا تو ایک دن برت رکھوں گی اور دس روپے دان دوں گی۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا لو بھئی یہ پوری طرح ''فین کریز (Fan Craze) میں مبتلا ہیں!

میں بھی کتنی عجیب ہوں۔ چلی تھی شمو کی بیماری کا حال لکھنے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں تو اس رات کو جب سنیما سے ہم واپس آئے تو شمی (جسے ہم درد سے کراہتا اور بلبلاتا چھوڑ گئے تھے) پلنگ پر بیٹھی ماتھر صاحب اور ممی کے ساتھ رمی کھیل رہی ہے۔ بعد میں ممی نے بتایا کہ روپ کے سنیما چلے جانے کے بعد چند منٹ تک تو شمی درد کی شکایت کرتی رہی مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ درد غائب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب ڈاکٹر شرما آئے اور دو تین منٹ کا معائنہ کرنے اور اپنی سولہ روپے فیس لینے آئے تو شمی کا درد بالکل جاتا رہا تھا۔

جب ہی تو میں نے کہا کہ تمھارے پاپا کی تشخیص سولہ آنے ٹھیک نکلی۔ ان کو یہ سب سنا دینا۔

یہاں بارشوں کے بعد موسم میں کافی خنکی آچکی ہے۔ اس سیزن یہاں بڑی رونق ہے۔ بمبئی سے بڑے اسمارٹ لڑکوں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے جن سے اسکیٹنگ رینک (Skating Rank)

میں اکثر ملاقات کیا سچ مچ مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ تین چار بار دھڑام سے گرنے کے بعد میں رولر اسکیٹنگ کی ماہر ہوگئی ہوں۔ اسکیٹنگ ہے مزیدار مشغلہ۔ ڈانسنگ کا بھی مزہ آتا ہے اور ورزش کی ورزش ہو جاتی ہے۔ تم بھی اس سال یہاں آجاتیں تو بڑا مزہ آتا۔ اکیلی تو میں کسی سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔ مگر تم نہ جانے کیوں اس غضب کی گرمی سے لکھنؤ چپکی ہوئی ہو۔ اور وہ جناب، ان کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک نہایت روکھے اور غیر شاعرانہ قسم کے اکھڑ خط میں لکھتے ہیں: ''تمھیں مسوری کی بورژوا ٹھنڈک مبارک ہو۔ ہم تو لکھنؤ کی پرولتاری گرمی ہی میں خوش ہیں۔'' یہ میرے تین خطوں کا جواب ملا ہے جن میں میں نے مسوری آنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ آئے بڑے پرولتاری بن کے! جل ہی تو گئی میں یہ پڑھ کر۔

باقی آیندہ۔ اور کچھ لکھا تو خط کے بجائے پورا ناول نہ بن جائے اور خوامخواہ تمھیں پندرہ فیصد رائلٹی دینی پڑے۔

تمھاری......سلمہ

P.S. تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے کہ اچھی خاصی فلاسفی اور سائیکلولوجی چھوڑ کر (جو تمھارے محبوب مضامین تھے) تم اب اکنامکس میں ایم اے کرنا چاہتی ہو۔ جب ''وہ'' تمھیں بھی مارکسزم پر لکچر دے دے کر پورا کرے گا تب تمھیں اپنی حماقت کا احساس ہوگا۔ خیر تمھاری مرضی۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔

....

مسوری......۱۱رجولائی

اوشا!

یہ اسپیشل براڈکاسٹ مسوری سے کیا جا رہا ہے۔ ایک اہم خبر بلکہ مہااتم سماچار سنیے۔

روپ کا نیور لجیا یک بیک جاتا رہا ہے۔

شمی کا پراسرار پیٹ کا درد بھی غائب ہوگیا ہے۔

اور مسز نقشبندی نے آدھی آدھی درجن نئے ڈیزائن کے چولی بلاؤز سلنے کے لیے دے دیے ہیں۔

میں بھی مسوری کی بورڈم میں اب کسی قدر دلچسپی پیدا ہونے کی امید کر رہی ہوں۔

یہ کایا پلٹ کیوں بھلا؟ اس لیے کہ رام کمار آنے والا ہے۔ رام کمار فلمی دنیا کا محبوب ترین

ہیرو۔ مسوری آ رہا ہے تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے۔ اور جانتی ہو کہاں ٹھہرے گا؟ نہیں سوائے میں نہیں۔ نہ ہیک مینز میں، ہوٹل میں تو اس کے متوالے (اور متوالیاں اس کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے) اس لیے وہ ماتھر صاحب کے یہاں ٹھہرے گا۔ یہ کیسے؟ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ماتھر صاحب کے چچازاد بھائی ایک اور ماتھر بمبئی میں سنٹرل گورنمنٹ کے سپلائی کے دفتر میں کنٹرولر یا ڈائرکٹر یا کوئی چیز ہیں۔ وہ جس بلڈنگ میں رہتے ہیں اسی میں رام کمار بھی رہتا ہے۔ اس لیے ان کی کافی ملاقات بلکہ دوستی ہے۔ جب رام کمار کو ڈاکٹروں نے تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے چند روز مسوری جانے کو کہا تو ان بمبئی والے ماتھر نے اپنے کزن یعنی ہمارے والے ماتھر صاحب کو لکھا۔ وہ تو بچارے پہلے کافی نروس ہوئے۔ بولے: ''ارے بھئی، یہ فلم والے کافی بد دماغ ہوتے ہیں۔ لاکھوں روپے کماتے ہیں نا۔ نہ جانے یہ مسٹر رام کمار کس قسم کے آدمی ہیں۔ ہمارے گھریلو ماحول میں فٹ اِن ہو یا نہ ہو۔'' مگر روپ نے ڈانٹ کر کہا: ''آنے بھی دو نا بچارے کو۔ بیماری سے حال ہی میں اٹھا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرے گا تو ایک منٹ چین نہیں ملے گا۔ یہاں ہم سب مل کر اچھی طرح سے اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔'' اور ماتھر صاحب نے فوراً بات بدل کر کہا: ''ہاں ہاں میں خود یہی کہتا ہوں کہ ضرور بلانا چاہیے اور پھر رام کمار تو اپنے یو پی ہی کا رہنے والا ہے۔ اور اسکرین پر دیکھنے سے کافی شریف نظر آتا ہے۔''

اور سو رام کمار اگلے ہفتے آ رہا ہے اور مسوری کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہے...... اور مجھے روپ کے ہاں ایک امپورٹنٹ کانفرنس کے لیے جانا ہے جو انٹیریر ڈیکوریشن (Interior Decoration) کے سلسلے میں ہو رہی ہے...... اس لیے باقی آئندہ۔ رام کمار کے آنے پر۔

تمھاری...... سلمہ

P.S. تمھارے اکنامکس کے پروفیسر صاحب ملیں اور میرے بارے میں پوچھیں تو کہنا میں کافی مصروف رہی۔ اس لیے ان کے خط کا جواب نہ دے سکی۔ اگلے ہفتے فرصت ملی تو خط لکھوں گی۔

....

۲۳ر جولائی

اوشا پیاری!

معاف کرنا اتنے دن سے تمھارے خط کا جواب نہ دے سکی۔ کیا کروں پچھلے دس دن سے اتنا

ایکسائٹمنٹ رہا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ رام کمار کیا آیا ہے سارے مسوری اور خصوصاً ہمارے پڑوس میں ایک ہلچل مچ گئی ہے۔ آج ماتھر صاحب کے ہاں ڈنر تو کل مسز نقشبندی کے ہاں لنچ تو پرسوں ہمارے ہاں چائے۔ روز پکنک۔ کبھی کیمپٹی فال تو کبھی موسی فال، کبھی چنڈال چوٹی تو کبھی سنی بینک۔ غرض ایک گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔

تم نے رام کمار کے بارے میں پوچھا ہے کہ سچ مچ زندگی میں کیسا لگتا ہے؟ تو ایمان کی بات یہ ہے کہ پہلے پہلے اسے دیکھ کر مجھے تو کافی ڈس اپوئنٹمنٹ (Disappointment) ہوا۔ خاصا سانولا رنگ (فلموں میں تو میک اپ ہوتا ہے نا) سر پر بال غائب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ (فلموں میں نقلی بالوں کی وِگ پہنتا ہے) اور آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا بڑا انٹلکچول (Intellectual) قسم کا چشمہ۔ فینسی سوٹوں کے بجائے اکثر ایک نہایت موٹی ٹویڈ کا کوٹ پہنے رہتا ہے۔ اور دن میں تو پتلون پر صرف ایک کالی جواہر جیکٹ۔ (اس کی دیکھا دیکھی مسوری کے تمام فیشن ایبل نوجوانوں نے کالی جواہر جیکٹیں سلوالی ہیں)۔ ایکٹر کے بجائے ادیب یا چھوٹا موٹا پروفیسر (اور وہ بھی اکنامکس کا) معلوم ہوتا ہے۔ باتیں بھی کبھی کبھی اسی قسم کی کرتا ہے۔ ہاں اس کی آنکھوں میں وہی مقناطیسی چمک ہے جو اسکرین پر اس کے کلوز اپ میں نظر آتی ہے اور اس کی آواز میں وہی رومانی گہرائی ہے جو اسکرین پر سنائی دیتی ہے۔ (یاد ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی آواز حلق سے نہیں، دل سے نکلتی ہے) اور اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ ہے جو لاکھوں لڑکیوں کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتی ہے۔

ایک دن روپ نے بڑے رومانی انداز میں پوچھا: "کیوں رام! (پہلے دن وہ مسٹر رام کمار کہتی تھیں۔ دوسرے دن رام جی اور تیسرے دن ان سے صرف رام) تمھیں تو بچپن ہی سے ایکٹنگ کا شوق رہا ہوگا؟

اور اس نے نہایت غیر رومانی انداز میں کہا: "نہیں، مسز ماتھر (روپ اسے لاکھ کہتی ہیں کہ میں تم سے اتنی بڑی تھوڑا ہی ہوں۔ تم مجھے صرف روپ کہا کرو۔ مگر وہ برابر مسز ماتھر ہی کہتا ہے) بچپن میں تو ریل کے انجن کا ڈرائیور بننا چاہتا تھا اور اس کے بعد اپنے پتا جی کی طرح وکیل مگر کالج میں مجھے اکنامکس میں دلچسپی ہوگئی۔ اسی لیے اکنامکس میں ایم اے کر رہا تھا۔ جب پڑھائی چھوڑ کر بمبئی جانا پڑا۔ اب تک تو میں مارکسزم پر تھیسس لکھ کر پی ایچ ڈی بھی ہو جاتا۔

اکنامکس! مارکسزم! سچ کہتی ہوں ایک ایکٹر کی زبان سے یہ باتیں سن کر میں جل ہی تو گئی۔

(شاید اس لیے اور بھی کہ یہ باتیں پہلے کی سنی ہوئی ہیں) میں نے کسی قدر طنز بھرے لہجے میں پوچھا:
''تو مسٹر رام کمار! (وہ برابر مجھ سے کہتا ہے کہ مانا میرے بال غائب ہو رہے ہیں مگر میں تم سے عمر میں اتنا بڑا نہیں ہوں۔ تم مجھے صرف رام کہا کرو۔ مگر میں مسٹر رام کمار ہی کہتی ہوں) پھر آپ نے مارکسزم پر ریسرچ چھوڑ کر فلم لائن کیسے اختیار کرلی؟ آرٹ کی خدمت کا جذبہ ایک دم کیسے پیدا ہوگیا؟

''آرٹ کی خدمت؟ میرے الفاظ دوہرا کر وہ بڑے زور سے ہنسا۔ ''فلم لائن میں آرٹ کی خدمت کون بیوقوف کرتا ہے؟ اور سچ پوچھو تو تمھارے کالجوں یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم کی خدمت کون کرتا ہے؟ ہم سب...... ایکٹر ہوں یا پروفیسر...... صرف اپنے پیٹ کی خدمت کرتے ہیں۔ میں ایکٹر اس لیے بنا کہ پتا جی سورگباش ہوگئے اور ماتا جی میری یونیورسٹی کی پڑھائی کا خرچہ برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ ان دنوں میں نے ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور اپنا زیادہ تر وقت کافی ہاؤس میں گزارتا تھا۔ وہاں ایک دن رستم ایرانی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ نئے چہروں کی تلاش میں لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہو ایکٹر بنو گے؟ میں نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار سے کم نہ لوں گا۔ کیونکہ ڈیڑھ سو کی نوکری تو مجھے یہاں بھی مل سکتی ہے۔ اس نے کہا منظور ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پانچ سو روپے ماہوار دینے کو تیار تھا...... خیر اگلے کنٹراکٹ میں میں نے کسر پوری کرلی...... اور اس طرح میں انسان سے ایکٹر بن گیا۔'' یہ کہہ کر وہ خوب زور سے ہنسا۔ اتنے زور سے کہ مجھے اس ہنسی میں ایک عجیب کھوکھلاہٹ معلوم ہوئی جیسے وہ اصلی نہ ہو، نقلی ہو، فلمی ہو...... جیسے اس ہنسی کی تہہ میں ایک گہری مایوسی چھپی ہوئی ہو۔

اور شمی جواب تک خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے رام کمار کو تک رہی تھی۔ بولی:
''رام جی! کیا ایکٹر انسان نہیں ہوتا؟''

''نہیں۔'' کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولا: ''ایکٹر انسان نہیں ہوتا۔ یا یہ کہنا چاہیے کہ صرف آدھا انسان ہوتا ہے۔ آدھا، انسان اور آدھا مشین......'' اور پھر جیسے خود اپنے آپ سے بات کہہ رہا ہو یا با آواز بلند سوچ رہا ہو: ''آدھا انسان اور آدھا مشین؟ یہی ایکٹر کی ٹریجڈی ہے۔ وہ بھی دل اور دماغ رکھنے والا گوشت پوست کا انسان ہوتا ہے۔ مگر اس سے کام لیا جاتا ہے ایک جذباتی مشین کا۔ بٹن دبایا وہ بملا سے محبت کرنے لگا۔، بٹن دبایا وہ نیلما پر فریفتہ ہوگیا۔ بٹن دبایا وہ آوارہ

شہزادہ بن گیا۔ بٹن دبایا وہ رنگیلا شاعر بن گیا۔ بٹن دبایا وہ بھکاری گویا بن گیا۔ بٹن دبایا وہ سنت گیا نیشور بن گیا۔ بٹن دبایا وہ دیوداس بن گیا۔ بٹن دبایا وہ پورن بھگت بن گیا۔ بٹن دبایا وہ گانے لگا۔ بٹن دبایا وہ ہنسنے لگا۔ بٹن دبایا وہ رونے لگا...... اور پھر اس سے امید کی جاتی ہے کہ اس کی آوارگی میں بھی اصلیت ہو اور اس کی پارسائی میں بھی۔ اس کی ہنسی بھی قدرتی ہو اور اس کا رونا بھی۔ وہ شراب بھی سچ مچ کی پیے اور زہر بھی سچ مچ کا کھائے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ جب اسکرین پر عشق کرے تو جذبات کی گہرائی میں ڈوب جائے مگر اسٹوڈیو سے نکلتے ہی پاکباز برہم چاری اور مہاتما بن جائے۔ یہ سب جذباتی قلابازیاں کھانا یا تو کوئی سوپر مین (Super Man) کر سکتا ہے جو معمولی جذبات و محسوسات سے اونچی سطح پر رہتا ہو یا آدھا انسان یعنی ایکٹر...... وہ بدقسمت مشین جس کی ایکٹنگ میں زندگی گھلی ہوئی ہوتی ہے اور جس کی زندگی میں ایکٹنگ شامل ہو جاتی ہے۔''

بڑی ہی دلچسپ ہوتی ہیں اس کی باتیں۔ فلموں میں جو ڈائیلاگ اس سے بلوائے جاتے ہیں ان سے کہیں زیادہ دلچسپ۔ بس جی چاہتا ہے کہ بیٹھی سنتی رہوں۔ روز رات کو روپ کے ڈرائنگ روم میں بارہ ایک بجے تک بیٹھک ہوتی ہے۔ تب ہم لوگ اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ سویرے ناشتے کے فوراً بعد یہ سلسلہ پھر چل پڑتا ہے۔

ہاں، ایک بات لکھنا تو بھول ہی گئی۔ شمی کا پیٹ کا درد اور روپ کا سر کا درد دونوں جاتے رہے پچھلے دو ہفتے سے ایک بار بھی دورہ نہیں پڑا۔ جانتی ہو کس کے علاج سے؟ رام کمار کے۔ وہ اچھا ایکٹر ہونے کے علاوہ میچور ڈاکٹر بھی ہے۔ ہومیوپیتھی کا بہت ہی قائل ہے۔ کہتا ہے اس کی پلوریسی کو صرف ہومیوپیتھی کی دواؤں نے دور کیا ورنہ ایلوپیتھک ڈاکٹروں نے انجکشن دیتے دیتے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ بڑے مزے سے ایک دن کہنے لگا ''اگر دو چار اور انجکشن لگ جاتے تو مجھ میں اور چھلنی میں کوئی فرق نہ رہتا۔'' ہاں تو اب وہ ہومیوپیتھی کا نہ صرف زبانی پروپیگنڈا کرتا ہے بلکہ ہومیوپیتھی کی کتابیں پڑھتا ہے اور دوائیں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے سامان میں ایک کالا چمڑے کا بکس ہے جو ہومیوپیتھی کی ننھی ننھی شیشیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم لوگ اسے اکثر ان دواؤں کے بارے میں چھیڑتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ''ارے بھئی، آج کھانے میں کوئی چیز نہیں ملی۔ لاؤ ہومیوپیتھی دوا کی ایک پڑیا کھا لیں۔'' کوئی کہتا ہے ''یہ تو رام کے ہاتھ کا اعجاز ہے ورنہ ان پڑیوں میں پسی ہوئی شکر ہی تو ہے۔'' مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی دی ہوئی پڑیوں سے روپ کا

نیورلجیا جاتا رہا اور شمی کو بھی اب درد کے دورے نہیں پڑتے۔ مگر تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ رام کی موجودگی ہی ان دونوں کے لیے دوا ثابت ہوئی ہے۔ اور اس مسرت آمیز ہنگامہ خیزی میں وہ اپنی پرانی تکلیفوں کو بھول گئی ہیں۔

اور تو اور ماتھر صاحب بھی تو رام کے سخت گرویدہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے پاس ان کے انفیریورٹی کومپلکس کا علاج بھی ہے۔ کئی کئی گھنٹے وہ ان سے ان کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہتا ہے۔ اور ماتھر صاحب ٹھہرے شطرنج کے دھتی۔ رام کا بیان ہے کہ وہ بمبئی کے دس بارہ بہترین شطرنج کے کھلاڑیوں میں سے ہے۔ مگر ماتھر صاحب اس سے بھی اچھا کھیلتے ہیں۔ سطرنج کھیلتے وقت ان کا احساس کمتری بالکل جاتا رہتا ہے۔ اس میدان میں وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ کسی سے نہیں دبتے۔ بلکہ شطرنج کھیلتے وقت ان میں ایک نئی اور عجیب فاتحانہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنے مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جرنیل اپنی فوجوں کو مورچوں پر لگا رہا ہے۔ اس وقت وہ اپنی ادھیڑ عمر، گنجے سر، چیچک کے داغ، پائیوریا کی بُو سب کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے انھوں نے روپ کو شطرنج سکھانے کی بہت کوشش کی اور شاید اسی لیے روپ نے شطرنج میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔

ہاں تو یہ ہے آج کل اپنا لائف پیٹرن (Life Pattern)۔ دور سیوائے ہوٹل کا گھڑیال بارہ بجا رہا ہے...... اور سویرے ہی ہمیں پکنک پر جانا ہے۔ اس لیے اب یہ قصہ ختم ہی کرنا چاہیے۔

تمھاری...... سلمہ

....

مسوری...... ۸/اگست

ڈیر اوشا!

معاف کرنا تمھارے خط کا جواب اتنے دنوں بعد دے رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں بہت پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کس کو اپنی پریشانی سناؤں؟ تم مسوری ہوتیں تو پرانے دنوں کی طرح تمھارے سامنے اپنا رونا رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی۔ اب سوچتی ہوں خط ہی لکھ کر بھڑاس نکالوں۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ پاپا لکھنؤ سے مجھے اس لیے لائے تھے کہ احمد کو بھول جاؤں۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری قسمت پھوڑنے کے لیے اس کے علاوہ دوسری سازشیں بھی ہو رہی

ہیں۔

کل پاکستان سے ایک مہمان آئے ہیں چودھری حنیف اللہ۔ پاپا ان کو پیٹرنائز نگ طریقے سے ''ہیلو مائی بوائے'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ مگر عمر اڑتیں چالیس سے کم نہ ہوگی۔ انگریزی میں دستخط کر لیتے ہیں اور اخبار ہاتھ میں اُلٹا نہیں پکڑتے۔ بس تعلیم اتنی ہی ہے۔ پہلے کانپور میں چمڑے اور کھالوں کی تجارت کرتے تھے۔ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ایک ایک سال میں ان کی فرم کئی کئی لاکھ کھالیں ولایت اور امریکہ بھیجتی تھی۔ (کھالوں کی تجارت کرتے کرتے ان حضرت کی اپنی کھال بھی کافی موٹی ہوگئی ہے۔ کوئی مذاق کرو تو تاڑ پہچانتا ہی نہیں اور چھوٹی موٹی سنب (Snub) کرو تو شربت کی طرح پی جاتے ہیں) جون ۴۷ء میں جیسے ہی ملک تقسیم کا اعلان ہوا انھوں نے چپکے سے اپنی فرم اور جائیداد بیچ ڈالی اور اگست تک سارا روپیہ پاکستان پہنچا دیا۔ اب لاہور میں سرکاری ٹھیکوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ پاپا ان کے باپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لیے ان کے بلانے سے یہ حضرت ہندستان بلکہ مسوری تک تو آ گئے ہیں مگر ہر وقت جان اور مال کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ (مال کا خطرہ اس لیے کہ ۴۷ء تک کا کئی لاکھ انکم ٹیکس دینا ہے اور اگر انکم ٹیکس والوں کو معلوم ہوگیا تو ڈر ہے کہ یہیں گرفتار نہ کر لیے جائیں) جان کا خطرہ تو ہر وقت ہی لگا رہتا ہے۔ ہندستان میں ہمارے جیسے جو مسلمان رہ گئے ہیں ان کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے ہم قربانی کے بکرے ہیں جن کو آج یا کل ہندو اکثریت کے ہاتھوں ذبح ہونا ہے۔ کافی بیوقوف آدمی ہیں۔ اور ان کی حرکتیں اور باتیں دلچسپی کا سامان بن سکتی تھیں مگر وہ یہاں ''امیدوار'' کی حیثیت سے بلائے گئے ہیں یعنی پاپا مجھے ان کے ہاتھ بیچنا چاہتے ہیں۔ (ان کو امید ہے کہ حنیف صاحب کے اثر سے وہ بھی پاکستان پہنچ کر جائیداد یا بزنس وغیرہ کچھ حاصل کر لیں گے) اور مجھے غصہ تو اس بات پر آتا ہے کہ ان حنیف صاحب کا General Attitude ہماری طرح ایسا ہے جیسے ہم پر بڑا احسان کر رہے ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ کبھی سوچتی ہوں کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ کہیں نوکری کر کے گذارہ کروں۔ مگر اس قصائی کے ہاتھوں بکنے سے تو بچ جاؤں۔ مگر ایسی باتیں کہانیوں اور ناولوں میں تو آسان معلوم ہوتی ہیں۔ اصل زندگی میں مشکل نظر آتی ہیں۔ گھر چھوڑ کر جاؤں تو کہاں جاؤں؟ کہاں ٹھہروں؟ نوکری کیسی اور کہاں تلاش کروں؟ بی اے پاس لڑکیاں تو سیکڑوں کی تعداد میں آج کل ماری ماری پھرتی ہیں۔ کسی اسکول میں استانی ہو بھی گئی تو ساٹھ ستر روپے پر گزارہ کیسے ہوگا؟ اور پھر ماں باپ کو ناراض اور Defy کروں بھی تو کس کے سہارے پر؟ دنیا میں میرا ہے کون؟ احمد

کو اپنی اکنامکس اور مارکسزم سے کب فرصت ملتی ہے جو کسی کے جذبات کا خیال کریں۔اور میں اتنی Cheap تو نہیں بننا چاہتی کہ زبردستی کسی کے سر پر پڑ جاؤں۔غرض رات دن اسی ادھیڑ بن میں گزرتے ہیں۔دن بھر حنیف صاحب کی بکواس سُننی پڑتی ہے جو زیادہ تر کھالوں اور جوتوں کے بارے میں ہوتی ہے۔(کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر ایک کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کی چمڑی ادھیڑ لی جائے تو اس میں کتنے جوتے بن سکتے ہیں) اس کے بعد ممی اور بھائی جان کے لیکچر سننے پڑتے ہیں کہ ہندستان میں تو مسلمان لڑکیوں کو اب اچھے لڑکے مل ہی نہیں سکتے۔کیونکہ جتنے مالدار، تعلیم یافتہ عہدے دار مسلمان نوجوان تھے، وہ سب پاکستان چلے گئے ہیں۔اور پھر پاپا Indirectly ہر وقت حنیف کی تعریف کے پل باندھتے رہتے ہیں۔لاکھوں کا بزنس ہے، کروڑوں کی جائیداد ہے۔لاہور میں ایک جج کا دو منزلہ بنگلہ الاٹ ہوگیا ہے۔ایک سینما مل گیا ہے۔ایک جوتوں کا کارخانہ ہے۔گورنمنٹ سے ٹھیکے ملتے رہتے ہیں۔مری میں ایک خوبصورت کاٹیج ہے۔تین موٹریں ہیں وغیرہ وغیرہ۔غرض میری جان! قیمت اچھی مل رہی ہے۔اس کو کیا کیا جائے کہ ''پر طبیعت نہیں آتی''۔حنیف صاحب تاجرِ چرم کے ہاتھوں اپنی چمڑی اُدھیڑوانا منظور نہیں۔

دو دن سے نہ ماتھر صاحب کے ہاں گئی ہوں۔نہ رام کمار سے ملاقات ہوئی ہے۔وہ لوگ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ سلمہ کو کیا ہوگیا ہے۔مگر پاپا اور ممی کی خوشنودی کے لیے ہر وقت حنیف صاحب کی خاطرداری کرنی پڑتی ہے۔کیا کیا جائے۔

اتنا کچھ تمھیں لکھنے کے بعد دل کسی قدر ہلکا ہوا ہے۔دیکھو شاید کوئی صورت نکل آئے۔ جواب جلد دینا۔اس گھٹن اور جلن میں تمھارے خطوں ہی سے کسی قدر سکون ملتا ہے۔

تمھاری پریشان اور دل شکستہ

سلمہ

....

مسوری......۱۷ اگست

اوشا پیاری!

سب سے پہلے تو خوش خبری سن لو۔چودھری حنیف اللہ صاحب تاجر چرم ٹھیکیدار گورنمنٹ پاکستان کل لاہور واپس جانے کے لیے سامان باندھ رہے ہیں۔پاپا اور ممی اور بھائی جان تینوں

از حد ملول اور دل شکستہ ہیں اس لیے کہ حنیف صاحب نے مجھ سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے اور میں خوش ہوں...... اتنی خوشی کہ خوشی سے پھٹی جا رہی ہوں......

یہ ساری کایا پلٹ ہفتے بھر میں کیسے ہوئی؟ یہ بڑی دلچسپ کہانی بلکہ فلمی سینریو ہے اور اس کا ہیرو............ رام کمار!

سنو، ہوا یہ کہ جب دو دن تک میں ماتھر صاحب کے ہاں نہیں گئی تو تیسرے دن کیا دیکھتی ہوں کہ رام کمار صاحب ہمارے ہاں چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت پاپا اور ممی اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے اور بھائی جان حنیف صاحب کو لے کر ڈاک خانے گئے ہوئے تھے۔ (حنیف صاحب کو اپنے بزنس کے سلسلے میں کوئی اہم تار دینا تھا اور ایسے کام وہ کبھی نوکروں پر نہیں چھوڑتے)۔ میں گول کمرے میں بیٹھی ریڈیو کا ڈائل گھما رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور رام کمار صاحب 'ہیلو سلمہ'' کہہ کر داخل ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: ''کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ تم تو ایسی لگتی ہو جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ کہو تو اپنے کالے بکس میں سے ایک شکر کی پڑیا دے دوں...... یا اموشنل بخار چڑھا ہوا ہے۔ سنا ہے کوئی پاکستانی ڈان جوان آئے ہوئے ہیں۔'' یہ باتیں اس نے کچھ ایسی ملائمت ایسی ہمدردی اور ایسے مذاق طریقے سے کہیں کہ میں بے اختیار رو پڑی۔

''ارے ارے، یہ کیا؟ تم تو بالکل بچی نکلیں۔ کہو تو پریشانی کیا ہے؟'' پھر تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اس کو حنیف اللہ کی شانِ نزول بتا ہی دی۔

''ہوں'' اس نے سوچتے ہوئے کہا: ''یہ تو بڑی گڑبڑ ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟''

اور اس وقت نہ جانے کہاں سے ایک Daring خیال میرے دل میں آیا اور میں نے بک دیا: ''اس مشکل کو آپ ہی آسان کر سکتے ہیں رام صاحب۔''

''میں؟'' وہ گھبرا کر بولا: ''وہ کیسے؟''

پہلے تو میں ہچکچائی مگر پھر میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا: ''اگر آپ...... جھوٹ موٹ...... چند روز کے لیے...... میرا مطلب ہے...... کہ...... مجھ میں دلچسپی لینے لگیں...... تو حنیف صاحب Shock ہو کر بھاگ جائیں گے۔''

''اوہ!'' اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں جیسے کسی بچے کو کوئی بڑا دلچسپ کھلونا کھیلنے کو مل جائے۔ ''یہ تو آسان بات ہے۔ اور جھوٹ موٹ کیا، تم میں دلچسپی لینا بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا اور میں نے سوچا: ''وہ مذاق کر رہا ہے ورنہ جس پر ہندستان کی خوبصورت

سے خوبصورت لڑکیاں جان دیتی ہیں وہ بھلا مجھ میں دلچسپی کیسے لینے لگا۔ مگر اس نے کہا: ''اب تم فکر نہ کرو۔ تاجر چرم کو مسوری سے بھگانا میرے ذمے ہے۔''

''تو پھر کب سے آپ......؟'' میں پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ ناٹک کب سے شروع ہوگا؟ میری ہکلاہٹ اور ہچکچاہٹ کے باوجود وہ میرا سوال سمجھ گیا اور بولا: ''کب سے کیا، آج سے، ابھی سے۔''

اسی وقت باہر سے باغ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور پھر حنیف اور بھائی جان کے جوتوں کی چرمراہٹ۔ رام کمار اپنی کرسی سے اٹھا اور میری کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گیا اور بڑی محبت سے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

دروازہ کھلا اور حنیف صاحب اور بھائی جان داخل ہوئے۔ میرا رنگ تو فق ہو ہی گیا کہ اب کیا ہوگا؟ مگر رام کمار بھی گھبرا گیا اور گڑبڑا کر میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے چور چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب اس کی ایکٹنگ تھی) اور کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بھائی جان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''اوہ ہیلو سلیم۔ کہو کیسے ہو؟ کئی دن سے ملے نہیں۔'' اور پھر حنیف کی طرف دیکھ کر ''بھئی اپنے دوست سے تو ملاؤ۔''

بھائی جان نے اپنے غصے اور خفت کو کنٹرول کرتے ہوئے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ ''آپ ہیں ہمارے دوست حنیف اللہ صاحب۔ پاکستان سے آئے ہیں اور یہ ہیں مسٹر رام کمار۔ بڑے مشہور فلم اسٹار۔ ان کو تو اسکرین پر آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔''

حنیف نے بددلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''اوہ ایکٹر!'' اور جس طرح اس نے ''ایکٹر'' کا لفظ ادا کیا اس میں حقارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ''نہیں میں نے نہیں دیکھا۔ میرا اپنا سنیما ہے۔ مگر میں فلمیں نہیں دیکھتا۔ اول تو فرصت نہیں ملتی اور پھر......کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔''

''اچھا ہی کرتے ہیں آپ۔ فلموں میں دھرا ہی کیا ہے۔ فلم بنانے سے جوتا بنانا کہیں زیادہ دلچسپی کا کام ہے۔'' اور پھر فوراً ہی بھائی جان سے مخاطب ہو کر ''کہو سلیم! اسکیٹنگ کو چلتے ہو؟''

بھائی جان نے منہ بنا کر کہا: ''نہیں۔ تم جاؤ۔ مجھے حنیف صاحب کے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

''اچھا تو بائی بائی۔ آداب عرض حنیف صاحب۔ آؤ سلمہ ہم چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور ان دونوں کو مبہوت چھوڑ کر مجھے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

باغ میں پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا: ''بے فکر رہو۔ اب حنیف صاحب تم سے کبھی شادی نہ کریں گے۔ مگر اس کام کے انعام میں میرے ساتھ اس وقت اسکیٹنگ کو چلنا ہوگا۔''

اس شام کو ہم لوگ دو گھنٹے تک اسکیٹنگ کرتے رہے۔ سارے مجمع کی نظریں ہم پر تھیں۔ تمام لڑکیاں مجھے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ پانچ بجے کے قریب بھائی جان اور حنیف وہاں آئے۔ ہم لوگوں کو اسکیٹنگ کرتے ہوئے دیکھا اور واپس جانے لگے۔ مگر رام نے (جو رولر اسکیٹوں پر بجلی کی رفتار سے چل سکتا تھا) انھیں دروازے کے قریب پکڑ لیا۔ ''ارے سلیم! کہاں چلے؟ آیئے حنیف صاحب۔ آپ کو اسکیٹنگ کرائیں۔''

''شکریہ۔ مگر ہم ہیک منیز جا رہے ہیں۔'' حنیف صاحب نے کہا اور وہ دونوں چلے گئے۔

چند منٹ بعد رام نے کہا: ''اب اسکیٹنگ سے جی گھبرا گیا ہے۔ چلو ہیک منیز میں ڈانس کریں گے۔ تمھیں ڈانس کرنا آتا ہے نا؟''

''ہاں آتا تو ہے تھوڑا تھوڑا۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی ڈانس کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کسی زمانے میں سیکھا تھا۔ کوئی خاص پسند نہیں۔ اس لیے مدت سے چھوڑ رکھا ہے۔ مگر آج تو ڈانس کرنا ہی پڑے گا۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔''

اور سو ہم ہیک منیز پہنچے پاپا اور ممی اب تک نہیں آئے تھے۔ حنیف اللہ صاحب اور بھائی جان ایک کونے میں بیٹھے وہسکی پی رہے تھے اور ان کے قریب سے ہم گزرے تو حنیف کو کہتے سنا کہ پاکستان میں تو شریعت والوں کے ڈر سے چھپ کر پینی پڑتی ہے۔ یہاں تو پی لیں۔'' رام سیدھا مجھے ڈانس فلور پر لے گیا۔ بینڈ ''بلو ڈینیوب'' (Blue Danube) کا والٹز بجا رہا تھا۔ روشنیاں دھیمی ہوتی گئیں اور ہم ڈانس کرتے رہے اور موسیقی کی لہروں پر بہتے بہتے نہ جانے کہاں پہنچ گئے۔ مگر اس نے ایک بار بھی دھیمی روشنیوں سے فائدہ اٹھا کر چومنے کی کوشش نہیں کی اور نہ غیر ضروری حد تک مجھے سینے سے چمٹایا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنے اوپر بعض حدیں عائد کر لی ہیں اور ان کے بارے میں بڑی احتیاط برت رہا ہے۔ ہاں جب بھائی جان اور حنیف صاحب کی میز کے قریب سے ہم ڈانس کرتے ہوئے گزرے تو اس کا منہ میرے اور قریب آ جاتا۔ یہاں تک کہ میں اس کا گرم گرم سانس اپنے گال پر محسوس کرتی...... اور میرے لیے یہ یاد رکھنا مشکل ہو جاتا کہ ہم صرف ایک ناٹک رچا رہے ہیں۔ سچ مچ کا معاشقہ نہیں ہو رہا۔

جب والٹز ختم ہوا اور روشنیاں ابھر آئیں تو ہم نے دیکھا کہ حنیف صاحب اور بھائی جان اپنی میز سے غائب ہیں مگر پاپا اور ممی ایک اور میز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

''ہیلو کنور صاحب۔'' رام پاپا سے بڑے تپاک سے ملا اور ممی کو بڑے ادب سے نمستے کیا۔ ''آپ کی لڑکی نے تھوڑی سی پریکٹس اور کی تو اچھا ڈانس کرنے لگے گی۔''

پاپا تو تم جانتی ہو سوشل ایٹیکیٹ کے بڑے قائل ہیں۔ انھوں نے غصے کی جھلک بھی چہرے پر نہ آنے دی۔ رام سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب گھڑی نے سات بجائے تو پاپا نے کہا: ''چلو سلمہ، گھر چلیں۔ حنیف صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

مگر رام نے فوراً بات کاٹ کر کہا ''معاف کیجیے گا کنور صاحب! مگر سلمہ تو آج ہمارے ساتھ ماتھر صاحب کے ہاں کھانا کھا رہی ہے...... بات یہ ہے...... کہ آج میری سالگرہ ہے...... اس لیے آج تو اسے آنا ہی پڑے گا۔ ارادہ آپ سب کو بھی بلانے کا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

پاپا نے زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے اجازت دے دی۔

راستے میں رکشا میں میں نے پوچھا: ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج آپ کی سالگرہ ہے۔ ورنہ میں کوئی تحفہ لاتی۔''

''اوہ سالگرہ!'' اس نے کہا جیسے اس کے بارے میں بالکل بھول گیا ہو۔ ''ہاں سالگرہ...... ایکٹر کی سالگرہ کیا۔ وہ تو روز پیدا ہوتا ہے اور روز مر جاتا ہے۔'' اور ایک ٹھنڈی سانس ایک کھوکھلے قہقہے میں کھو گئی۔

ماتھرز کے ہاں پہنچے تو ڈرائنگ روم کو خالی اور ویران پایا اور صرف ماتھر صاحب اکیلے بیٹھے شطرنج کے مہروں کو اُلٹ پلٹ رہے تھے۔

''ارے بھائی رام! کوئی دوا دو'' انھوں نے پریشان نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ''روپ کو آج پھر نیورلجیا کا دورہ پڑ رہا ہے۔''

رام نے کالا بکس کھولا ہی تھا شمو کے کمرے سے چیخوں کی آواز آئی۔ میں اور ماتھر صاحب اُدھر دوڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شمو اپنے پلنگ پر پڑی درد کے مارے کراہ رہی ہے۔ ماتھر صاحب نے بیٹی کو سنبھالتے ہوئے مجھ سے کہا: ''جانا سلمہ، ذرا شمو کے لیے بھی دوا لانا۔''

رام نے ایک شیشی نکالی۔ اس میں سے دوا نکال کر دو پڑیاں بنائیں۔ شمو کے کمرے میں

جا کر ایک پڑیا اسے اپنے ہاتھ سے کھلائی۔ تھوڑی دیر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر بڑے نرم لہجے میں کہا: ''بس اب تمھارا درد جاتا رہے گا۔'' اور سچ مچ اسی دم شمو کے کرب میں کمی ہوگئی اور چند منٹ کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور کمزوری آواز میں کہا: ''تھینک یو رام جی۔'' پھر وہ روپ کے کمرے میں گیا۔ اسی دوا کی دوسری پڑیا ان کو دی۔ ان کے سر کو ہلکے ہلکے دبایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کا نیورلجیا کا دورہ بھی دھیما پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا: ''دیکھیے مسز ماتھر! آدھے گھنٹے میں آپ کا درد دور ہو جانا چاہیے۔ آج میری سالگرہ ہے۔ اس لیے کھانے کے بعد میں آپ سب کو سنیما لے چل رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر کمرے میں آ گیا۔

میں نے پوچھا: ''مگر مسز ماتھر کو نیورلجیا ہے اور شمو کے پیٹ میں درد۔ یہ کون سی دوا ہے جو آپ نے دونوں کو دے دی ہے؟''

اس نے کہا: ''اگنیشیا (Ignatia) ہسٹیریا کی ہر شکل میں فائدہ کرتی ہے۔''

بلیو اِٹ اور ناٹ (Believe it or not) آدھے گھنٹے میں روپ اور شمو دونوں کو اتنا افاقہ ہوا کہ نہ صرف کھانے کی میز پر آئیں بلکہ سنیما بھی گئیں۔ جب رام نے مجھے سنیما چلنے کی دعوت دی تو میں نے کہا: ''آپ چاہتے ہیں کہ آج مجھے گھر سے بالکل ہی نکال دیا جائے؟'' اور اس کے جواب سے لاجواب ہوگئی۔ اس نے کہا: ''شاید آپ کی مشکلات کا یہی حل ہے۔ آپ اپنے گھر کے دروازے تک آ گئی ہیں۔ اندر آپ واپس جانا نہیں چاہتیں۔ باہر آنے کی آپ میں ہمت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اگر آپ کے والدین آپ کو گھر سے نکال دیں تب ہی باہر کی دنیا میں آ سکتی ہیں ورنہ ہمیشہ آپ دہلیز پر اسی طرح کھڑی رہیں گی اور ایک قدم اندر اور ایک باہر۔''

سنیما کے بعد گھر پہنچی تو پاپا ڈرائنگ روم میں انگیٹھی کے پاس بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی گرج کر بولے: ''اب آئی ہو؟'' میں کچھ کہنے والی ہی تھی کہ حنیف صاحب ایک لبادہ نما ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ میری طرف ایک نظر دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ پاپا کے قریب جا کر مجھے سنانے کے لیے کہنے لگے: ''پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بے پردہ لڑکیوں کی چوٹیاں کاٹ دیتے ہیں۔'' یہ سن کر میں جل ہی تو گئی مگر میں نے خاموش رہنے ہی میں خیریت سمجھی۔ میں جانتی تھی ایک مہمان کے سامنے پاپا کبھی مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس لیے غراپ سے اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کرتے ہی سوچ آف (Switch Off) کیا اور اپنے بستر کے اندر۔

اگلے دن تو میں نے ڈھٹائی پر کمر باندھ لی کیونکہ حنیف سے چھٹکارا پانے کی یہی ایک صورت تھی کہ رام کمار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں۔ شام کو ہم لوگ اکٹھے ٹہلنے نکلتے۔ لائبریری کے سامنے سے گزرتے تو سارے مجمع کی نگاہیں ہم پر ہوتیں۔ لڑکیاں تو رشک اور حسد سے دیکھتی ہی تھیں، لڑکے بھی مجھے ایک نئے ڈھنگ سے دیکھنے لگے۔ گویا افسوس کر رہے ہوں کہ انھوں نے میرا نوٹس لینے میں پہل کیوں نہ کی۔ اسکیٹنگ، ہیک مینز، ہال روم، سنیما، ہر جگہ ہم ساتھ نظر آتے۔ ایک مقامی اخبار نے تو ہماری منگنی کی خبر بھی شائع کر دی اور کل جب ''اسکرین'' کا پرچہ آیا تو اس کے پہلے صفحے پر ہی ہماری تصویر جو ڈانس کرتے وقت کسی نے فلیش لائٹ سے لی تھی۔ (تم نے بھی یہ تصویر شاید دیکھی ہوگی) اس تصویر کا چھپنا تھا کہ حنیف صاحب نے مجھ سے فورمل بات چیت بھی بند کر دی اور سامان باندھنا شروع کر دیا......

پاپا خفا ہیں۔ ممی خفا ہیں۔ بھائی جان سے بات کرتی ہوں کہ وہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ حنیف صاحب کے جاتے ہی مجھ پر وہ ڈانٹ پڑے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا مگر فی الحال تو صرف یہ اطمینان ہے کہ حنیف صاحب جا رہے ہیں اور میری کھال کے جوتے نہیں بنیں گے۔ آگے جو ہوگا وہ بھگت لیا جائے گا۔

تمھاری......سلمہ

P.S. میری جان! مہربانی کر کے ان سب باتوں کو اپنے تک ہی رکھنا۔

....

۲۹ راگست

اوشا، مائی ڈیئر!

تمھارے دونوں خط ملے۔ تم نے اکنامکس پڑھنی شروع کر دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خوامخواہ اپنے پروفیسر صاحب کی طرف داری کرو۔ میں ان کو ہرگز خط نہیں لکھوں گی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں کہ مجھے خط میں لکھتے ہیں: ''سنا ہے وہ اُلّو رام کمار آج کل مسوری آیا ہوا ہے اور رئیسوں کی بیٹیاں پروانوں کی طرح اس پر فدا ہو رہی ہیں۔'' ان سے کہنا ذرا شیشے میں اپنی صورت تو دیکھیں اور پھر رام کمار پر فقرے کسیں اور اگر وہ اسے مذاق سمجھتے ہیں تو مجھے ایسے مذاق نہیں پسند۔

لگتا ہے تم بھی فلم ایکٹروں کو تعصب کی عینک سے دیکھتی ہو۔ بھلا یہ تم کو کیسے خیال ہو گیا کہ رام کمار Shallow اور اوچھا ہے۔ تم اس کی باتیں سنو تو دُم ہو جاؤ۔ دنیا کے معاملات پر اس کی نظر

تمھارے بہت سے پروفیسروں (خصوصاً اکنامکس کے بعض پروفیسروں) سے کہیں زیادہ گہری ہے۔

پرسوں ہم دور تک ٹہلنے گئے تھے۔ راستے میں میں نے کہا: ''اتنے دن آپ کو یہاں آئے ہوئے ہوگئے ہیں۔ مگر آپ نے فلمی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

رام نے کہا: ''دیکھو بھئی، میں فلمی دنیا سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں اور تم اپنے سوالات سے مجھے پھر اسی دلدل میں دھکیلنا چاہتی ہو۔'' اور پھر تھوڑی سی دیر کی خاموشی کے بعد ''سوچتا ہوں تمھیں فلمی دنیا کے کسی پہلو کے بارے میں بتاؤں۔ ان فلم اسٹاروں کے بارے میں جو حسین ہیں مگر جن کو سچی محبت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ ان ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے فی پکچر لینے والی ہیروئینوں کے بارے میں جو دن اور رات شوٹنگ کے کولھو میں پلتی ہیں تاکہ ان کے بھائی یا باپ یا ماموں یا نام نہاد گارڈین ان کی کمائی سے شرابیں پئیں، رنڈی بازی کریں جوا اور سٹہ کھیلیں۔ شارک سکن کے سوٹ پہن کر بیوک اور پیکارڈ کاروں میں گھومیں؟ یا ان کے بارے میں جن کے نام سے بنکوں میں کئی لاکھ روپے جمع ہیں مگر جن کو پانچ پانچ برس تک ایک ہفتے کی چھٹی نصیب نہیں ہوتی؟ ان کے بارے میں جو امریکن فلموں کی کہانیاں چرا کر بیس بیس ہزار میں بیچتے ہیں یا ان کے بارے میں جن کو چند سو روپے ان فلموں کی کہانیوں، مکالموں اور گانوں کے ملتے ہیں جن کے ٹائٹلز پر کسی اور کا نام آتا ہے؟ ان ایکسٹراز کے بارے میں جو برسوں تین چار روپے روز پر Crowd Scenes میں کام کرتے ہیں اس امید موہوم میں کہ کسی دن ان کی قسمت بھی چمکے گی اور وہ اشوک کمار اور موتی لال اور راج کپور کی جگہ لیں گے؟ یا ان قلیوں کے بارے میں جو ڈیڑھ روپے روز پر بندروں کی طرح رسیوں پر چڑھتے ہیں اور بھاری بھاری لائٹوں کو اسٹوڈیو کی چھت سے لٹکے ہوئے تختوں پر لگاتے ہیں اور ہر گھڑی اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ ان شریف زادیوں کے بارے میں جن کا کردار کوٹھے والوں سے بدتر ہے یا ان طوائف زادیوں کے بارے میں جو سنجیدہ اور شریف ہیں۔ ان بیوقوفوں کے بارے میں جو اپنے آپ کو Genius سمجھتے ہیں یا ان Geniuses کے بارے میں جن کو سب بیوقوف اور الّو سمجھتے ہیں۔ فلمی دنیا بھی دنیا کی طرح سب رنگ ہے سلمہ۔''

جو آدمی ایسا فلسفیانہ نظریہ رکھتا ہو کیا اس کو چھچھورا کہا جا سکتا ہے؟

تمھارے اس فقرے کو پڑھ کر کہ 'رام کمار فلم ایکٹر ہے فلم ایکٹر۔ بچ کے رہنا۔'' مجھے غصہ بھی

آیا اور ہنسی بھی۔ غصہ اس لیے کہ لگتا ہے تم بھی عام لوگوں کی طرح یہ سمجھتی ہو کہ ہر فلم ایکٹر آوارہ، بدمعاش بلکہ حسن کا ڈاکو اور بھولی بھالی لڑکیوں کی عصمت کا لٹیرا ہوتا ہے اور اس گروہ میں تم رام کمار کو بھی شامل کرتی ہو۔ اور ہنسی اس لیے کہ تمھارا خدشہ کتنا غلط ہے۔ پچھلے تین چار ہفتے میں درجنوں بار ہم اکیلے ملے ہیں۔ اجالے میں بھی اور اندھیرے میں بھی۔ ساتھ ڈانس بھی کیا ہے اور دور تک واک کو بھی گئے ہیں۔ مگر اب تک ایک بار بھی اس نے کوئی غیر شریفانہ اقدام نہیں کیا۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ بور ہونے کی حد تک شریف ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مزا یہ ہے کہ دوسروں کی موجودگی میں وہ مجھ سے زیادہ بے تکلفی سے بات کرتا ہے۔ Flirtatious انداز میں مذاق بھی کرتا ہے لیکن جب صرف ہم دونوں ہوتے ہیں اور کوئی تیسرا نہیں ہوتا، تو وہ بڑی احتیاط سے اپنے اور میرے درمیان شریفانہ فاصلہ رکھتا ہے۔

بات یہ ہے اوشا کہ تم نے ''رام کمار دی ایکٹر'' کو اسکرین پر دیکھا ہے اور مجھے ان دنوں میں ''رام کمار دی مین'' کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور تم سے یہ کہنے میں مجھے کوئی پردہ نہیں کہ میں اسے بہت پسند کرنے لگی ہوں۔ اور شاید وہ بھی...... پرسوں وہ مجھ سے کہنے لگا: ''جانتی ہو سلمہ! میری زندگی میں تم پہلی لڑکی ہو جس سے میں دل کھول کر دوستوں کی طرح بات کر سکتا ہوں۔''

کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ باوجود اپنی تمام کامیابی اور شہرت کے اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ شاید محبت کی۔ لگتا یہ عجیب ہے کہ وہ نوجوان جس پر ہزاروں لڑکیاں جان دیتی ہیں اور جو اسکرین کی ہر حسینہ کے ساتھ فلموں میں عشق کر چکا ہے، اپنی پرائیویٹ زندگی میں محبت کی کمی محسوس کرے۔ مگر واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے سلمہ، وہ ایک دن کہنے لگا: ''بغیر Under standing کے محبت مکمل اور پائیدار نہیں ہو سکتی اور ہم میں سے کتنے ہیں جو دوسروں کو تو کیا اپنے آپ کو سمجھنے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں۔'' اور پھر یکا یک میری نظروں سے اپنی نظریں بچا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے: ''کیوں سلمہ! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟ معمولی فلرٹیشن نہیں جو مسوری اور نینی تال کی رومانی فضا میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں بلکہ اصلی، سچی، گہری محبت جو انسان کی زندگی کو رنگینی اور موسیقی اور خوشی سے بھر دیتی ہے اور ساتھ ہی اس کو پہلی بار دُکھ اور غم سے آشنا کرتی ہے۔ یہ محبت بھی بہت عجیب بیماری ہے۔''

اور نہ جانے کیوں...... نہ جانے کیسے...... میرے جی میں آیا کہ اسے سب کچھ بتا دوں۔ وہ بھی جو اس وقت تک میں اپنے آپ سے بھی چھپائے ہوئے تھی۔ شاید اس لیے کہ میرا خیال تھا اور

ہے کہ وہ میرے (یا کسی اور کے) دل کا حال مجھ سے بہتر جان سکتا ہے اور میری جذباتی Problems کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ میں نے اس کو احمد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ کیسے ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ کیسے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ کون کون سی باتوں میں ہم ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور کن باتوں میں ہمارے اختلافات ہیں۔ پھر احمد کی نفسیاتی خصوصیات کے بارے میں اس کی ضرورت سے زیادہ شدید خودداری کے احساس کے بارے میں کیونکہ میرے والد تعلقہ دار ہیں اور وہ ڈھائی سو روپے ماہوار پانے والے لکچرار ہے۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے نہیں کہتا۔ یہاں تک کہ کبھی اس نے محبت کا اقرار تک نہیں کیا...... ایسے آدمی سے کب تک کوئی محبت کر سکتا ہے؟ کب تک کوئی انتظار کر سکتا ہے؟

اور اس نے مسکرا کر: ''محبت منطق کو نہیں مانتی سلمہ۔ اور انتظار...... اگر چیز انتظار کے قابل ہو تو آدمی عمر بھر انتظار کر سکتا ہے۔'' اور نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ''ہاں سلمہ! عمر بھر انتظار کر سکتا ہے۔'' اور پھر جیسے اس نے دفعتاً اپنے جذبات کی عریانی پر مذاق کا پردہ ڈالنا چاہا۔ وہ ہنس کر بولا: ''مگر یہ خوش قسمت مگرٹٹ پونجیا پروفیسر ہے کون؟''

میں نے کہا: ''آپ نہیں جانتے شاید۔ اس کا نام ہے...... احمد۔''

''احمد؟ اکنامکس والا احمد حسین تو نہیں؟''

میں نے کہا: ''ہاں، وہی۔ کیوں کیا آپ احمد کو جانتے ہیں؟''

''ہاں۔ کسی قدر میں بھی اکنامکس کا اسٹوڈنٹ تھا نا۔'' اور اس کے بعد نہ جانے کیوں اس نے گفتگو کا رُخ ایک دم بدل دیا اور ہم ماتھر خاندان کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

تو اوشا جانی! یہ ہے میری جذباتی زندگی کا دوراہا۔ دنیا میں تم ہی تو ہو جس سے میں یہ سب کچھ کہہ سکتی ہوں اور جس سے میں مشورہ کر سکتی ہوں۔ خدا کے لیے ان باتوں کا ذکر نہ کرنا کسی سے۔ مگر اپنی رائے ضرور لکھنا۔

سلمہ

....

۱۴ر ستمبر

اوشا!

سوچتی ہوں یہ زندگی کامیڈی ہے یہ یا ٹریجڈی؟ ایک کامک ٹریجڈی یا ایک ٹریجک

کامیڈی۔ یا کٹھ پتلیوں کا ایک بے معنی ناٹک۔ اور بھگوان یا خدا یا کرم یا قسمت کے ہاتھوں میں دو ڈوریاں ہیں جن سے ہم انسانوں کو اٹھایا بٹھایا، ہنسایا رُلایا جاتا ہے۔ یا (جیسا ہم نے مارکسیسٹ اکنامکس کی کتابوں میں پڑھا ہے) سماجی اور سیاسی اور معاشرتی حالات ہماری ذاتی زندگیوں یہاں تک کہ ہمارے جذبات ومحسوسات کی بھی تشکیل کرتے ہیں۔

پچھلے چند دنوں میں میری اپنی زندگی نے جو پلٹے کھائے ہیں، ان کے بارے میں سوچ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔

اپنی اور رام کمار کی جس گفتگو کے بارے میں میں نے تمھیں لکھا تھا نا اس کے چار روز بعد ایک دن سویرے جو میں ماتھرز کے ہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ روپ کو صبح صبح ہی نیورلجیا کا سخت دورہ پڑ رہا ہے اور شمو کو پیٹ کے درد کا۔ مجھے دیکھتے ہی ماتھر صاحب بولے: ''سلمہ بیٹی! تمھیں معلوم ہے رام کون سی دوائیں ان کو دیا کرتا تھا؟ ذرا دینا نکال کے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ جلدی میں اپنا یہ کالا دواؤں کا بکس بھول گیا ہے۔''

''بھول گیا ہے؟ کیا رام صاحب چلے گئے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔ کل رات کو ایک بجے بمبئی سے تار آیا کہ اسے فوراً واپس آجانا چاہیے۔ اس کی نئی فلم ''سپنے'' کی مہورت ہے۔ اس لیے وہ آج بہت سویرے ہی چلا گیا...... ہاں۔ ذرا جلدی کرنا۔ وہ دوا نکالنا......''

میں بھونچکی سی رہ گئی۔ مگر کونے میں رکھا ہوا دواؤں کا بکس کھولا تو دیکھا کہ اس میں ساری شیشیاں غائب ہیں۔ صرف ایک دوا کی شیشی رکھی ہے۔ ''اگنیشیا'' اور اس پر نام کے نیچے رام کے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ''ہسٹیریا کی شکل میں اکسیر ہے۔ رام کا نام لے کر کھائی جائے تو ضرور فائدہ ہوگا۔''

''سنا تم نے؟'' میں نے شمو کو دوا کھلاتے ہوئے کہا: ''رام لکھ گیا ہے کہ رام کا نام لے کر یہ دوا کھائی جائے تو تمھیں ضرور فائدہ ہوگا۔''

اور یہ سن کر شمو کو باوجود درد کے ہنسی آگئی۔ کہنے لگی: ''رام جی بڑے مزاقیہ ہیں۔ دیکھا میری آٹوگراف بک میں کیا لکھ گئے ہیں۔'' تکیے کے نیچے سے کتاب نکال کر دکھائی۔ رام کی جناتی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا: ''پیٹ کے درد میں ہنسی بہت فائدہ دیتی ہے۔ بشرطیکہ مریض اپنے آپ پر ہنسنے کی صلاحیت پیدا کرے۔''

''بڑا شریر ہے رام۔'' روپ بولیں اور دوا کی خوراک کھاتے ہوئے بولیں: ''مجھے ایک پرانے سینما ٹکٹ پر آٹو گراف دے گیا ہے اور اس پر لکھا ہے آدھے سر کا درد پورے سر کے درد سے بہتر ہے کیونکہ آدھا سر تو سوچنے کے قابل رہتا ہے۔ اگر کوئی اپنے سر سے محسوس کرنے کے بجائے سوچنے کی تکلیف گوارا کر سکے۔'' اور یہ سنا کر وہ بھی ہنس پڑیں اور مجھے ایسا لگا کہ رام کی ہومیو پیتھی اس کی غیر حاضری میں بھی کام کر رہی ہے۔

میں نے ماتھر صاحب سے پوچھا؛ ''کیا میرے لیے کوئی خط...... کوئی پیغام...... نہیں دے گئے؟''

''اوں ہوں، کچھ نہیں۔'' اور پھر کچھ سوچ کر: ''ہاں تمھاری آٹو گراف بک دے گیا ہے۔ یہ لو۔''

میں نے جلدی جلدی ورق اُلٹے۔ لکھا تھا: ''زندگی کی حقیقت سینما کی پرچھائیوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے اور پورا انسان آدھے انسان سے بہتر ہو سکتا ہے۔''

''آدھا انسان؟'' اور میں رام کی زبانی ایکٹر کی تعریف یاد کر کے بے اختیار مسکرا دی۔ گو میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ مگر پورے انسان سے اس کا کیا مطلب ہے؟'' ابھی یہ سوال میرے دماغ میں کوندا ہی تھا کہ ایک ہلکی سی آواز کان میں آئی: ''سلمہ''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر وہی پرانا ٹویڈ کا کوٹ پہنے (جس کے مونڈھے پر میرے ہاتھ سے رفو کیا ہوا ہے) احمد کھڑا مسکرا رہا ہے۔

''احمد!'' میں چلاّئی۔ ''تم یہاں کیسے اور کب آئے؟''

''ابھی ابھی سیدھا چلا آ رہا ہوں۔ کہو تمھاری طبیعت کیسی ہے؟''

''میری طبیعت؟ کیوں میری طبیعت کو کیا ہوا؟''

''مگر اس نے تو لکھا تھا ایک بڑے مشہور ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ تمھیں دل کی بیماری ہونے کا اندیشہ ہے۔''

''کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟ اور کس نامعقول نے تمھیں یہ سب بکواس لکھی ہے؟''

''اسی اُلّو رام کمار نے اور کس نے اور وہ نالائق ہے کہاں؟''

''رام کمار نے؟'' میرا دماغ اس عجیب و غریب گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' رام کمار سے تمھارا کیا تعلق؟ تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

احمد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ''اس بدمعاش کو میں نہیں جانتا تو اور کون جانتا ہے۔ کم سے کم پندرہ برس تو اسکول اور کالج میں ہم نے ساتھ پڑھا ہے۔ چھے سال ہاسٹل میں اکٹھے ایک کمرے میں رہے ہیں۔ اسی کی وجہ سے میں نے اکنامکس میں ایم اے کیا۔ دونوں مل کر ریسرچ کرنے والے تھے۔ اور تم کہتی ہو میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ تمھارے لیے وہ توپ ایکٹر ہوگا میں تو اسے اب بھی ویسا ہی اُلّو سمجھتا ہوں۔ وہ ہے کہاں؟''

''وہ تو چلا گیا؟'' ماتھر صاحب نے کہا۔

''دیکھیے نا۔ یہ ہیں اس نالائق کی حرکتیں۔ مجھے اتنی دور سے بلایا اور خود غائب۔''

ماتھرز کے ہاں سے اپنے گھر آتے ہوئے راستے میں میں نے احمد سے کہا: ''پھر اب کیا ارادہ ہے؟''

''ارادہ کیا ہے؟'' ایک نئے لہجے میں اس نے میرے الفاظ دہرائے اور راہ گیروں کی پروا نہ کرتے ہوئے عین سڑک پر مجھے روک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: ''ارادہ یہ ہے سلمہ، کہ ابھی جا کر تمھارے پاپا کنور صاحب سے کہنے والا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کل شادی ہو جائے گی اور......''

''اور......؟'' میں اتنی حیران تھی کہ غصے کا اظہار کرنا بھی بھول گئی کہ اسے میری طرف سے یہ سب فیصلہ کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟

''اور پھر پرسوں ہم ہنی مون کے لیے بمبئی روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں میں فیکٹری کے مزدوروں کی حالت پر ریسرچ کرنے والا ہوں۔ رام نے لکھا ہے کہ ہم اس کے ہاں ٹھہر سکتے ہیں۔''

''میں بمبئی نہیں جاؤں گی۔'' میں غصے سے چلّائی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اور سب باتیں تمھیں منظور ہیں۔ اپنا کیا ہے۔ بمبئی نہ سہی کلکتے سہی، کانپور سہی۔ ہاں بمبئی میں اپنا دوست ہے۔''

''مجھے تمھارا دوست نہیں پسند۔''

''اوہ رام۔ اسے پسند کرنے کے لیے ذرا عقل کی ضرورت ہے۔'' اور یہ کہہ کر احمد خوب ہنسا اور نہایت بے شرمی سے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنا ہاتھ جھٹک کر اسے ماروں، اسے نوچوں کھسوٹوں یا اس سے لپٹ کر خوب روؤں...... خوب

روؤں......

اور پھر؟ Believe it or not احمد نے پاپا سے اس قطعی انداز میں بات کی کہ انھوں نے شادی کی اجازت دے دی ہے۔ مگر تیاریوں کے لیے کچھ دن کی مہلت مانگی ہے۔ سو اگلے ہفتے ۲۴ رستمبر کو ہماری شادی ہے۔ یہیں مسوری میں اور اسی لیے تمھیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ تمھاری موجودگی نہایت ضروری نہیں بالکل لازمی ہے۔ تم نہ آئیں تو میں بہت خفا ہوں گی۔ سمجھیں۔ لہٰذا اس خط کو تار سمجھو اور فوراً سے پیشتر یہاں آجاؤ۔ باقی ملاقات پر۔

تمھاری حیران پریشان مگر خوش

سلمہ

....

۲۳ رستمبر

اوشا پیاری!

خط اور مبارکباد کا شکریہ۔ تمھاری طبیعت کی خرابی کی خبر کافی پریشان کن ہے۔ افسوس ہے کہ تم کل یہاں موجود نہ ہوگی۔ خیر، اپنا علاج باقاعدہ کراؤ۔ تمھارے پتا جی تو ڈاکٹر ہیں۔ پیٹ کا ایکسرے فوراً ہونا چاہیے۔ اگر اپینڈکس نکلے اور آپریشن کی صلاح ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا تاکہ میں وہاں تمھاری تیمارداری کو آسکوں۔

یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔ اس وقت گھر کی کیا حالت اور میرا کیا موڈ ہے وہ تم اندازہ لگاسکتی ہو۔

تمھاری......سلمہ

P.S. اگر ایکسرے میں اپنڈکس نہ نکلے اور اس پیٹ کے درد کی وجہ نہ معلوم ہوسکے تو مجھے لکھنا۔ ''اگنیشیا'' کی ایک پُڑیا بھیج دوں گی۔ رام کا نام لے کر کھانا۔ ضرور فائدہ ہوگا۔

اور ہاں یہ تم نے کیا حماقت کی کہ ایک بار فلاسفی اور سائیکولوجی چھوڑ کر اکنامکس لی اور اب پھر اکنامکس چھوڑ کر انگلش لٹریچر لے رہی ہو۔

P.P.S. ایک بات لکھنا بھول گئی۔ کل شام ہم آخری بار مسوری کی سیر کو گئے۔ لائبریری پر وہی بے فکرے نوجوانوں اور رنگین تتلیوں کی بھیڑ تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اس بار بے فکروں کی مسکراہٹیں کافی فکرمند نظر آئیں اور تتلیوں کے رنگ ایسے لگے جیسے پھیکے پڑ گئے ہوں۔ احمد کی

موجودگی مجھے ان بے ہودہ ایکسرے نگاہوں سے محفوظ کیے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے ہیک مینیز بھی گئے اور اسکیٹنگ رنک بھی۔ مگر دونوں جگہ کوئی رونق نظر نہیں آئی۔ ایک تو بھیڑ کم تھی دوسرے جو لوگ تھے وہ بھی تھکے ہوئے مرجھائے ہوئے چہروں کو لیے وہسکی کے گھونٹ اس طرح پی رہے تھے جیسے زہر پی رہے ہوں۔ بینڈ ایک نہایت روتی بلکہ سسکتی ہوئی ٹیون بجا رہا تھا جس پر انسان تو نہیں موت ہی رقص کر سکتی ہے۔ لوٹے تو دیکھا کہ مسوری کی روشنیاں کہرے کی گہری چادر میں سے ٹمٹما رہی ہیں۔ کوئی رکشا چلتی بھی نظر نہ آئی۔ (اس لیے کہ رکشا والوں نے دو دن سے ہڑتال کر رکھی ہے) راستہ چلتے سردی کے مارے اپنے کوٹ کے کالروں میں سر چھپائے جلدی جلدی قدم اٹھائے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: ''ایسا لگتا ہے مسوری اس ٹھٹھری ہوئی سردی میں کمبل لپیٹ کر سو گیا ہے۔'' احمد نے کہا: ''سو رہا ہے؟ .... یا دم توڑ رہا ہے؟'' اس پر بھائی بولے: ''اکتوبر کی آمد آمد ہے۔ سیزن بھی تو ختم ہو گیا۔'' اور احمد نہ جانے کیا سوچ کر بولا: ''ہاں، مسوری کا سیزن ختم ہو گیا ہے...... ہمیشہ کے لیے۔''

☆☆☆

Agar Mujh se Milna Hai

SELECTED STORIES
KHWAJA AHMAD ABBAS
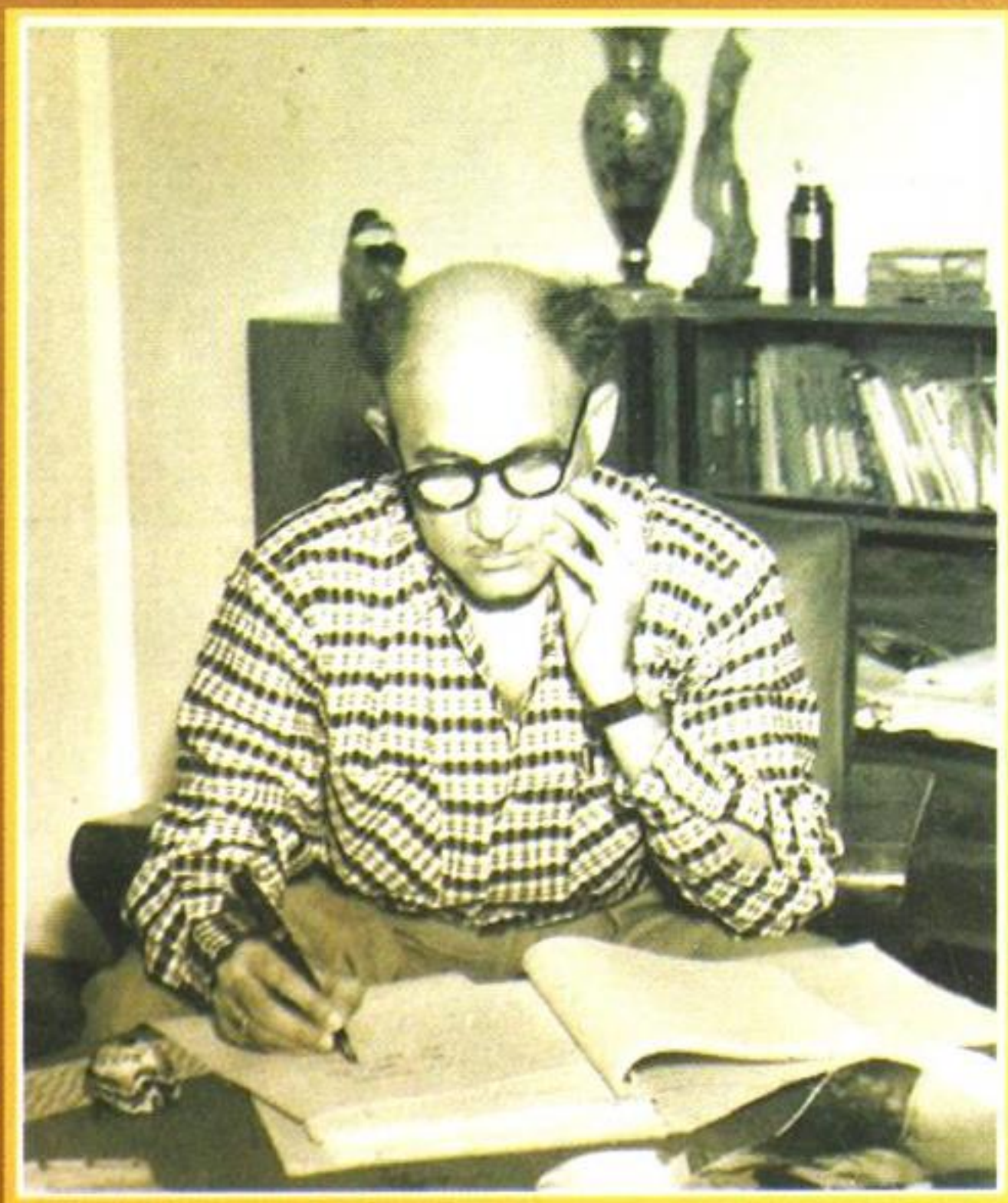
EDITED BY
SUGHRA MEHDI

MAKTABA JAMIA LTD
Jamia Nagar New Delhi-110025